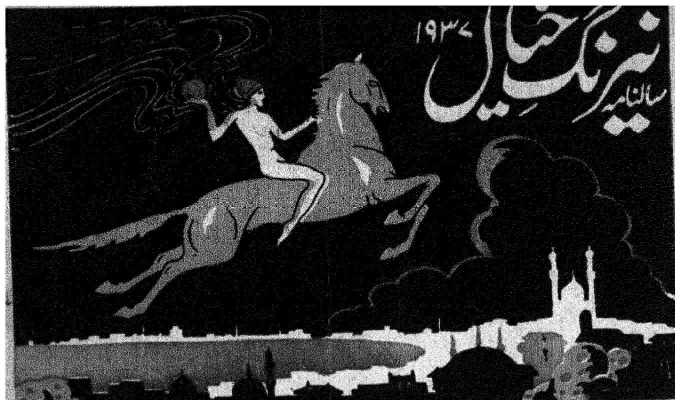
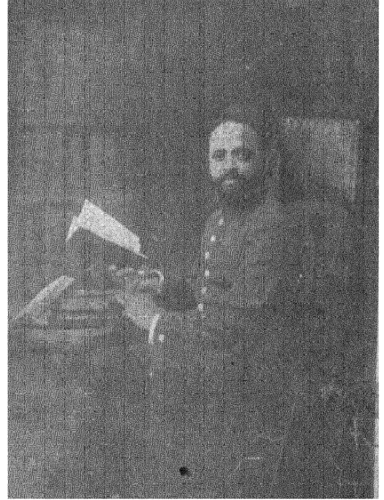


سالنامہ
نیرنگ خیال



1/4/-

نیرنگ خیال کا تجارتی صفحہ -



جناب محمد مصطفیٰ خان صاحب
مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی
ہندوستان میں عطریات کی تجارت کے ناخدا ہیں -



شیخ عنایت اللہ صاحب منیجنگ ڈائرکٹر
تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور جن کی سرگرمیوں
نے تاج کمپنی لمیٹڈ کو کامیاب
بنا دیا ہے -



شیخ عبدالمالک صاحب - کرنال شاپ لاہور جنہوں نے بوٹ شو
کی تجارت میں بڑا نام پیدا کیا ہے -

جلد ۲۵
نمبر ۱

جنرل مینیجر
ایم اشفاق غازی

نیرنگِ خیال

سالنامہ ۱۹۳۷ء

(بابت ماہ جنوری ۱۹۳۷ء)

چندہ سالانہ سالنامہ سمیت سوا چار روپے للعہ

ممالک خارجہ سے دس شلنگ
فی پرچہ (۸؍) محصول ۲؍

فہرست مضامین

فہرست تصاویر

اس کے علاوہ ۴۰ بلاک کی دوسری یکرنگ تصاویر بھی ہیں۔

حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے۔ گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر نیرنگ خیال بیڈن روڈ لاہور سے شائع کیا۔ ([illegible])

سالنامہ کے بعض کارکن

(۱) آرٹسٹ ۔ مسٹر محمد اسمٰعیل صاحب ۔ نگار آفریں ۔

(۲) کاتب ۔ منشی رفیق احمد صاحب رامپوری ۔ بڑا بازار لاہور

(۳) بلاک میکرز ۔ اروڑبنس پریس انارکلی لاہور ۔

(۴) تصویریں چھاپنے والے ۔ وکٹوریہ پریس ریلوے روڈ لاہور ۔

(۵) رسالہ کی لیتھو چھپائی ۔ زیر اہتمام منشی نظام الدین صاحب آف گیلانی پریس لاہور

(۶) بک بائینڈر مولوی جلال الدین صاحب ۔ سید مٹھا بازار لاہور ۔

(ادبی خطابات صفحہ ۱ پر ملاحظہ فرمائیے)

نیرنگ خیال کا تجارتی صفحہ

اس صفحہ پر چند ایسے اصحاب کی تصویریں شائع کی گئی ہیں ۔ جو تجارتی دنیا میں بہت معروف ہیں اور اس کے ساتھ انہیں ادب علم سے بھی ذوق ہے ۔ محمد اصطفا خاں مالک کارخانہ اصغر علی لکھنؤ کی غزل کسی دوسری جگہ درج ہے ۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے ۔ اس غزل کا ایک شعر

خدا کسی کو صاحب غرض نہ کرے

سخی ہے کون ؟ یہ دست سوال کیا جانے

(ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵۱) ۴۴۴

شذرات

حشر کی یادگار

ہندوستانی سواراج۔ سواراج پکارتے ہیں۔ لیکن اپنے اندر اول وہ خصوصیتیں پیدا نہیں کرتے جو سواراج کی سنگِ بنیاد ہیں۔ بیداری عامہ۔ تعلیم۔ تعصب کا فقدان۔ اتحاد و اتفاق۔ اور اپنے کارکنوں کی یادگاریں قائم کرنا اور یادگاریں منانا۔ یہ ہیں چند ضرورلوازمات جن کی موجودگی کے بعد سواراج آپ کو مٹھی میں سمجھ لینا چاہئے۔

حشر! آہ بدقسمت حشر! وہ سرزمین ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ ہمارا عدیم المثال ڈرامہ نویس جو نہ ہندوؤں کا تھا نہ مسلمانوں کا بلکہ وہ ہندوستانی تھا۔ جس نے نصف ڈرامے اردو میں اور نصف ڈرامے ہندی زبان میں لکھے۔ جس کے قلم سے ہندو معاشرت کی اصلاح و ترقی کے لئے ایسی کوششیں کی گئیں۔ کہ گاندھی اور جواہر لال بلکہ کانگرس کی متفقہ کوششیں بھی اتنا کام نہ کرسکیں۔ جتنا اکیلا حشر کرچکا ہے۔ اچھوت ادھار اکیلا حشر کرچکا ہے۔ اچھوت ادھار پر جو کچھ آغا حشر نے لکھا اور جو نمونہ سٹیج پر پیش کیا۔ اُسکا اثر ان تقریروں سے بہت زیادہ ہے جو ہمارا سب سے بڑا مقرر پلیٹ فارم پر کرسکتا ہے۔ ایسے ڈرامانویس کی ہندوؤں اور مسلمانوں نے کیا یادگار قائم کی؟

آغا حشر کا حق سارے ہندوستان پر ہے۔ انہوں نے ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لئے ڈرامے لکھے۔ غریبوں اور کمزوروں کی حمایت کرنا سکھایا۔ سماج کے تمام نقائص بے نقاب کئے۔ ہندی اور اردو کو ملادیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو پہلو بہ پہلو جمع کیا۔ وہ کشمیری تھے۔ اور کاشمیری کہلاتے تھے۔ انہوں نے بمبئی سے اپنی ڈرامہ نویسی کی زندگی شروع کی۔ بنارس ان کا وطن تھا۔ کلکتہ میں انہوں نے سب سے زیادہ کام کیا۔ اور پنجاب میں وہ دفن ہوئے۔ کشمیر سے لے کر بمبئی اور لاہور سے لے کر کلکتہ تک انہیں ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے۔ ہر حصہ پر اُن کے احسانات ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان اپنے اس ہیرو کی یادگار قائم نہ کرے۔

آغا حشر کی وفات کے بعد سے ہم واقعات کی رفتار کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ سب سے پہلے شاید کلکتہ میں حشر کی یادگار قائم کی جائے گی۔ رائے بہادر سیٹھ کرنانی صاحب جن کے تعلقات آغا حشر کے ساتھ بہت ہی دوستانہ نوعیت کے تھے۔ اور جو آغا حشر کو پانچ دس ہزار کی رقم صرف ایک اشارے پر دیدیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ضرور کچھ کریں گے ان کے علاوہ میڈن تھیٹرز لمیٹڈ کے تمام کارکنوں کو آغا حشر کی یادگار منانے کی طرف توجہ دینی چاہئے تھی لیکن ابھی تک کلکتہ میں کچھ نہیں ہوا۔ اور جتنا زیادہ وقت گذرتا جاتا ہے مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔

بنگال کے بعد زندہ دلانِ پنجاب کی طرف نظریں اُٹھتی ہیں۔ قبلہ حکیم فقیر محمد صاحب چشتی۔ حکیم احمد شجاع صاحب۔ سید امتیاز علی صاحب تاج۔ مولانا عبدالمجید صاحب سالک اور دوسرے ان تمام بزرگوں اور دوستوں کو جنہیں آغا حشر سے دوستی یا عقیدت تھی۔ اس اہم ترین ضرورت کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ اگر پنجاب سے کام شروع ہوجائے تو توقع ہے کہ بنگال سے بہت زیادہ امداد مل سکے گی۔

آغا حشر کی یادگار کیا ہونی چاہئے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب وہ کمیٹی دے گی جو اس مقصد کے لئے قائم کی جارہی ہے۔ لیکن میرے خیال میں کم از کم ایک حشر لٹریری کلب قائم کیا جائے۔ جس کے ممبروں کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہو جو سارے ہندوستان پر پھیلے ہوئے ہوں۔ اس کلب کے سرمایہ سے آغا حشر کے تمام ڈراموں کے شاندار ایڈیشن شائع کئے جائیں۔ ہر ڈرامہ پر کسی قابل آدمی سے دیباچہ لکھوایا جائے اور یہ ڈرامے مصور ہوں۔ جب تمام ڈرامے ایک ایک کرکے طبع ہوجائیں

تو پھر ان کو یکجا خوبصورت جلد میں شائع کیا جائے جس طرح سے شکسپیر کے تمام ڈرامے یکجا ملتے ہیں۔ اسی طرح سے حشر کے تمام ڈرامے یکجا مل سکیں آغا حشر کا مختصر کلام مرتب کیا جائے۔ اُن کے نا تمام ڈرامے جمع کئے جائیں ان کی سوانح عمری لکھی جائے۔ جن میں ان کی زندگی کے تمام پُر لطف واقعات تفصیل سے درج ہوں۔ الغرض حشر کے متعلق ہر ضروری چیز جمع کر لینی چاہئے ؛

کام کی ابتدا کر دی گئی ہے۔ اس لئے ہم اس مضمون کے ذریعے ان تمام اصحاب کو دعوتِ عمل دیتے ہیں جو اس میں دلچسپی لینا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کے [illegible] جہاں جہاں مسٹر ڈراماٹک کلب ہوں وہ اپنے نام و پتہ [illegible]۔ آغا حشر کے متعلق جو چیز بھی کسی صاحب کے قبضہ میں ہو وہ [illegible]۔ مثلاً ان کی کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ غزل یا نظم۔ ان کا کوئی لیکچر جو کسی اخبار یا رسالے میں کبھی شائع ہوا ہو۔ یا ان سے ملاقات کے زمانہ کی کوئی بات جسے وہ ریکارڈ کرانا چاہتے ہوں ؛

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ امداد آغا حشر کے بھائی آغا محمود سے مل سکتی ہے۔ اور [illegible] ان کے بھانجے مسٹر جبار حشری سے توقع ہے کہ ہر دو اصحاب پوری امداد و تعاون سے کام لے کر ہماری راہنمائی کریں گے۔ تاکہ ہم اس نیک مقصد کو آسانی کے ساتھ تکمیل تک پہونچائیں

سالنامے

ہندوستان میں انگریزی۔ اردو۔ گجراتی۔ مرہٹی بنگالی۔ اور ہندی زبانوں کے رسائل و اخبارات کے سالنامے شائع ہوتے ہیں۔ اردو زبان کے رسائل و اخبارات کے سالنامے ہماری توجہ کا زیادہ مرکز ہیں۔ روزانہ اخبارات میں انقلاب زمیندار۔ احسان۔ ملاپ۔ پرتاپ۔ اور ہفتہ وار اخبارات میں پارس۔ گرگھنٹال۔ نوجوان۔ اور اسٹار تنگ خاص نمبر شائع کر کے علم و زبان کی خدمت بجا لاتے ہیں۔ اور ہمیں بے اختیار ان سب کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔

اردو رسائل میں نیرنگ خیال نے سب سے اول سالنامہ کی بنیاد رکھی۔ خدا کا شکر ہے کہ تمام معاصرین نے اسے لبیک کہی اور اچھے اچھے سالنامے ہمارے معاصرین شائع کر کے علم و ادب کی خدمت بجا لاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نیرنگ خیال کا یہ دسواں سالنامہ ہے جو آپ کے پیش نظر ہے ؛

اقتصادی بدحالی اور دو سال کے کثیر مالی نقصانات کے بعد ایسا سالنامہ شائع کرنا حسنِ اقدام اور حسنِ ذوق کے سوا کچھ نہیں اسے پسند کرنا اور اسے قبول کرنا آپ کا کام [illegible] اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اسے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے تو نیرنگ خیال کی سرپرستی اختیار فرمایئے۔ اور توسیع اشاعت میں حصہ لیجئے ؛

نیرنگ خیال کے ادارۂ تحریر میں اچھے اچھے اہل قلم موجود ہیں۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس وقت ان میں سے ایک صاحب بھی لاہور میں موجود نہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے جنرل منیجر [illegible] لکھنؤ کی نمائش سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ یہ سالنامہ تن تنہا میری کوشش کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان کی اخبار نویسی میں شاید یہ پہلی مثال ہو کہ ایڈیٹر سے لے کر پروف ریڈر تک بلکہ ادنےٰ سے ادنےٰ فرائض تک مجھے خود انجام دینے پڑے ہیں۔ اور وہ بھی کسی معمولی رسالہ کے نہیں سالنامہ نیرنگ خیال کے جسے پورے بارہ نمبروں کے برابر سمجھنا چاہئے ؛

فروری کا پرچہ پریس میں ہے۔ خدا کرے کہ یہ سال ہمارے لئے سعد ثابت ہو اور ہم رسالہ کو بہتر حالت میں اور وقت پر شائع کر سکیں۔ میری محنت اور کوشش علم و زبان کی توسیع و ترقی کے لئے وقف رہے گی۔ اسے نوازنا آپ کا کام ہے ؛

(حکیم محمد یوسف حسن)

اصغر گونڈوی کی وفات

اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ گذشتہ ماہ میں ملک کے نامور فاضل اور شاعر نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مرنے سے ایک ہفتہ پیشتر مرحوم کی آخری غزل ہمارے پاس بغرض اشاعت پہنچی تھی جو سالنامہ میں درج ہے۔ اسکے علاوہ آپکی شاعری پر ایک مبسوط مضمون بھی موصول ہوا تھا جسمیں معاصر معارف کی نکتہ چینی کا مدلل جواب ہے۔ یہ مضمون کسی آئندہ اشاعت میں درج ہو گا۔ اصغر کی وفات سے ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی ہے جو شاید کبھی بھی پُر نہ ہو سکیگی۔ خداوند تعالےٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے۔

کلام بلاغت نظام

(از محترم والاشان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر، حیدرآباد دکن)

خود اپنی نظر سے نہاں جا رہے ہیں　　جہاں تم ہی تم ہو وہاں جا رہے ہیں

یہ سن کر کہ ہوگی قیامت میں پرسش　　زباں ہے مگر بے زباں جا رہے ہیں

نہ آئیں گے اب اُن کی محفل سے واپس　　وہیں مر رہیں گے جہاں جا رہے ہیں

نگاہوں کو دیدے مجالِ تماشا　　کہ جلوے ترے رائگاں جا رہے ہیں

سلامت رہے اُن کا دردِ محبت　　نشاں چھوڑ کر بے نشاں جا رہے ہیں

اُنہیں کی خدائی ہے دونوں جہاں میں　　محبت کے بندے کہاں جا رہے ہیں

شجیع آج وہ ہم سے نظریں چرا کر

(خاص)　　کہاں جا رہے ہیں کہاں جا رہے ہیں

حُسنِ مُطلق

(از قلم گوہر بار ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب۔ ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی)

(۱)

ہزار شکل میں جلوہ فروز ہوتا ہے

ہر ایک رنگ میں نظارہ سوز ہوتا ہے

(۲)

ہے جلوہ گر کبھی رقصِ حباب میں ہوتا

کبھی ہے موج میں وہ پیچ و تاب میں ہوتا

(۳)

عیاں ہے کوہِ گراں میں کبھی سکوں ہو کر

کبھی رگوں میں رواں ہے وہ موجِ خوں ہو کر

(۴)

ہر آفتاب کو وہ ماہتاب کرتا ہے

کہ اُس کے حُسن سے نور اکتساب کرتا ہے

(۵)

وہی کہیں رخِ لالہ پہ رنگ بنتا ہے

وہی کبھی میرے دل میں اُمنگ بنتا ہے

(۶)

وہ نورِ صاعقۂ طور میں نمایاں ہے

وہ خود فشانیٔ منصور میں نمایاں ہے

(۷)

یہ کائنات تیرا رُخ بھی ہے نقاب بھی ہے

ظہور کہتے ہیں جس کو تیرا حجاب بھی ہے

(۸)

شعاعِ حُسن ہے نکلی نقاب سے چھن کر

فروغِ چہرۂ رعنائی جہاں بن کر

(۹)

نقاب یہ ہے رخِ بے حجاب کیا ہوگا

جو سایہ یہ ہے تو وہ آفتاب کیا ہوگا

غزل

فرمودۂ ہز ہائینس نواب آصف قدر سید سر واصف علی میرزا خان بہادر رئیس الدولہ امیر الامرا مہابت جنگ
نواب بہادر آف مرشد آباد۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کے۔ سی۔ وی۔ او

ہر مسافر زندگی بھر دہر میں لاچار ہے — رنج کا ہے سامنا آنا یہاں بیکار ہے

پھنس گیا دل جب کبھی پھندے میں زلفِ حسن کے — مفت سودائی بنا چند دن کا یہ بازار ہے

فخر حاصل خوبیوں کا ہے زمانے کی کسے — نامیوں کا امتحاں اب برسرِ بازار ہے

خانۂ دل کی نہ بربادی کا رکھ ہرگز خیال — وہ بنانیوالا ہے عالم کا جو معمار ہے

ہے زمانہ پر اثر یہ انقلابِ چرخ کا — کس ستم کی گردشِ قسمت تری رفتار ہے

گو کہ شکلِ روح کا ممکن نہیں ہے سامنا — خواہشِ تنگی تمنا طالبِ دیدار ہے

انس و جن کی ہے زباں قاصر ثنا و مدح میں — عینِ رحمت کو بھلا بخشش سے کب انکار ہے

راحتِ جاں کیلئے کافی نہیں ہے عمرِ خضر — درمیانِ جستجو میں کس قدر تکرار ہے

قلب کو تسکین کیونکر سے نہ ہو روزِ جزا
ہمہ تن واصف محبت میں تری سرشار ہے

(خاص)

صبح بہار

(از جناب سراج الحسن صاحب سراج لکھنوی)

چھٹ گئی شب کی سیاہی آ گئی صبح بہار — پتی پتی باغ عالم کی ہے جنت در کنار
غنچہ سربستہ طلسم رنگ و بو کا رازدار — ہر گل رنگیں ادا آئینہ دار روئے یار

زلف سنبل کی پریشانی ملال شام ہے
پھول کا ڈالی پہ کھلنا صبح کا ہنگام ہے

موسم گل ہے نمو کا جوش ہے نام خدا — کاش ان دلچسپیوں کا اب نہ ٹوٹے سلسلا
آمد و رفت نفس ہے آج ہر موج صبا — روح پاتی ہے مزا چلتی ہے جب ٹھنڈی ہوا

دل کے عقدے حل کرے گی ہر کلی کھلنے کے بعد
اب جدائی منہ نہ دکھلائے گلے ملنے کے بعد

حسن فطرت بن گیا ہنگامہ دور حیات — اس کے پہلے ایک سادہ سا ورق تھی کائنات
بعد مدت گل ہوئے ہیں آشنائے التفات — کاش نقاش ازل بخشے انہیں پائے ثبات

غنچہ کہتا ہے چٹک کر داستان زندگی
آج تو ہر پھول ہے روح روان زندگی

صنعت فطرت کا وہ رنگیں صحیفہ آفتاب — یوسف مشرق ہے یا حد پر زلیخا کا شباب
ریزش شبنم نہیں خود اس نے چھڑکا ہے گلاب — بانٹتی پھرتی ہیں کرنیں زندگانی کی شراب

طور کے شعلے کا اک یہ بھی علمبردار ہے
آج تو دنیا کو موسیٰ کی نظر درکار ہے

ہائے وہ بیدار ہو کر نیم خوابی حسن کی — سرخ آنکھیں ہیں کہ چھلکی ہے گلابی حسن کی
فرش ناز اور بے ارادہ بیحجابی حسن کی — کوئی دیکھے تو برافگندہ نقابی حسن کی

نیم باز آنکھوں کے ساغر ناز سے دیتا ہوا
حسن خوابیدہ اٹھا انگڑائیاں لیتا ہوا

منہ لب جو دھو رہے ہیں سو کے اٹھے ہیں حسین — گورے گورے ہاتھ کھولے ہیں چڑھا کر آستیں
ڈوب جائے عشق کی کشتی نہیں ایسا نہیں — آج تو خود ناخدائے حسن ہے ساحل نشیں

آرزو بر آتی ہے پامالئ ارماں کے بعد
سطح خود خاموش ہو جاتی ہے ہر طوفاں کے بعد

چادریں پانی کی ہیں شفاف سطحِ آب پر — ہر حباب اک حسن کی منزل کہاں ٹھیرے نظر
اب دکھائی دیں گے اک عالم کو سب عیب و ہنر — صبح کا آئینہ ہے عکسِ رخِ آئینہ گر

غسل کر کے نور میں ہر چیز جلوا بن گئی
دھوپ اک پگھلے ہوئے سونے کا دریا بن گئی

مچھلیاں پانی پہ ابھریں چونک اٹھیں خواب سے — وہ دھواں اٹھنے لگا ہر موج ہر گرداب سے
یہ گلے ملا تو دیکھو آگ کا سیماب سے — کھیلنے پہلی کرن آئی ہے سطحِ آب سے

ہے یہ نظارہ بھی دلکش رنگ بھی مقبول ہے
جو کہ بنو رپانی پہ پڑتا ہے سنہرا پھول ہے

ساقیا! آجلد آ پینے پلانے کا ہے وقت — چھڑ گیا سازِ سحر یہ گنگنانے کا ہے وقت
شعریت سی چھا گئی عالم پہ گانے کا ہے وقت — غیب سے پیغام پر پیغام آنے کا ہے وقت

سامنے آ کچھ وفا کے عہد لے پیمان کر
صبح کے باریک دامن سے پلا دے چھان کر

بول اٹھنے کی کسر بھی اب نہیں تصویر میں — زمزمے بلبل کے ہیں ڈوبے ہوئے تاثیر میں
کھل گئیں آنکھیں سحر کی ایک ہی تنویر میں — آج تو جلوے ہی جلوے ہیں مری تقدیر میں

گوہرِ شبنم گلوں کی آستیں پر آ گئے
ٹوٹ کر یا عرش کے تارے زمیں پر آ گئے

پتلیاں رنگین ادا نازک سے نازک جن کے پر — خود سراپا حسن رکھتی ہیں مگر ذوقِ نظر
کرتی پھرتی ہیں تلاشِ چارۂ دردِ جگر — اڑ گئیں اِس پھول سے بیٹھیں کبھی اُس پھول پر

نونہال ان کو پکڑ لیں گے اٹھا لے جائیں گے
کیا خبر دم بھر میں یہ پر نوچ ڈالے جائیں گے

(سراج الحسن۔ سراج)

بھولنے والے سے

(از جناب مظفر حسین صاحب شمیم مہتمم انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد دکن)

آہ وہ پہلی نظر وہ آہ و زاری کے مزے
آہ وہ پچھلے پہر کی اشک باری کے مزے

آہ وہ راتیں جو الفت کا سہانا خواب تھیں
آہ وہ باتیں جو غماز دل بیتاب تھیں

چاندنی راتوں میں جب مے عشق کی پیتے تھے ہم
آہ وہ راتیں وہی کہ جب جیتے تھے ہم

بھولنے والے بتا اب بھی وہ راتیں یاد ہیں؟
کیا ابھی تک خواب کی وہ بستیاں آباد ہیں؟

کیا تری نگری کے باسی آج بھی دل شاد ہیں؟
کیا کنارے آبجو کے آج بھی آباد ہیں؟

کیا ابھی باقی ہے پیچ و خم وہ زلف شام کا؟
کیا وہی نقشہ ہے اب بھی آسماں کے بام کا؟

کیا کبھی بھولے سے تجھ کو اب بھی یاد آتے ہیں ہم
اپنی تجھ سے کیا کہیں دل کیسے بہلاتے ہیں ہم

جذبات عالیہ

(از جناب حضرت اصغر گونڈوی)

ذکر وہ تیرا کیا کہ جو پھر ہنس مجھ کو جلا نہ دے
یاد وہ تیری کیا کہ جو گردش خوں بڑھا نہ دے

میرے سر نیاز کی محویتیں مٹا نہ دے
موت ہو یا حیات ہو کوئی مجھے صدا نہ دے

اس کے حریم وصل میں موج نفس بھی روک لے
ہوش کو بھی خبر نہ ہو کیف کو بھی ہوا نہ دے

دل میں وہ سوز دل کہاں آتش مشتعل کہاں؟
اس کی ادائے جانستاں خاک کو اب ہوا نہ دے

اُف ری مری فتادگی اُف ری کمال خستگی
آئے وہ فرش خاک پر عرش پہ جو پتا نہ دے!!

جدید شاعری!

سوزِ عشق

(از جناب ڈاکٹر تصدق حسین صاحب خالدؔ - ایم اے - پی - ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر)

(۱)

رات اندھیری تیرہ و تار
رہ رہ دل دہلانے والی
بادل کالے کالے - اوجِ فضا میں ٹھہرے ہوئے
دیووں نے جیسے ڈیرے ہوں ڈالے
تاریکی سی تاریکی!
ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے
ایک ستارہ کانپتے کانپتے ابھر اچمکا
دور ـــ اک ایسی دنیا میں
خود میری چشمِ تخیل بھی جس دنیا سے نامحرم تھی۔
میں نے اس تارے سے پوچھا
"کیا تیرے دل کی تمنا ہے
جو دیس سے اپنے نکلا ہے؟
یہ رات، کہ سورج بھی ڈر کر
دامن میں چھپا کر کرنوں کو
مغرب میں پہاڑوں کے پیچھے
غاروں میں کہیں جا دبکا ہے
تو تنہا، وسعتِ گردوں کی ان لامحدود فضاؤں میں
آ نکلا ہے!
کیا آگ ہے تیرے سینے میں
تو جس سے پیہم جلتا ہے
تجھ کو کیا روشن کرنا ہے
جو دیس سے اپنے نکلا ہے؟"

(۲)

دل کی دنیا میں کیا حشر سا برپا اس نے
آشنا یا نہ اس انداز سے دیکھا اس نے
خفتہ جذبات میں طوفانِ تلاطم اٹھا
ڈبڈباتی ہوئی آواز میں جب اس نے کہا
"میں چمکتا ہوں جہاں کی ابدی ظلمت پر
ہستیٔ مردہ کی یخ بستہ حزیں وسعت پر
جس طرح "رات کی رانی" کی نواؤں سے چمن
ہو کے سرشارِ مئے حسن مہک اٹھتا ہے
مری تابندہ دعاؤں سے یہ ہیولئے کہن
اک نئی روح سے بیتاب چمک اٹھتا ہے
عشق کے سوز سے روشن مری پیشانی ہے
مری تخلیق کا مقصد ہی درخشانی ہے
یہ درخشانی!
یہی میرے لئے کافی ہے!

(لندن میں لکھی گئی)

(خالدؔ)

علمی ادبی اعزازات

نیرنگ خیال کے ۱۹۳۷ء کے اعزازات

علّامہ

آنریبل سر سید سلیمان شاہ صاحب الہ آباد۔
خلیفہ عبد الحکیم صاحب ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

ادیب اعظم

لطیف الدین احمد۔ اکبر آبادی۔

ادیب العصر

حکیم احمد شجاع صاحب۔ بی۔ اے۔
سید امتیاز علی صاحب تاج۔
بشیر احمد صاحب بی اے۔ آکسن۔

ادیب الملک

اختر حسین صاحب رائے پوری۔
حاجی صادق ایوبی جرنلسٹ
صفوۃ اللہ بیگ صوفی دہلوی
ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی
مالک رام صاحب۔ ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

ملک الشعرا

ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری

لسان العصر

حضرت حفیظ ہوشیار پوری۔ ایم۔ اے
رگھوپت سہائے صاحب فراق۔ ایم اے

لسان القوم

حضرت محمود اسرائیلی
مظفر حسین صاحب شمیم

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی
حکیم محمد حسن صاحب قرشی۔ ایڈیٹر مشیر الاطبا۔ لاہور
جناب چراغ حسن صاحب حسرت۔ مدیر شیرازہ

بہزادِ ہند

ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور۔ شانتی نکیتن

رئیس الحکما

حکیم محمد احمد خاں صاحب رئیس دہلی
حکیم مقصود علی خاں صاحب افسر الاطبا۔ حیدر آباد دکن۔

ادیبہ جلیلہ

شمسی عبد الرحمن صاحب (علی گڑھ)
بیگم محمود المظفر خاں۔ رشیدہ جہاں صاحبہ

مصوّر قلم

غازی محمد اشفاق صاحب جرنلسٹ
راجہ غلام احمد صاحب ایڈیٹر صدائے نسواں دہلی
ڈاکٹر پورن سنگھ صاحب ہنر۔ مدیر چمن
عزیز احمد صاحب خلش صدیقی۔ بی اے۔
جناب ابو العلا چشتی صاحب۔ مدیر نقاش۔ لاہور

ہندوستانی مصوری

(از جناب ڈاکٹر علامہ تاثیر - ایم اے - پی ایچ ڈی پرنسپل ایم اے او - کالج امرتسر)

{یہ تقریر ریڈیو کے ذریعہ سے ۲ جنوری ۱۹۳۷ء کو نشر کی گئی تھی}

یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں تین چار سو سال نہیں تو ہزار سال سے مصوری جاری ہوگی۔ یونان وغیرہ میں دو ہزار سال پہلے یہ کام ہو رہا تھا۔ مگر ہندوستان میں آریوں کے آنے سے بھی پہلے تصویریں بنائی جاتی تھیں اور اب تک بنائی جا رہی ہیں۔ باہر سے دشمن آئے۔ اندر فساد ہوئے۔ اوپر آسمان سے طوفان اترے۔ نیچے زمین سے زلزلے پھوٹے۔ مگر ہماری مصوری کی روایات اب تک چلی جا رہی ہیں۔ یہ نہیں کہ مصوری پر ان حادثوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مصور آخر اسی دنیا کا رہنے والا ہے۔ اپنے ارد گرد کے حالات میں بنتا بگڑتا ہے۔ یہیں کے لوگوں سے یہیں کی باتیں رنگوں خطوں میں سناتا ہے۔ عام لوگوں سے شاید زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس لئے بھی حالات سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ اور ہندوستان کی مختلف وقتوں کی مصوری اس اثر پذیری کی صاف گواہی دیتی ہے۔ مگر ہندوستانی مصور کچھ ایسا سخت جان واقع ہوا ہے کہ وہ ان آفتوں کے باوجود سسک سسک کر رینگ رینگ کر گرتا پڑتا چلا جا رہا ہے۔ بقول اقبال سے "آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا"۔ ہمارے ملک میں مصوری کے اولیں نشانات ہڑپا اور موہنجو دارو کی کھدائیوں میں ملتے ہیں۔ آثار قدیمہ کے ماہروں نے ثابت کر دیا ہے کہ یہاں مصوری آریوں کے آنے سے پہلے بھی موجود تھی۔ سر جان مارشل کے مطابق موہنجو دارو کی تین بستیاں۔ تین ہزار تین سو سال تین ہزار سال اور دو ہزار سات سال قبل مسیح کی ہیں۔ ان میں دیواروں کی سطح پر اور اندر کھود کھود کر تصویریں بنائی گئی تھیں۔ لیکن یہ تصویریں محض تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ البتہ جنوبی ہندوستان میں جو ان سے بھی پہلے کی تصویریں نربدا کی وادیوں میں کھدائی سے دریافت ہو رہی ہیں۔ وہ واقعی تصویریں ہیں حسین جمیل زندگی سے بھرپور۔ لیکن یہ پرانی روایتیں کچھ آگے نہ چل سکیں۔ ان دنوں لوگ گروہ گروہ قبیلہ قبیلہ رہتے تھے۔ اور ان کے فنون بھی محدود رہ گئے۔

البتہ بدھ مت کی ترویج سے مصوری کا فن چار طرف پھیل گیا اور ہندوستانی مصوری کی تاریخ بھی اسی عہد سے شروع ہوتی ہے۔

بدھ مت کی تعلیم آپ جانتے ہی ہیں۔ کیا ہے۔ آپ بدھ کی اپنی کہانی بھی جانتے ہیں کس طرح انہوں نے شاہی اور عیش و آرام کو تیاگ دیا۔ اور ساری زندگی دھیان گیان میں گزار دی۔ ان کی تعلیم شانتی۔ ایکانت مکتی۔ نروان کی تعلیم ہے بہت لفاظی کیوں کریں۔ سرناتھ میں سنگ سرخ کی بدھ مورتی دیکھئے اصل نہیں تو فوٹو سہی شانتی ایکانت دانشمندی کی مورت۔ یہ دھرم چکر کا مجسمہ ہے۔ دھیان مدر کی مورت میں اس سے بھی زیادہ طمانیت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو کڑی ہاتھ آغوش میں۔ ہتھیلیاں اوپر کو اٹھی۔ ہندوستانی آرٹ میں بیٹھک (آسن) اور انگلیوں کے انداز (مدر) خاص معنی رکھتے ہیں۔ ابھایا مدر میں بے خوفی اور اعتماد کے اظہار کیلئے ہاتھ زانو کی سطح پر کھلے ہتھیلیاں اوپر اور انگلیاں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ دھرم چکر جو تبلیغ کا انداز ہے اس میں انگلیاں انگوٹھے سے قوس بنا کر مل جاتی ہیں۔ مگر یہ سب دھرم اور روحانیت کے مجسمے ہیں۔ آہستہ آہستہ دنیا نے بھی دخل دینا شروع کر دیا۔ اور اجنٹا کے غاروں کی تصویروں میں دھرم اور روحانیت کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی ضروریات کا بھی عکس نظر آتا ہے۔ رہبانیت سے دبے ہوئے جذبات پھوٹ پھوٹ کر نکلتے نظر آتے ہیں۔ سینے کا ابھار مبالغہ آمیز ہو جاتا ہے۔ کمر کی باریکی سے سرین کی گولائی نمایاں تر کر دی جاتی ہے مصور جسم کے ہر حصہ کی ٹھہر ٹھہر کر مزے لے لے کر نگارش کرتا ہے۔

بدھ آرٹ اپنے پورے جوبن پر تیسری صدی قبل از مسیح سے ساتویں صدی بعد از مسیح رہا۔ گپتا عہد میں اسے پورا کمال حاصل تھا۔ چوتھی صدی میں برہمن مت کا زور شروع ہوگیا۔ اور ذہنوں اور دلوں کی تبدیلی سے فنون جمیلہ میں بھی تبدیلی ظاہر ہونے لگی اس عہد کا بہترین نمونہ برنجی کانسی کا نٹ راجہ ہے۔ شوجی کا البیلا ناچ۔ زندگی کا ناچ۔ پانچ قوتوں۔ پنچ کرتی کا اظہار۔ پیدائش تربیت۔ تباہی تجسیم اور نجات یہ ہیں۔ پانچ راہ عمل کبیر نے ایک گیت میں اس کا اظہار خوب کیا ہے۔ کہتا ہے۔

ناچ اے خوشی کے متوالے دل۔ ناچ۔ محبت کے گیت دن کے پھیلاؤ میں رات کی ایکانت میں گونج رہے ہیں اور دنیا خاموش ہمہ تن گوش ان راگوں کو سن رہی ہے۔ خوشی سے سرمست زندگی اور موت دونوں اس گیت سے ہم آہنگ ہو کر ناچ رہی ہیں۔ پہاڑ اور سمندر۔ دھرتی اور آکاش۔ سب اسی لے میں ناچ رہے ہیں اور آہوں اور قہقہوں کے چہچہوں میں دھرتی کے سارے باسی ناچے جا رہے ہیں۔

شوجی کا ناچ زندگی کو لبیک کی پکار ہے۔ زندگی کی ہر حالت سے رضا جوئی ہے خوشی سے غم و غصہ سے موت سے۔ یہ عقیدہ نیک و بد کی تمیز سے بے نیاز ہے۔ یا سیت (دور رجائیت)

دونوں سے بالا ہے۔ یا یہ ہے تو شجاعانہ کہ دیوتا لاشوں کا ناچ رہا ہے۔ رجائیت ہے تو اس زندگی سے بلند اور فوق الانسان کہ موت اور تباہی سے ایک عجیب خوشی پیدا ہوتی ہے۔ مادہ کے غیر فانی ہونے کی خوشی۔ مر مر کر زندہ ہونے کی خوشی۔ نٹ راجہ کا چکر زندگی کا چکر ہے۔ ابدیت کا چکر۔ تناسخ کا چکر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم بدھ مت سے بالکل الگ ہے اور یہ فرق محیموں ہی میں نہیں بلکہ مصوری میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً اجنٹا اور باغ کی تصویروں میں اجنٹا کے غاروں کی برہنہ دیواری تصویروں سے نزاکت اور طمانیت برستی ہے۔ یہ بدھ عہد کی تصویریں ہیں۔ رنگ محل کی برہنہ تصویریں طاقت اور سرمستی سے سرشار ہیں۔ دونوں مختلف دنیاؤں کی باسی معلوم ہوتی ہیں۔ ایک بدھ مت ایک برہمن مت۔ آپنے اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ آرٹ تمام تر مذہبی تھا۔ رائج الوقت عقیدوں اور توہمات کی تصویر کشی مگر مذہبیت کے باوجود اس میں زندگی جوش زن تھی۔ کیونکہ اس کی بنیاد اپنے وقت کے زندہ عقائد پر تھی۔ عقائد جن پر لوگوں کی زندگی اور موت کا انحصار تھا۔ جن پر ان کا دل و جان سے یقین تھا۔ جنہیں وہ سچا صحیح سچ مچ مانتے تھے۔ روزمرہ کی اقتصادی ضروریات تک ان عقائد سے وابستہ تھیں۔ فصل۔ اولاد۔ دولت۔ دھن سب دیوتاؤں کی دین سمجھی جاتی تھیں مگر آج انہی روایات کو تصویروں کا موضوع بنانا زندگی کا منہ چڑانا ہے۔ آج ہمارے مسائل اور ہیں۔ ہماری ضروریات اور ہیں۔ ہمارے خیالات اور ہیں۔ جو مصور آج اجنٹا باغ اور مغل روایات کو زندہ کرنا چاہتے ہیں وہ زندگی سے گھبرا کر زندگی سے دور بھاگ رہے ہیں۔

مغل آرٹ کی روایات بدھ اور برہمن مت کے آرٹ سے مختلف تھیں۔ مغل آرٹ زیادہ تر دربار کا آرٹ تھا اور اس میں ہر طرح کامل تھا۔ شاہجہاں کے عہد لیجئے۔ کسی دیوی دیوتا یا نبی اوتار کی تصویر نہیں ملتی۔ عام طور پر شاہوں شاہزادوں کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ یا امرا کی۔ کبھی کبھار کوئی سادھو فقیر بھی ہو گیا تو خیر۔ وہ بھی عموماً ایسے موقعے پر جب کبھی کوئی امیر کبیر زیارت کے لئے آنکلا ہو اس عہد کی بہترین تصویروں میں شاہزادہ دارا شکوہ کی تصویر ہے جس میں وہ کسی حرم کی حسینہ کی تصویر دیکھتا دکھایا گیا ہے۔ دنیوی دربار دنیوی مضمون یا دربار کی سرپرستی کا اس سے بہتر نتیجہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ مغل مصوری نے ہندوستانی مصوری کو دنیا میں واپس لاکر ایک نئی زندگی بخشی۔ ہندوستانی آرٹ محض دھارمک اور رسمی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بارھویں صدی میں اس کے جسم و جان الگ الگ ہو چکے تھے۔ مذہب کی آسمانی فضا دھرتی کے باسیوں کیلئے دیر تک سانس لینے کے قابل نہیں ہوتی۔ ہندوستانی آرٹ کو ان ہوائی بلندیوں سے انسانیت کی ارضی بنیادوں پر کھڑا کرنا مغل مصوروں کا کام تھا۔ مغل آرٹ کی سب سے بڑی خصوصیت اور ہندوستان کی مصوری پر احسان حقیقت نگاری ہے۔ انسانیت یا دنیاداری ہے۔ مغلوں نے عظیم الشان نگارخانہ استوار کر دیا ہے جس میں ہزاروں جیتی جاگتی تصویریں زندہ شبیہیں آباد ہیں۔ جہاں بادشاہ شہزادے امرا، فقرا، سادھو سنیاسی، امیرزادیاں، پنہاریاں دوش بدوش چلتی نظر آتی ہیں۔ یہی نہیں۔ انسانوں کے ساتھ ساتھ پس منظر بھی ہیں۔

شکارگاہیں۔ میدان کارزار! اور جوں جوں مصوری دنیا کی طرف رخ کرنے لگی نئی نئی راہیں کھلنے لگیں۔ پس منظر پیش منظر بن گیا۔ اور مناظر قدرت کی تصویریں کھینچنے لگیں۔ حیوانات کی تصویریں بھی۔ اور اس شعبے میں مغل تصویریں دنیا کی مصوری کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ دارا شکوہ کی بیاض میں استاد منصور کے ہرن اور مور اور بگلے کمال فن کی انتہا ہیں۔ یہ مغل آرٹ کچھ اب بدیسی اور اجنبی بھی نہیں تھا بنیاد ایرانیوں نے رکھی۔ یقیناً۔ مگر جلد ہی ہندوستان کی آب ہوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور ہمارے دیس کے مصوروں نے اسے اپنا بنا لیا۔ راجپوت سکول اسی اشتراک کا نام ہے۔ مغلوں کا آرٹ زندگی کی لذتوں کا احساس کی زندگی کا، دل و دماغ کی بیداری کا آرٹ ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب مشرق و مغرب ایک ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ریمبرانٹ مغرب اقصےٰ میں ایرانی تصویروں کی نقلیں اتار رہا تھا اور جہانگیر کے مصور ہندوستان میں مغربی تصویروں کے نمونے بنا رہے تھے۔ اجنٹا مصوری کی روایات آٹھویں صدی تک مسلسل قائم رہیں۔ گو کچھ کچھ اثرات راجپوت اور کانگڑہ اسلوب میں بچے کھچے رہے۔ مغلوں نے ہندوستان میں کاغذ رائج کر کے مصوری کو عام کر دیا اور ایک نئی روانی پیدا کر دی۔ اٹھارھویں صدی میں مغلوں کے زوال کے ساتھ مصوری کی روایات بھی زوال میں آگئیں۔ اور ان کے وارث بھی وہی راجپوت کانگڑہ سکول کے گمنام عوام مصور ہی رہ گئے۔ نہ دربار رہے۔ نہ درباری مصوری۔ نہ مصور نہ قدر دان خریدار۔ اب کے حکومت کا تختہ بدلا نہیں الٹ گیا۔ تبدیلی نہیں انقلاب آگیا اور ان پچھلے سو سالوں میں انقلاب قیامت کی صورت پکڑ چکا ہے۔ جے رام سے پرتھوی راج پرتھوی راج سے شہاب الدین۔ شہاب الدین سے بابر۔ یہ یقیناً مختلف دربار مختلف بادشاہ۔ مختلف خاندان اور مذاہب کا راج ہے مگر اقتصادی بنیاد تقریباً یکساں ہی رہتی ہے۔ وہی ازمنۂ متوسط کی دستی زراعت اور جاگیرداریاں۔ مرکز میں دہلی میں انقلاب آتا رہا۔ مگر باہر عام لوگ ایک ہی طرح سے زندگی بسر کرتے رہے۔ وہی رسم و رواج۔ وہی لباس، وہی بولی ٹھولی۔ بہت زور پڑا تو آمیزش ہوگئی سنسکرت اور عربی فارسی اور بھاشا بل ملا کر اردو ہندوستانی بن گئیں۔ اساسی طرز زندگی یکساں تھا۔ انگریزی حکومت قیامت کا سا انقلاب تھا۔ میں یہاں سیاسی پہلو کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ میرا مدعا "انقلاب زندہ باد" نہیں میں محض سماجی اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے گفتگو کر رہا ہوں۔ انگریز مشین کی تہذیب کا علمبردار تھا اور ہندوستان بیل گاڑی کا ملک تھا۔ انکا باہم ہونا انقلاب اور قیامت کی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری موجودہ مصوری معجون مرکب بن رہی ہے۔ وطنیت کا غلط تصور بیچ مقداری کا احساس ہندوستانی مصوروں کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ ماضی کو ست جگت بنا کر پیش کریں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہم کچھ نہ سہی۔ ہمارے باپ دادا کے باپ دادا کے باپ دادا سے بڑھ چڑھ کر تھے یہ ماضی پرستی سماجی طور پر بھی مصیبت کا باعث بن رہی ہو۔ یقیناً ماضی کی روایات ہماری وراثت ہیں۔ اگر اجنٹا اپنے وقت کے روحانی جوش کا نتیجہ تھا تو مغل مصور شاندار درباری زندگی کے آئینہ دار تھے مگر ہمارے عہد کے مسائل اور ہیں۔ ذہنیت مختلف ہے۔ ماضی کو استعمال کیا جا سکتا۔ نقل اتارنا بے معنی ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے آجکل کے مصور حال سے گھبرا کر ماضی میں پناہ لینا چاہتے ہیں انکی نمائشیں اور تصویریں قبریں ہیں گلی سڑی لاشوں کی۔ ذرا ان کے موضوع دیکھو

جاپان کا خموش ڈراما

نو

(ادیبِ سحر نگار حضرت ل-احمد اکبر آبادی کے قلم سے)

جاپانی شاعری اور مخصوص اس کی ہکو صنف کا تذکرہ مکمل نہ ہوگا - اگر جاپانی ڈرامہ کی صنف نو کا تذکرہ نہ کیا جائے - نو کو ڈراما میں وہی خصوصیت حاصل ہے جو ہکو صنف کو جاپان کی شاعری میں حاصل ہے - یا بالفاظ دیگر نو جاپان کے ڈراما کی ہکو صنف ہے - اور اس کے تخیل میں اتنا ہی غلو ہے وہ اسی قدر رمزی (SYMBOLIC) ہے جتنی کہ ہکو صنفِ شعر ہے -

فن ڈرامہ کے ساتھ سب سے پہلی چیز جو بالعموم ضروری سمجھی جاتی ہے وہ ڈراما میں وقر (DIGNITY) کا وجود ہے - وقر ڈراما کا لازمی عنصر ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ڈرامائی وقر اور قنوطیت مخلوط ہو جاتے ہیں غلطی سے قنوطیت ہی کو وقر باور کر لیا جاتا ہے — حالانکہ ڈرامہ میں قنوطیت کا درجہ ایک نوع کا بہترین اعتذار ہے! جاپان کا نو ڈراما دنیا بھر کے ڈراموں سے جدا اور ایک مخصوص چیز ہے - اور اس کا صحیح اندازہ و تصور اس ڈراما کے تماشائیوں کے وجود بغیر نہیں کیا جا سکتا - نو ڈراما نے اپنے تماشائی یا ناظرین صدیوں کے صبر و تحمل سے پیدا کئے ہیں -

اگر غور سے دیکھا جائے تو نو اپنے ناظرین کا بھی محتاج نہیں بلکہ موجودہ صورت میں ناظرین ہی اس کے موجد اور تکمیل کرنے والے ہیں - بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ نو کے تماشائیوں کی تعداد تین سو سے زیادہ نہیں یعنی ایک تماشے میں اس تعداد سے نہیں بڑھتے انکو تماشائی کہنا شاید ایک غلطی ہو - کیونکہ وہ تماشائی سے زیادہ خود تو ایکٹر ہوتے ہیں - یہ تماشائی جو اپنے جبلی سکوت سے داد تماشہ دیتے ہیں - بجائے خود ایک حسین منظر پیش کرتے ہیں — ایک ایسا حسین نظارہ جیسے کسی چشمے کو پورے بہاؤ پر نور آفتاب کی برکتیں نازل ہو رہی ہوں! یہ شاید مبالغہ خیال کیا جائے لیکن ایک حقیقت ہے کہ اسٹیج پر اصلی ایکٹر جنکی تعداد کبھی تین سے نہیں بڑھتی شعر کو متحرک بنانے کے لئے کافی ہیں ان ایکٹروں کو اپنے التہاب اور جذبے کا راز اسوقت معلوم ہو جاتا ہے جب تماشائی اپنے آپ کو بھول جائیں!

تھیٹر یعنی مقرِ نو ایک مقدس مقام کی طرح نغمہ و شعر کے نام پر وقف ہوتا ہے جہاں ایکٹر اور تماشائی سخت دھندلا ماحول اور جاپانی صناعت کا نہایت خیال آفریں رنگ پیدا کر کے - دعاؤں کی روح کو پا لیتے ہیں - یہ رنگ و ماحول وہ جھٹ پٹا ہے جو زبان و بیان کی دسترس سے باہر ہے! نو تھیٹر در اصل ایک مقدس عبادت گاہ ہے جس کے اندر دنیا کے تفکرات اور حسیات حاضر کی واقعیت داخل نہیں ہو سکتی - نو کے اسٹیج پر سنگت کے آٹھ نفوس دو صفوں میں اسطرح نمودار ہوتے ہیں - کہ تماشائی ان کے چہروں کا صرف ایک رخ دیکھ سکتے ہیں - اور باجنتری اسٹیج کی چوبی پشت کی دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں سازوں میں صرف ایک بانسری اور دو طبلے ہوتے ہیں - اور پھر تماشا اس طرح شروع ہوتا ہے کہ بانسری کے اندر سے قرنوں پرانی دعا نکل کر تھرتھراہٹ پھیلا دیتی ہے —— گویا یہ عرش نغمہ مخفی آواز ہے جو جاپان کے جدید تمدن کو بد دعا دے رہی ہے!

یہ تماشا گاہ فی الحقیقت "حیاتِ جدید" کے صحرا میں ایک نخلستان ہے! تماشا بالعموم نو بجے صبح شروع ہو جاتا ہے - تماشا گاہ میں داخل ہو کر محسوس ہونے لگتا ہے کہ صناعتی جاپان بالکل مردہ نہیں ہو گیا ہے - وہاں انبساطؔ الم موسیقیانہ توازن کے ساتھ شیر و شکر ہوتے نظر آتے ہیں اور انسانی حیات لافانیت میں ملتے معلوم ہوتے ہیں! وہاں ماضی کا پر ہولناک ہیولا سامنے ہوتا ہے یا ابدیت کا حال اس طرح محو ہو جاتا ہے جیسے سورج کی روشنی میں چوہے غائب ہو جاتے ہیں!

عام ڈراما کے "قدر دان تماشائی" پہلے ہی رات میں پیدا ہو جاتے ہیں

لیکن تو ڈراما کی صحیح قدر کرنے والا پہلے ہی روز "سچا قدر دان" نہیں بن سکتا اسے اس کام کے لئے دو تین سال صرف کرنے پڑتے ہیں۔ تب کہیں وہ تو کی سچی قدر کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور اس امتحان میں پاس ہونے کیلئے یہ احساس پہلی چیز ہے کہ تو کی صحیح قدر و قیمت سمجھنے میں کسقدر آدمی ناکام رہے ہیں؟ اور لوگ اس کی قدر و خوبی پہچان لینے کے بعد ایکٹ کرنے سے بھی زیادہ دشوار چیز حاصل کر لیتے اور انکی زندگی زیادہ "ذی حیات" ہو جاتی ہے۔ تو ڈراما کی یکسانی اس کا اصلی حسن ہے جو تنوع اور رنگینی کو قربان کر کے پیدا کی جاتی ہے۔ اور اس کی قدر کرنے میں اس یکسانی کی پسندیدگی پہلا قدم ہے؛

مسٹر نوگوچی جب پہلی مرتبہ ایک دوست کے ساتھ تو ڈراما دیکھنے گیا تو اس وقت تک اس کے ذہن و دماغ کو وہی معمولی ڈراما کے دیکھنے کی عادت تھی۔ جسکو مغربی وضع زندگی نے سخت و درشت بنا دیا ہے۔ اس ڈراما کو دیکھنے کے بعد اس کے تاثرات خود اسی کے لفظوں میں سنئے:۔

جب میں پہلی مرتبہ ہوشو کے تو تھیٹر میں داخل ہوا تو اکتوبر کا مہینہ تھا جب پھول اور پتیاں جھڑتی ہوتی ہیں۔ جب چڑیاں اور محبت کے جذبات غائب ہوتے ہیں۔ جب موسم کا دھندلا قلب تو تماشے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ لیکن میں نے نشستوں پر اکثر نہایت معزز و عمائد کے نام کی چٹھیاں لگی دیکھیں تو میں اپنے دوست کی طرف دیکھ کر مسکرایا جو تو کا بڑا قدر شناس و مداح تھا۔ کیونکہ ایسے مجمع کے اندر ہونا جہاں ایسے عالی مرتبہ لوگ موجود ہوں دراصل کچھ نداق سا تھا اور مجھے کو نہ بے آرامی سی محسوس ہونے لگی میرا ذوق عامیانہ اور اشتہاری ڈراما کا بگاڑا ہوا تھا۔ اور میری اس نوع کی طبیعت کے لئے یہ بات کچھ تعجب خیز نہ تھی کہ تماشائیوں میں نہ صرف عورت و مرد بلکہ نوجوان عورتیں بھی ایسے لباسوں میں تھیں جن کے رنگ نہایت "خموش" اور جو تو ڈراما کے ساکت ماحول سے مطابقت رکھتے تھے۔ مجمع کا سکوت اس قسم کا تھا جو صناعتی قلب سے نکلتا محسوس ہوتا تھا۔ یہ سکوت اور ان تماشائیوں کو دیکھ کر مجھے "سکیا" یعنی "چائے خانے" کا خموش منظر اور ساکت "شعرائے چائے نوش" یاد آ گئے۔ تھیٹر کے تین سو تماشائیوں اور "چائے خانے" کے پانچ خموش شاعروں میں کوئی فرق نہ تھا کیونکہ "عدم و مکان" کا نظریہ روشن دماغوں کے لئے بڑی معنویت رکھتا ہے! میں نے اس ہال میں لوگوں کو آتے جاتے تو دیکھا مگر نہ باتیں سب کی گونگی تھیں۔ اور خم سر کا بس ایک حسین اشارہ گفتگو کرتا دکھائی دیتا تھا! ان کی یہ آمد و رفت اس قدر خموش تھی کہ اسے تار عنکبوت کے گذر جانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ میرے دل میں معاً "روجی" یا روش باغ کا خیال تازہ ہو گیا جہاں چائے پر مدعو مہمان "چائے خانے" میں جانے کے لئے انتظار کرتے ہیں اور جس کے اندر پہنچکر یہ "چائے نوش" (ٹی ماسٹر) شعرا دنیائے واقعی کی خاک اپنے قدموں سے جھاڑ دیتے اور اسے فراموش کر کے "چائے نوشی" کی جمالیاتی لذت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں!

مجھے تسلیم ہے کہ یہ تقابل مبالغے سے خالی معلوم نہ ہو گا۔ لیکن مجھے جو بات کہنی ہے وہ یہ ہے کہ تو تھیٹر کی یہ خموش آمد و رفت اس سے زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ جتنی کہ عام تھیٹروں میں "چونی والے درجے" کی گذرگاہ! اس لئے اگر آپکو "روجی" سے تعلق نہیں کر سکتے تو میں ایک "چائے نوش" (ٹی ماسٹر) شاعر کی طرح مشورہ دوں گا کہ آپ ایک "روجی" پر جب کسی کائی چڑھی ہوئی پتھر کی لالٹین تک پہنچنے کے لئے دھندلکے میں سے گزریں تو ایک لمحے کیلئے برگزار ما۔ یا کسی سمندری شاخ۔ یا سر شام چاند کے آہستہ غروب ہونے کا دھیان اسوقت بھی کیجئے جب آپ اپنی نشست پر جا بیٹھیں اور اس دنیائے صناعت میں داخل ہونے کو ہوں۔ جسکو آپ ہی کے خنک اور اندھیرے دل نے پیدا کیا ہے۔ اور آپ اپنے گھٹنوں پر رکھے ہوئے ڈراما کی کتاب کھولیں اور آپ کے سامنے سنگت (کورس) والے اسٹیج پر اپنی جگہ لے رہے ہوں!

تو اسٹیج سے چھوٹا دنیا بھر میں کوئی اسٹیج نہیں ہے۔ اس کے بڑے سے بڑے اسٹیج کا ناپ ۲۵ فٹ مربع سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور ہر طرف سے کھلا ہوتا ہے۔ البتہ پشت پر ایک چوبی دیوار ہوتی ہے جس پر صنوبر کا ایک پرانا درخت منقوش ہوتا ہے۔ اتنا پرانا جتنی کہ دنیا پرانی ہے۔ اتنا دھندلا جتنی شاعری دھندلی ہوتی ہے۔ اور اس طرح جھومتا معلوم ہوتا ہے جیسے کہرے میں کوئی ابدیت کی علامت! اسٹیج کی سطح سے ملی ہوئی اس کے داہنی طرف ایک قدرے طویل گیلری ہوتی ہے۔ جس پر تو ایکٹر چلتے پھرتے نظر آتے اور تماشے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور جو ایک گذرگاہ معلوم ہوتی ہے —— ایک آغاز و انجام یا بالفاظ دیگر حیات و مسرت کی گذرگاہ! آپ کو وہاں اگر کوئی چھت دکھائی دے گی تو وہ ایسی ہوگی کہ آپ خود ہستی باوجود کے وقار سے متاثر ہو جائیں گے۔ اور یہ بات مغربی وضع کے اسٹیج میں کبھی محسوس

نہیں ہوتی۔ تو اسٹیج ایک ایسی سادہ چیز ہے کہ آپ اپنے جاپانی گھر میں
پردوں کے ہٹانے لگانے سے بھی تیار کر سکتے ہیں۔ رہ گئی اس کی آرائش
تو وہ کچھ دشوار نہیں۔ کیونکہ اس کی آرائش تمام تر تخئیلی ہوتی ہے۔ اور
اگر کچھ واقعی آرائش ہوتی بھی ہے تو از حد سادہ! اس کی آرائش کیلئے
صرف نازک اور شاعرانہ تخئیل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ نو ڈراما کیلئے بس
یہی ایک عنصر ضروری ہے جو سینری اور فرنیچر کی کمی کو پورا کر دیتا ہے۔
نو اسٹیج کی طیاری میں ایسے موقعے بھی آجائیں گے۔ کہ آپ کو اپنی بلند و
نازک تخئیل پر بھی اعتبار نہ رہ جائے گا۔ جب آپ اور اشیا کی نشیبی
وادی اور اس کے شاہدانہ کے درختوں کی شاخوں اور ایک اونچے گھنٹہ
گھر کا تصور قائم کریں گے جس کے چوبی ڈھانچے میں کاغذ کی گھنٹیاں لگی ہونگی
اور جو ہلتا ہوگا تو آپ مشکل محسوس کریں گے۔ اور اس سے زیادہ مشکل
اسوقت محسوس ہوگی آپ کسی جہاز۔ ایک سمندر اور پتھواروں کا تخئیل
کریں گے۔ جو سب کے سب بانس کے بنے ہوں گے!

یہی مسٹر نوگوچی آگے چل کر کہتا ہے کہ:۔

مجھے یقین نہیں کہ میری طرح آپ بھی متاثر ہو سکیں گے اور رنگے
ہوئے چوبی ماسک (مصنوعی چہرہ) والے ایکٹروں کے ساتھ کبھی مسکرانے لگیں
اور کبھی آنسو بہانے لگیں گے۔ بہرحال آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ نو حقیقت
ماسک ڈراما ہے۔ اگرچہ لفظ ماسک جاپانی مفہوم کا سچا حامل نہیں ہو سکتا
نو ڈراما کے ماسک حیرت انگیز طریق پر انسانی محسوسات کے نازک ترین
اثرات کو ظاہر کر سکتا ہے۔ لیکن اس کا اظہارِ حیات ہماری تخئیل کا اثر
ہوتا ہے جو چوبی ماسک کے اندر مجھے اور آپ سے زیادہ "ذی حیات" روح
پیدا کر دیتی ہے۔ ماسک کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اس کا تاثر قائم رہے
اور ایکٹر بعد کمال اپنے آپ کو "واقعیت" (REALISM) سے محفوظ کرنے کی
کوشش کرتے ہیں۔ اور انکی یہ کوشش شعرا اور دعا کے اثر سے کامیاب
ہوتی ہے٭

نو ڈراما انسانی ذہن کے جن رازوں کا انکشاف کرتا ہے وہ
صرف اس احساس سے بیان ہو سکتے ہیں کہ آنسو اور مسکراہٹ جو خون کے
رشتے سے بھائی بہن ہیں۔ اسی پرانے انسان میں سے نمودار ہوتے ہیں۔
تو یہ حقیقت بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کے اثرات میں
ایک نہایت نازک اور ہلکے رنگ کا فرق ہے۔

جن لوگوں کے حواس میں درشتی و ناتراشیدگی قوی ہے وہ اس
مقر تخئیل نو تھیٹر میں داخل ہونے کے مجاز نہیں۔ یہاں تو صرف وہی لوگ
باریاب ہو سکتے ہیں جو "غیر مکمل" کے خموش پرستار ہیں اور اپنے تخئیل کی
مقدس مراسم پرستاری ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ گو آپ
اسے تسلیم نہ کرنے کا ارادہ کر چکے ہوں۔ لیکن اس کے باوجود جو شئے آپ
نو ڈراما کی حقیقت منوالے گی۔ وہ اس کا باوقر ہونا ہے۔ تو یہ ایک نصف الحقیقت
ہوگی۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ نو ڈراما کا نسائی کردار جس کی
آواز اور حرکات و سکنات مرد کے کردار سے کچھ مختلف نہیں ہیں۔ اگر
معمولی اسٹیج پر آپ کے سامنے آجائے تو آپ کو اس منظر سے تنفر و اکراہ
پیدا ہوگا۔ لیکن نو ڈراما کے اسٹیج پر خود آپ کے تخئیل شعری اس سطحی
واقعیت کو دیکھنے سے انکار کر دے گی ــــ اس کی قدر کر سکنے کے لئے
ہر قسم کی تنقید سے درگزر کرے گی! اس لئے کہ نو ڈراما کا اظہار (EXPRESSION)
اس درجہ نازک اور اس حد تک خفیف ہوتا ہے! اور اس سادگی کی
اس کی "عظیم الشان" نزاکت کو انسانی قوت و توانائی یا بالفاظ دیگر اس کی
ناتراشیدگی کی عظیم الشان قیمت دے کر حاصل کیا جا سکتا ہے!

یہ نو ڈراما بجائے خود ایک نہایت مختصر چیز ہے۔ اور اس کے
آغاز سے آج تک درمیان میں پردہ ڈالنے اور اٹھانے کی زحمت شامل
نہیں کی گئی ہے۔ نو تھیٹر میں ناظرین خود اپنے تخئیل میں پردہ گراتا اٹھاتا
رہتا ہے۔ کیونکہ نو کا مقصد حاصل کرنے کے لئے اسے اپنی جگہ ایسا کرتے
رہنا بھی ناگزیر ہے! ہر چند تماشائی کو یہ پردہ معمولی اسٹیج کی طرح بار بار
گرانا اٹھانا نہ پڑے گا۔ لیکن بہرحال بعض وقت ختم تمثیل سے پہلے ہی پردہ
گرا دینا پڑتا ہے۔

نو ڈراما کا ماحول آپ کو اسی عالم میں پہنچا دیتا ہے جس طرح آپ
"چائے فلنے" (ٹی ہاؤس) کے اندر چائے کی مہک۔ جوش کھائی ہوئی کیتلی کی
میٹھی راگنی اور بخور کے بل کھاتے ہوئے دھوئیں کے ماحول میں با آہستگی
لیکن یقینی طور پر ایک سمجھ میں نہ آسکنے والے دھندلکے یا جھٹ پٹے میں
پہنچ جاتے ہیں۔

نو ڈراما اور "چائے نوش" شعرا کی صحبتوں میں یہ تقابل و

مماثلت آپ کو ممکن ہے کہ بادی النظر میں محض تخیلی یا صرف ظن وتخمین نظر آئے لیکن آپ یہ معلوم کرکے اس کو خیال آرائی محض نہ سمجھیں گے کہ ان دونوں نے بالعمل ایک ہی عہد میں وجود اختیار کیا۔ ایک ہی زمانے میں ان کی ہمت افزائی ہوئی اور ایک ہی دور میں انکا ارتقا (DEVELOPEMENT) ہوا اور وہ دور جاپان میں اوشیکاگا کی حکمرانی کا دور تھا۔ یعنی ان دونوں نے چودھویں سے سولھویں صدی عیسوی میں ساتھ ساتھ نشو ونما پائی ہے۔ اور ان دونوں نے جاپان کے لوگوں کو سادگی کا سادہ سبق دے کر انکی زندگی میں توانائی پیدا کر دی ہے!

اِس عہد میں جبکہ سادگی مفقود ہے اور پیچیدگی نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ زندگی کے ہر پہلو میں سادگی کا سبق زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ تنوع اور تمول نے ہمیں آخر وہ کونسی چیز دے دی ہے۔ جسپر ہمنے اپنی تمام سادگی کو قربان کر دیا؟

نوؔ ڈراما کا سب سے بڑا سرپرست اور پالن ہار اوشیکاگا حکومت کا تیسرا فرمانروا یوشی متسو گزرا ہے۔ جس نے نوؔ ڈراما کی جتنی سرپرستی کی اتنی "چائے نوشی" ادارے کی شاعری کو بھی سرافراز کیا۔ اس فرمانروا کے علاوہ یوشیماسا اس لئے ہمیشہ زندہ رہے گا کہ اس نے نوڈراما کی تکمیل کی اور اسے موجودہ صورت تک پہنچا دیا۔ ان دونوں ہستیوں کے بعد ہڈیوسی ٹیوٹومی فوجی سپہ سالار کا نام یادگار رہے جس نے نہ صرف "چائے نوش" (ٹی ماسٹر) شعرا کی قدر افزائیاں کیں بلکہ نوؔ ایکٹروں۔ سوئیکی اور اِکیو کو بھی نوازا بودھ مذہب کے راہب خانوں میں رسم "چائے نوشی" اور نوڈراما یکساں طور پر مقبول تھے۔ نوؔ قسم کے اس وقت جتنے ڈرامے عالم وجود میں ہیں ان کی تعداد بھی تین سو کے قریب ہے۔ ان تمام ڈراموں میں ایک بھی ایسا نہیں جس میں ایک پجاری کا کردار سامنے نہ آتا ہو۔ اور اسکی روحانی طاقت کسی سپاہی۔ یا کسی خاتون یا کسی پھول یا کسی درخت کی روح کو بابرکت نروان میں نہ پہنچا دیتی ہو۔

ڈراما کی اس صنف کو اگر ہم اس بات کا لحاظ کرکے روحانی ڈراما کا لقب دیں گے تو وہ اتنا ہی غیر صحیح ہوگا۔ جتنا اس کو "پجاری ڈراما" کہنا غلط ہوگا۔ نوؔ کا اصل مقصود حیات انسانی کی حزنیہ کو بیان کرنا ہے اور اس بیان کی صراحت ایک بس ساعقۂ تفہیم ہے ۔ جو بودھ مت کی پیدا کردہ ہے۔ نوؔ کا مدعا قدیم افسانوں اور اساطیر کی طربیہ کو پیش کرنا ہرگز نہیں کیونکہ بیشتر ڈرامے خود پجاریوں کے تصنیف کئے ہوئے ہیں یا بعض ایسے لوگوں کے نتیجۂ فکر و تراوش قلم ہیں۔ جو بودھ مت سے متاثر تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان ڈراموں کے مصنفین کے نام فراموش کر دئے گئے یا خود ان مصنفین نے اپنے ناموں کو گمنامی میں رکھنا پسند کیا۔ بعض نام۔ مثلاً سیآمی اور اوتوآمی وغیرہ جو معلم بھی ہیں۔ ایک محقق کا دعوےٰ ہے کہ وہ مصنف نہ تھے بلکہ ڈراما کی موسیقی۔ رقص اور اسٹیج کے معمولی منتظمین میں سے تھے۔ اس زمانے میں لوگ اس کا مطلق خیال نہ کرتے تھے کہ "قول کس کا ہے؟" بلکہ صرف یہ دیکھتے تھے "قول کیا ہے؟" ان کو مصنف کی ذات سے مطلق بحث نہ ہوتی تھی۔ بلکہ وہ صرف ڈراما کی اہمیت کو دیکھتے تھے! عہدِ حاضر کی اشتہار بازی اور پروپگنڈے سے کسقدر مخالف ہے! اس لئے یہ کہنا بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ ڈرامے قومی تاثر اور ادبی شغف کے باعث ایک راز کی شکل میں وجود پذیر ہوئے۔ یعنی وہ کسی ایک عہد یا زمانے کی پیداوار نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ غلط نہ ہوگا کہ وہ از خود تصنیف ہوگئے ۔ اس طرح جیسے بودھ مت کی روایات کی زمین میں کوئی پودا یا پھول اُگ آئے!

ادبی حیثیت کے اعتبار سے نوؔ ڈراما عہد قدیم کے کیوٹو کے دربار کی ہمت افزائیوں سے جو ادب پیدا ہوا اور جسے انشائے اشرافی ( ) کہنا چاہئے قطعاً مختلف چیز ہے اور اپنی انعطافی صورت میں یکسر جمہوری شے ہے۔ طرز انشا اور ترکیب لفظی کے لحاظ سے ہرچند کوئی بین فرق نہیں۔ اور وہ انشا و ادب حقیقتاً شاعری کا اشرف ترین اظہار (EXPRESSION) ہے ـــــ ایک ایسا اظہار جو زرلفت پوش ایکٹروں کی موسیقیانہ حرکات رقص سے مشابہ ہے!

جاپانی ادب میں نوؔ ڈراما کے مقابلے کی کسی افسانوی نظم کا نمونہ موجود نہیں ہے اور نو کے متعلق دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی فقرہ کوئی تخئیل اور کوئی واقعہ ایسا نہ ملے گا جسکو کسی طرح غیر موزوں یا نامناسب کہا جا سکے! فضا و ماحول یا تخئیل و حیات میں خفیف سی کمی بیشی بھی ممکن نہ ہوگی۔ یہ ڈرامے غیر فانی اور عجیب وغریب ہیں۔ مفتخر ترین ہیں۔ انتہائی ذی حیات ہیں۔ اور خود انسانیت کے نغموں اور نالوں کے محفوظ ترین سرچشمے ہیں!

(۲)

اس صنف کے پرانے ڈرامے۔ بڈھوشی کی سرپرستی میں نہ صرف باقی رہ گئے بلکہ ان میں ترمیمیں اور اضافے بھی ہوئے۔ اور نئے ڈرامے بھی لکھے گئے۔ اور ٹوکوگاوا کی جاگیرداری عہد میں جاپان کی حیات قومی کا اہم عنصر بن گئے تھے۔ کسی نوڈرامے کے فقرے دُہرانا یا اسٹیج پر انکو ایکٹ کرنا شرفاء کے لئے لازمۂ شرافت سمجھا جانے لگا تھا۔ اور آج تک معمولی تھیٹر کے مقابلے میں نو ذی وقعت رہا۔ اور شریفانہ تفریح بہم پہنچاتا رہا ہے! اس میں نہ صرف تقدس کی شان پیدا ہو گئی اور شادی کی تقریبوں کا ایک ضروری جزو بن گیا۔ بلکہ ایک مخصوص ڈرامے کی جس کا عنوان "ٹکاساگو" تھا۔ چند سطریں عقد نکاح کے وقت گائی جانا شادی کو دوام اور یقین بخشنے کے لئے لازمی ہو گیا تھا۔

"ٹکاساگو" ڈراما استقلال۔ تحمل۔ صحت اور درازئ عمر کے پہلو کو پیش کرتا ہے۔ اور اس طرح شروع ہوتا ہے کہ مرد و عورت کا ایک معمر جوڑا صنوبر کے درخت کے نیچے پتیاں جمع کر رہا اور گاتا جاتا ہے۔

"یہ سچ ہے کہ صنوبر کے درخت اپنی تمام پتیاں نہیں جھاڑ دیتے
اور انکی سبزی طویل مدت تک تازہ رہتی ہے۔ سدا
بہار پودوں کے مقابلے میں بھی جو غیر متبدل ہونے کی
خصوصیت سے متصف ہیں۔ صنوبر کی عزت و وقعت
زیادہ ہے ۔۔۔ ان دو صنوبروں کی عزت و وقعت
جو ساتھ ساتھ بوڑھے ہوئے ہیں!"

یہ صنوبر کے دو درخت کیا ہیں؟ یہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت کون ہیں؟ درختوں کی روحیں اگر کوئی سے ہیں تو یہ بوڑھے میاں بیوی ہی ہیں۔ جو زریں و مسرور زندگی کے بعد کا نغمہ گا رہے ہیں!

نو صنف کے تقریباً تین سو ڈراموں میں اعلےٰ ترین ڈراما حسن "جامۂ بال و پر" ہے۔ یہ ڈراما حسن عبارت اور الطافت کی نازک اضافی جس کا حامل ہے۔ اس میں ایک پری کا قصہ بیان ہوتا ہے جس کا "جامۂ بال و پر" ایک مچھیرے نے میتو کے صنوبری کنارے پر سے اس وقت چرا لیا جب وہ غسل کر رہی تھی۔ اور انجام کار اپنا رقص دکھانے کا وعدہ کر کے اسے اپنا لباس واپس ملا تھا۔ جاپان کی تہذیب و تربیت کا بہترین و اعلےٰ ترین کارنامہ اعتدال کی تعلیم ہے! چنانچہ اس ڈرامے میں مشرق کی تمام خوبیاں اور الم خوئی اس پری کے گیتوں میں ظاہر ہوتی ہیں جو اپنے بلند مقام کی جانب پرواز کرنے سے قاصر ہے۔

"میری نگاہیں۔ اُن سماوی فضاؤں کی تلاش بیکار کر رہی
ہیں جہاں بلند ہوتے ہوئے بخارات ساری فضا پر چھا جاتے
اور بادلوں کی جانی پہچانی پگڈنڈیوں کو چھپا لیتے ہیں!"

اس نے مچھیرے سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس کو اپنا رقص دکھائیگی جو قصر قمر کو بھی وجد میں لے آتا ہے اور اس رقص کو انسان کے لئے ایک یادگار کے طور پر اس دنیا ہی میں چھوڑ جائے گی۔ بشرطیکہ مچھیرا اس کا لباس واپس دیدے لیکن اس مچھیرے کو اندیشہ ہو گیا کہ لباس پا کر کہیں وہ رقص دکھائے بغیر ہی نہ اُڑ جائے۔ تو پری نے اس سے کہا۔

"تف ہے تجھ پر! انسان کے عہد و اقرار میں شک ہو سکتا ہے
لیکن ملائے اعلےٰ کے مکین وعدہ خلافی نہیں کرتے!"

اور کہیں اشارہ کیا گیا ہے کہ نو ڈراما ایسے عہد کی تخلیق ہے جب گوتم بودھ کے مقدس نام کی برکت سے برزخ کی آوارہ روحیں بھی نروان پا لیتی تھیں اور اسی لئے اکثر ڈراموں میں بودھ مت کی روحوں کا ذکر ضرور ہوا ہے۔ آج کے عہد مادہ پرستی میں بھی روحانیت کے اذکار شاعرانہ خیالات کے لئے قابل قبول شے ہیں۔ بودھ مت کے عقیدے کو کیسا ہی متعصبانہ کیوں نہ کہا جائے۔ لیکن اس عقیدے کی جان یہ ہے کہ شعری تخلیات ہمیشہ باقی ہیں!

ہر چند نو ڈراما کی بساط مایہ کم و بیش نہیں ہوتی۔ لیکن ہماری تفہیم اور تصور میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے نو کی تازگی میں فرق نہیں آتا! ایک ڈراما جس کا نام "روحِ کوہستان" ہے اور جس کا مصنف بے شبہ کوئی پجاری تھا۔ اس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسانی روحیں تناسخ کے جھنجھٹ میں اسی طرح پریشان ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے کوہستان کی روح ساری رات پہاڑ کا چکر کاٹتی رہتی ہے۔ اس ڈرامہ میں پہاڑ سے خود زندگی عبارت ہے۔ اس فسانے کا پلاٹ اُس پر شدید ترین ہو جاتا ہے۔ جب ہیاگما یعنی کوہستانی روح داخل ہوتی ہے۔ اس روح نے ہیاگما کا نام اپنے رقص کی بدولت حاصل کیا ہے۔ کیونکہ وہ پہاڑ کا چکر کھایا

کرتی ہے۔ وہ سایوں کی پہاڑی' پر اسوقت راستہ بھول جاتی ہے جب زنگوجی
کیطرف یاترا کو جاتی ہوتی ہے ـــــ زنگوجی بودھ مت کا ایک مقدس
مندر ہے۔ اس مندر میں ہیا کما کی ملاقات پہاڑ کی اصلی روح سے ہوتی ہے
جس کی ستارہ سی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ اور برف کی طرح سفید ڈراؤنے
بال ہیں۔ یہ روح اس عورت کو پہاڑ کے گرد رقص کرنا بتاتی ہے ـــــ
یعنی کوہ حیات کے گرد! ڈراما کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ رقاصہ کوہستانی
روح کے حضور دعا کرتی ہے اور ان پہاڑوں میں غائب ہو جاتی ہے
کیونکہ اس کی زندگی پیچیدہ زندگی کے بادل چھٹ جاتے ہیں ـــــ
آوا گون کی خاک جھڑنے لگتی ہے!

ایک اور دلچسپ ڈراما "شانِ سحر" ہے۔ اس قصے میں یہ پھول
جس کا نام شانِ سحر ہے اور جو صرف ایک صبح کی مختصر زندگی پاتا ہے دوسرے
طویل العمر پھولوں پر رشک کرنے کے مواخذے میں نروان حاصل نہیں
کرسکتا ہے۔ مگر پجاری کی مناجات سننے کے بعد اس پھول کی روح تسکین یاب
ہو کر غائب ہو جاتی ہے۔

مسٹر یوِن لو گوچی نے اس قدیم ڈراما کو جدید لباس سے آراستہ
کیا ہے۔ ہم اس ڈرامے کا مکمل ترجمہ درج ذیل کرتے ہیں:۔

شانِ سحر[1]

پجاری ـــ زندگی کے بے راہ و نشان صحرا میں راہبر کون ہے؟
پجاری کی سیاہ چادر کو دیکھ جو اس نے اپنے آقا کی محبت میں
کبھی نہ بدلنے والی محبت میں پہنی ہے۔ ایسی سیاہ چادر جیسے
کالی رات! اور وہ کالی ہے رحم کی شدت سے! میں اپنی
سمرن جپتا ہوں۔ میں دنیا اور زندگی کے گناہوں کا شمار کرتا
ہوں۔
میری دعا ہے کہ شام کے وقت بجنے والے گھنٹے چپ ہو جائیں۔ میں
ہر وقت خوشی کو اور سورج کے ڈوبنے کو دیکھتا رہتا ہوں ـــــ
اس مقام کی طرف دیکھتا رہتا ہوں جہاں جنت ہے۔ جہاں حقیقی
مقام ہے!
میرا فرض ہے کہ مصیبت زدہ روحوں کو قانون اور صداقت کا
مطیع بنا دوں۔ اور انتشار عناصر اور راحت کا گیت پھر حاصل
ہو جائے۔ یہ کون سا پھول دکھائی دے رہا ہے؟
کیا یہ شانِ سحر نہیں ہے۔ وہ پھول جو بہاروں کا خواب اور شبنم کا
تصور ہے؟
لیکن خزاں کے سناٹے نے جب دلوں کی حرارت اور فطرت اور
گیتوں کو خموش کر دیا ہے۔ اس پھول کا نظر آنا تعجب ہے۔ وہ
ایک ایسا گیت معلوم ہوتا ہے جو بغیر گائے فراموش کیا جا چکا ہے!
دہقانی مجھے بتا کہ یہ کیا پھول ہے؟

دہقانی۔ باوا یہ پھول شانِ سحر ہی ہے۔

پجاری۔ کیا یہاں یہ پھول اکتوبر کے ہلکے بادلوں ہی میں دکھائی دیتا ہے؟

دہقانی۔ نہیں باوا۔ مینے بھی اسے پہلی ہی دفعہ دیکھا ہے!

پجاری۔ اس پھول کی کٹوری کی کپکپاہٹ تو دیکھو۔ جیسے وہ اپنی ہستی سے
ڈر رہا ہے۔ اوہ اس حسن کی ناکارگی جو زندگی کو ترک کر کے آسمانوں
میں اُڑ جائے!
کیا یہ اصلی شانِ سحر ہے؟
کیا یہ کوئی وہم وخیال یا خود رنج والم نہیں؟
مجھے اس کی کپکپاہٹ میں ایک ایسی انسانی بولی سنائی دیتی ہے
جو بے صدا ہے!
کیسا عجیب راز ہے۔ کیسی ماتم زدگی ہے۔ کیسی حزن آفریں تھرتھراہٹ
ہے! میں ایک پجاری ہوں۔ کنکر پتھر اور گھاس جس کا بچھونا ہے
جو پانی کا۔ درختوں کا۔ ستاروں کا اور رات کا رفیق ہے۔
میں اسی جگہ سو جاؤں گا اور اپنی پرارتھنا کی شکتی سے اس پھول کے بھید کو
پا لوں گا۔
اے پھول تیرا جو نام بھی ہو۔ آج کی رات مجھے اپنا مہمان بنا لے!
(دہقانی چلا جاتا ہے۔ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ رات کا پہلا گھنٹہ بجتا
ہے۔ پجاری منتر پڑھنے لگتا ہے۔ ایک نازنین اس طرح داخل
ہوتی ہے جیسے خزاں کے موسم میں ہوا کا کوئی لطیف جھونکا)

عورت۔ آہ۔ میرا دل رنج اور دیوانگی سے پھنکا جا رہا ہے!
اُف! جلن اور بے چینی کا شکار ہو جانے کی بلا!

[1]

میں عالمِ برزخ کی ایک آوارہ روح ہوں جس کا اطمینان چھن گیا ہے!

اس زندگی کے بعد جو اوپر کی سمت چلی جاتی ہے۔ جو نورانی اور سورج کی زندگی ہے!

آہ۔ مجھے اس انتشارِ عناصر موت سے کتنی نفرت ہے!

پجاری ۔ اے عورت تو کون ہے؟ تو کسی مرے ہوئے کی روح معلوم ہوتی ہے جو مری نہیں ہے۔ جو یزدان کو بُرا کہتی اور جو اطمینان کی آوارہ روح ہے!

عورت ۔ باوا۔ میں شانِ سحر کی روح ہوں!

پجاری ۔ آرزوئے بہار اور تمنائے شبنم کی پیاری بچی!

تو پھر تو کینہ و بدی کی روح کی طرح ماری ماری کیوں پھرتی ہے؟

عورت ۔ میں دوسرے پھولوں کی زندگی کی طرح عمر میں درازی کی طلبگار رہوں۔ ان پھولوں کی طرح جو آفتاب اور دن کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور زندہ رہتے ہیں۔

آہ۔ میری مختصر زندگی! جو اپنا پہلا دن شروع ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے! مجھے زندگی کی خوشیوں اور اس سورج کو محسوس کرنے کی کسقدر خواہش ہے!

پجاری ۔ غریب بچی! اگر موت نہیں تو زندگی بھی نہیں۔

موت کچھ بھی نہیں۔ مگر ستار کے ایک پردے سے دوسرے پردے کی تبدیلی! مختصر تر زندگی شیریں نہ رہے — جیسے کہ مختصر گیت ہوتا ہے۔

اچھی طرح مرنا ہی اچھی طرح جینا ہے!

زندگی عمرو سال کی درازی کا نام ہے۔

وہ پھول کہاں ہیں جو سو سال پہلے کھلے تھے؟

اور ہو — موت اور یزدان زندہ باد! انتشارِ عناصر اور راحت میں زندہ رہو! ظلمت اور موت کے اندر ایک زندگی جینا چاہیئے۔

اے عورت یا پھول! قانع ہو جا اور ایک گائے ہوئے گیت کی طرح ختم!

عورت ۔ میں تمہارے شبد سنکر خوش ہوں۔ میرے مقدس باوا۔ میری غمگین روح کو اشیرباد دو کہ وہ برزخ کو پلٹ جائے!۔

پجاری ۔ نمو اُمید ابتسم ——

(نازنین مغاشانِ سحر کے اندر غائب ہو جاتی ہے۔ چاند نمودار ہوتا ہے۔ پھول مرجھا جاتا ہے۔ نیم شبی گھنٹے بجنے لگتے ہیں"۔)

(ل۔ احمد)

خیالِ خام

ایک ہندوستانی میاں اور فرانسیسی بیوی کے دوست آشنا!؟

(از جناب بصیر احمد صاحب الہ آباد)

میڈم سے ملے ہفتہ بھر ہوا تھا۔ لیکن اس ایک ہی ہفتہ میں ہم دونوں میں ایک خاص قسم کی دوستی ہوگئی۔ دوسروں کے سامنے غیریت لیکن تنہائی میں یا اپنے شوہر کے سامنے میڈم خاصی بے تکلف ہو جاتیں خانگی معاملات نے مجھے دیوانہ سا بنا رکھا تھا۔ بیوی سے لڑائی۔ قرضہ سر پر۔ دماغ یکسو نہ تھا۔ چھٹی لے کر یہاں اس لئے آیا تھا کہ طبیعت کو سکون ہو۔ دل و دماغ ایک عورت کی ہمدردی ڈھونڈھتے تھے شاید اسی وجہ سے میڈم کے یہاں اتنا آنا جانا ہو گیا۔

ہر موضوع پر گفتگو ہوتی۔ خاص طور سے ہندوستانی مردوں کے رویہ پر کہ وہ عورتوں سے کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ میڈم مزے لے کر اُن کا مذاق بناتیں۔ حالانکہ وہ ایک ہندوستانی سے باتیں کرتی تھیں اور اُن کا شوہر بھی ہندوستانی تھا۔ میں انکی ہاں میں ہاں ملاتا۔ میڈم اس شہر کی اور وہاں کے لوگوں کی بُرائی کرتیں اور میں اکثر اُن کی رائے سے اپنے کو متفق پاتا۔

ایک روز میں اور یہ دونوں میاں بیوی میرے ایک دوست۔ حامد کی موٹر میں بیٹھ کر شام کو ہوا خوری کے لئے باہر گئے۔ مسٹر نیاز (میڈم کے شوہر) اور حامد آگے بیٹھے اور مجھے میڈم نے پیچھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میڈم اس شام کو بہت کو بہت مزے اور آزادی سے باتیں کر رہی تھیں۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور موٹر کھلی ہوئی اور تیز جا رہی تھی۔ میڈم نے آہستہ آہستہ عورت کی آزادی پر گفتگو شروع کی۔ میں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ لیکن جب میں نے میڈم سے یہ کہا کہ ہر عورت اور مرد آزاد ہے۔ جسم اس کا ہے۔ دماغ اور دل اس کا ہے جسے چاہے دے اور جسے چاہے نہ دے۔ لیکن زیادہ لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ اور اس جبر کے بعد لوگ ان کے منہ سے عصمت و عفت اور دوسروں کی بدکاری کے متعلق لکچر اور افواہ سنتے ہیں۔ کیوں میڈم کیا آپ کو میری رائے سے اتفاق نہیں؟

میرے اس فقرہ کے بعد میں نے اُن میں ایک تغیر محسوس کیا۔ انہوں نے خاموشی سے سر ہلا کر میری رائے سے اتفاق کیا۔ وہ اب خاموش ہوگئیں۔ اُن کے تمام جسم میں بے چینی سی تھی۔ دماغ میں شاید کوئی خیال آگیا۔ اِدھر اُدھر موٹر کی نشست پر پھدکتی رہیں۔ آخر کار بالکل میرے پاس مجھ سے مل کر بیٹھ گئیں۔ اور خاموشی سے میرا داہنا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ مجھے یہ بھلا معلوم ہوا۔ میرا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ لیکن میڈم کا نرم ہاتھ گرم ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ میری تکلیفوں اور مصیبتوں میں میرا ساتھ دے رہی ہیں۔ ایک ہاتھ گرم ہو گیا تو میں نے مذاقاً دوسرا ہاتھ بھی میڈم کے ہاتھ میں یہ کہکر دیا۔ کہ اُسے بھی گرم کر دیجئے۔ ورنہ شکایت رہے گی۔ میڈم نے آہستہ سے میرا ہاتھ اپنے پہلو سے الگ کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں شرارت کی جھلک تھی۔ اپنی انگلی سے خاموشی کا اشارہ کیا اور پھر وہی انگلی اپنے شوہر کی پشت کی طرف اُٹھائی۔ جلدی سے نیچے جھک کر پہیوں میں ہوا بھرنے کا پمپ اُٹھا لیا۔ مجھے اشارہ کیا کہ میں اسے چلاؤں اور خود اُس کی تنہائی

بیچارے نیاز کے کان کے پاس لگا دی۔ وہ اس بلائے ناگہانی سے بےخبر حامد سے بہت زور شور سے کسی خشک موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ پورے پورے زور سے میں نے پمپ چلایا۔ نیاز اچھل پڑے۔ میڈم کا قہقہہ ایک فرلانگ تک موٹر کے پیچھے ایک مسلسل آواز میں غائب ہوتا رہا۔ نیاز نے پلٹ کر کوئی بات فرانسیسی میں اپنی بیوی سے کہی۔ انہوں نے ہنس کر پمپ کی جھنالی الگ کر لی اور نرمی سے میرے ہاتھ سے پمپ لے کر نیچے رکھ دیا۔ مگر میرے ہاتھ نیاز کو ہوا دینے کے لئے سختی سے تیار تھے۔

میں سوچنے لگا کہ میڈم نے یہ حرکت کیوں کی؟ اپنے شوہر کو متوجہ کرنے کے لئے؟ یا اسے میری نگاہ میں حقیر کرنے کے لئے؟ میں کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکا تھا کہ میڈم نے میرے کان کے پاس منہ لا کر آہستہ سے کہا۔ "مجھے سردی لگ رہی ہے"۔ میں نے اپنا کوٹ اتار کر اُن کے زانو پر ڈال دیا نیاز پھر اپنی بحث میں منہمک تھے۔ گویا انہیں بیوی کی ہستی سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں موٹر میں اکیلے بیٹھے جا رہے ہیں۔ میڈم کا ہاتھ کوٹ کے نیچے سے آہستہ آہستہ آیا اور میرے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ اسی آہستگی سے میرے ہاتھ کو میڈم نے اٹھایا اور اپنے گالوں سے لگا لیا۔ اُن کے گال تمتما رہے تھے۔

"بہری خبرلو" میڈم نے دھیمی آواز میں کہا۔

مجھے شبہ ہونے لگا کہ یہ عورت مجھ سے کھیل رہی ہے اور مجھے بیوقوف بنانا چاہتی ہے۔ "اور بڑے میاں (نیاز کی طرف اشارہ کر کے) کی کون خبر لے گا؟" میں نے جواب دیا۔ میڈم نے مسکرا کر اپنے شوہر کی جانب دیکھا۔ اُن کے جسم میں ایک فوری کپکپی کی لہر دوڑ گئی۔ میرے ہاتھ کو جلدی سے چھوڑ دیا اور پھر میرے منہ کے پاس اپنا منہ لا کر کہنے لگیں۔ "آپ بہت نیک دل آدمی ہیں۔ ہر چیز کا آپ کو خیال ہے"۔ اُن کی آواز میں طنز اور ترشی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ خفا ہو گئی ہیں۔ میں خاموش رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد واپسی کے لئے حامد نے موٹر پھیر دی واپس پہنچ کر حامد نے کہا۔ کہ اسے جلدی گھر جانا ہے۔ اور یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا میڈم نے گراموفون پر ایک ریکارڈ رکھتے ہوئے حامد کو شب بخیر کہا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور جانے کی اجازت چاہی۔ میڈم نے بغیر میری طرف دیکھے مجھ سے کہا۔ "آپ جو نئے ریکارڈ لائے ہیں وہ میں نے نہیں سنے ہیں۔ کیا آپ اس وقت لا سکتے ہیں؟"

جس دوست کے یہاں میں ٹھہرا ہوا تھا اُن کا مکان یہاں سے بمشکل سو گز پر تھا۔

میں نے جواب دیا۔ "اچھا میں ابھی لاتا ہوں"

حامد اس عرصہ میں جا چکا تھا۔ باہر برآمدہ میں اندھیرا تھا۔ نیاز میرے ساتھ آیا اور بجلی کی روشنی جلائی۔

میں سیڑھیوں سے اتر کر اپنے مکان کی طرف جانے لگا تھا کہ پیچھے سے میڈم کی آواز آئی۔ "ٹھہرئیے میں بھی آرہی ہوں"۔ وہ بھاگتی ہوئی میرے پاس آگئیں۔ مکان کے باز و میں روشنی نہیں پہنچی تھی۔ نیاز اب آڑ میں تھے۔ میں اور میڈم برابر والے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ اور اندھیرا تھا۔ یکایک میڈم کے ٹھوکر لگی اور وہ جلدی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سنبھل گئیں۔ "کیا تم اب بھی مجھے نہیں سنبھالو گے؟" انہوں نے بہت ناز سے کہا۔ اور ان کے ہاتھ میری کمر میں حمائل ہو گئے میرے جسم میں خون تیزی سے دوڑنے لگا اور میں نے بھی اپنے دونوں ہاتھ میڈم کی کمر میں ڈال دیئے۔ انہیں پیار کرنے کے لئے اپنی طرف کھینچا۔ میرا رخ سامنے کی دیوار کی طرف تھا جس میں سے ایک دروازہ دونوں مکانوں میں آمد و رفت تھی۔ بہت خفیف روشنی دروازے کی چوکھٹ پر پڑ رہی تھی۔ لیکن اس سایہ کو ظاہر کرنے کے لئے کافی تھی۔ جو اسوقت چوکھٹ پر پڑا۔

میں نے میڈم کو چھوڑ دیا اور وہ بھی مجھ سے الگ ہو گئیں۔ سامنے سے ایک شخص نکل آیا۔ میں نے مسعود کو پہچان لیا۔

"او ہو مسعود۔ کہاں جا رہے ہو؟ کیا میرے یہاں گئے تھے؟" یہ سوال بےمعنی اور فضول تھا۔ میں گھبرا سا گیا تھا۔ مسعود نے اب ہم دونوں کو پہچان لیا۔ "ہاں میں تمہارے یہاں سے آرہا ہوں۔ میڈم شب بخیر اچھا کل ملیں گے۔ خدا حافظ!"

اُس کی آواز میں ہنسی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت بلا رہی سے میرے کسی راز کو چھپا رہا ہے۔ وہ یہ کہہ کر چل دیا اور میڈم بھی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے اپنے مکان کو پلٹ گئیں۔

میں تنہا اپنے کمرے میں آیا اور ریکارڈ لے کر سوالیہ نگاہ ضرور رہے

کسی سوچ میں پڑی ہوئی تھیں۔ مگر دونوں میاں بیوی نے میرے ریکارڈ بہت غور سے سُنے وہ جب ختم ہو گئے تو نیاز نے مجھ سے کہا کہ میں کھانا بھی اُنہی کے ساتھ کھاؤں۔ اب اس تماشے میں مجھے کافی دلچسپی ہو گئی تھی اور میں اس کا انجام دیکھنے کا منتظر تھا۔ رُک گیا۔ کھانا کھایا اور پھر میں اور میڈم اُن کے شب خوابی کے کمرہ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ نیاز نے معافی چاہی اُسے کچھ کام کرنا تھا۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر وہ لکھنے لگا۔

اس شہر میں میرے بڑے بھائی کے ایک دوست احمد صاحب تھے۔ اُن سے اور میڈم سے کافی دوستانہ تھا۔ اُن کا برتاؤ مجھ سے بڑے بھائی کی طرح تھا۔ اور اب اُس میں دوستی کا بھی ایک انداز پیدا ہو گیا تھا۔

احمد کچھ اس قماش کے آدمی تھے کہ لڑکیوں کو اُن کے متعلق عجیب عجیب باتیں بیان کرنے میں مزا آیا کرتا تھا۔ وہ خاص قسم کی بہت اچھی اور بہت بری کہانیوں کے ہیرو تھے۔ دراصل وہ ایسے آدمی تھے انہیں عورتوں کی صحبت میں خاص لطف آتا تھا اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اگر انہیں پوری آزادی ہو اور وہ ہر طرح سے ایک عورت سے مذاق کریں اور اس پر لوگ کہیں "احمد بہت اچھا آدمی ہے۔ دل پاک صاف ہے۔ اس میں بدی نہیں ہے۔ صرف مذاق کی خاطر یہ سب کچھ کرتا ہے۔ ورنہ اصلیت کچھ نہیں ہے"۔ میڈم کے ساتھ بھی ان کا یہی برتاؤ تھا۔ مذاق کرتے۔ میڈم کو گود میں بٹھا لیتے۔ کبھی پکڑ کر گرا دیتے اور برابر ٹانگ پر ٹانگ ڈال کر لیٹ جاتے۔ میں یہ سب تماشے بیٹھا دیکھا کرتا۔

اب میڈم سے اُن کا ذکر نکل آیا۔

"احمد بہت اچھے آدمی ہیں" میڈم نے ہنس کر کہا۔

"مگر اُنہیں کوئی حق نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے اور خاص طور پر عورتوں سے ایسا مذاق کریں اور اُنہیں بے حس سمجھیں" میں نے جواب دیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ احمد ہر اس عورت پر جسے وہ جانتے ہیں اپنا ایک حق سمجھتے ہیں اور اُسے گڑیا کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ شاید اُن میں کسی طرح کا حس نہیں ہے۔ لیکن نہ معلوم کیوں وہ دوسروں کو بھی اپنا جیسا سمجھتے ہیں"۔ میڈم کی نگاہ نیچی تھی۔ چہرہ سرخ تھا اور جلد جلد یہ کہہ رہی تھیں۔ مجھے احمد پر غصہ آیا۔ میں نے بھی اپنے [illegible]۔

کیا آپ کے یہاں آج آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" میڈم نے جواب دیا۔

میڈم کرسی پر سے اُٹھ کر زمین پر بچھے ہوئے بستر پر لیٹ گئیں۔

"آپ بھی لیٹ کر باتیں کریں"۔ اُنہوں نے کہا۔ میں بھی اُن کے برابر لیٹ گیا۔

"میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آج احمد ضرور آپ کے یہاں آئیں گے" میں نے کہا۔ میڈم نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اور پھر کہا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے دو سال ہو گئے۔ لیکن احمد کبھی میرے یہاں اتنی رات گئے نہیں آئے"۔ "میرا دل کہتا ہے کہ وہ آج ضرور یہاں آئیں گے۔ تاکہ ہم دونوں کی لطفِ صحبت کو برباد کریں"۔ میں نے جواب دیا۔ میڈم نے چھت کا منہ چڑا دیا۔ ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ نیاز کے قلم کی چرچراہٹ برابر چلی آ رہی تھی۔ وہ ہم کو اپنی کرسی پر سے دیکھ سکتا تھا۔

"اگر میں بھی احمد کی طرح آپ سے مذاق کروں تو آپ میرا کیا کریں گی؟"

"میں سمجھوں گی کہ تم نے میری توہین کی ہے اور تمہیں مکان سے باہر نکال دوں گی۔ اور پھر کبھی تم سے نہیں ملوں گی"۔ میڈم مسکرا مسکرا کر کہہ رہی تھیں میری طرف دیکھ رہی تھیں اور یہ کہہ رہی تھیں۔

دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔

میڈم لوٹ مار کر اوندھی ہو گئیں۔ اور اپنی کہنیاں زمین پر ٹیک کر اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "نیاز ذرا دیکھو تو کون ہے۔ اگر کوئی تم سے ملنے آیا ہے تو برائے مہربانی گول کمرہ میں بٹھا کر اس سے باتیں کرنا" نیاز دروازے کی طرف گیا اور میڈم لوٹ کر پھر چھت تکنے لگیں۔

"میں شرط کرتا ہوں کہ آپ کے دوست احمد آئے ہیں" میں نے کہا میڈم خاموش رہیں۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر سے باتوں کی آواز آئی۔ اور آگے آگے احمد اور اُن کے پیچھے نیاز داخل ہوئے۔

احمد اس کمرے کے دروازے میں آ کر کھڑے ہوئے۔ اُن کی آواز سن کر میڈم بجلی کی طرح جھک کر بیٹھ گئی تھیں۔ لیکن اب ان کے دونوں ہاتھ سختی سے اپنے گھٹنوں کو پکڑے ہوئے تھے۔ سر نیچے کو جھکا ہوا تھا اور پیٹھ احمد کی طرف تھی۔

احمد نے مجھ کو دیکھا اور ٹھٹک گئے۔ ایک لمحہ کمرے میں سکوت

رہا۔ میں احمد کو دیکھتا رہا اور وہ مجھے دیکھتے رہے۔ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ لیکن میں اندر ہی اندر غصہ میں کانپ رہا تھا۔ اسوقت میں نے محسوس کیا کہ احمد سے مجھے رقابت ہے۔

اُنہوں نے اپنے کندھے ہلائے اور آگے بڑھ کر میڈم کے سامنے آئے۔ میڈم نے منہ اُس طرف سے موڑ لیا۔ چونکہ آپس میں اس قسم کا مذاق ہوتا تھا۔ اس لئے ظاہرداری میں کوئی فرق نہ آیا۔ احمد نے میڈم کا مذاق اُڑانا شروع کیا۔ کوشش کی کہ وہ کچھ بولیں۔ انہیں پکڑ کر اُن کا سر زبردستی اُٹھانا چاہا۔ میڈم نے جھٹکا دے کر اپنے کو چھڑا لیا۔ اب احمد میری طرف مڑے۔ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ اب بھی تھی۔ لیکن ماتھے پر گھنڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن اپنے کو روک لیا۔ میرے چہرے پر بھی اب ایک بامعنی مسکراہٹ تھی۔ نیاز کچھ نہ سمجھ سکا۔ وہ سب میں پیچھے کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ کونکہ اُس کا دھیان سب پر تھی۔

احمد میری طرف سے پلٹے اور نیاز سے مخاطب ہوئے۔ "ذرا مسعود کے یہاں جاکر کل کے کھیل کی ہار جیت کا نتیجہ تو لے آؤ۔" پالتو کتے کی طرح نیاز پلٹا اور مسعود کے گھر روانہ ہوگیا۔ مسعود یہاں سے بہت قریب رہتا تھا۔

اب پھر احمد میری طرف مخاطب ہوئے۔

"تاش کھیلو گے؟"

"نہیں"

"میرے ساتھ ٹہلنے چلو گے؟"

"جی نہیں۔ میں یا تو یہاں میڈم کے پاس بیٹھوں گا یا گھر جاکر سو جاؤنگا۔ اور کچھ نہ کروں گا"

احمد کو میری صاف گوئی پر حیرت ہوگئی اور وہ کھسیانے ہوگئے مجھ سے تو کچھ نہ کہہ سکے۔ لیکن بے چاری میڈم پر برس پڑے۔

"آپ کا مزاج آسمان پر ہے۔ آپ سے ملنے کے لئے کوئی آئے اور آپ منہ پھیلا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ آخر کوئی وجہ بھی ہو"۔

میڈم بالکل خاموش رہیں۔ احمد نے اب ہاتھ سے پکڑ کر انہیں دق کرنا چاہا اور کرتے رہے۔ لیکن میڈم کو نہ بولنا تھا نہ بولیں۔ خاموشی سے دونوں کی کشتی ہوتی رہی۔ ایک دفعہ جب میڈم کا منہ میری طرف ہوا تو میں نے ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ انہوں نے احمد کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور پھر بند کرلی۔

نیاز کا مسعود کے یہاں سے واپس آنا گویا احمد کی شکست کی نشانی تھی۔ انہوں نے میڈم کو چھوڑ دیا اور کھڑے ہوگئے۔ نیاز سے کاغذ لے لیا اور اپنی پتلون کی جیب میں لاپروائی سے ڈال لیا جیب سے سگرٹ کیس نکالا اور ایک سگرٹ "لیجئے" کہکر مجھے دیا اور پھر خود بھی ایک لے لیا۔ میرا سگرٹ جلاتے وقت اُنہوں نے میرے چہرے کا جائزہ لے لیا تھا۔ انہیں میرے جذبات معلوم ہوگئے تھے۔ مگر وہ اب چاہتے تھے کہ اپنے آپ کو اس معاملے سے اس طرح سے الگ کرلیں کہ مجھے یہ محسوس نہ ہو کہ احمد بھی اس میں کبھی میرے مدمقابل تھے۔ اُن کی "لیجئے" میں طنز تھا۔ گویا ادھیڑ عمر جوانی سے ایسے موقعے پر سمجھوتہ کر رہی ہے جہاں کہ وہ جوانی جیسی حرکت کرتی پکڑی گئی ہو۔ اور اب اپنے فعل کا مذاق اُڑا کر اس جگہ سے خاموشی سے غائب ہونا چاہتی ہے۔

نیاز سے اُنہوں نے مخاطب ہوکر نیم مذاحیہ اور نیم طنز یہ طور پر کہا۔ "آج میڈم کا پارہ بہت تیز ہے۔ اٹھو جانا ہی پڑا۔"

نیاز کے چہرے پر ایک کھسیانی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ یہ سُن کر احمد کے راستے سے مودبانہ ہٹ گیا۔ لیکن اس کی نگاہ میرے چہرے پر گڑی تھی۔ احمد اپنے چہرے پر ایک خشک سی مسکراہٹ لئے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔

چلتے چلتے پلٹے اور مجھ سے پوچھا۔ "چلتے ہو؟"

"چلئے" میں نے جواب دیا۔ اب وہ بزرگ تھے اور میرے بڑے بھائی کے ہمنشین۔ اُن کی شخصیت مجھ پر غالب آگئی اور میں اپنے فعل سے اظہار اصلیت کرنے سے قاصر رہا۔

ہم دونوں نے میڈم کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ دروازے میں سے احمد اور نیاز نکل گئے میں نکلا ہی چاہتا تھا کہ میں نے میڈم کے کپڑوں کی سرسراہٹ سُنی۔ چلتے سے پلٹ کر دیکھا۔ میڈم کی اور میری آنکھیں چار ہوئیں۔ کیا اُن میں جوش تھا؟ خوشی تھی؟ محبت تھی؟ حیرت تھی؟ کیا تھا؟ میں نہیں معلوم کرسکا۔ اتنا ضرور ہے

کہ ایک پر معمہ ہنسی اُن کے ہونٹوں پر لرز رہی تھی۔ کیا بہانا کروں ؟ کیسے بات کروں ؟ میں ضرور بلایا جا رہا ہوں کیوں نہ جاؤں ؟ احمد اور نیاز کو۔ ہاں احمد اور اس کے شوہر نیاز کو کیسے نکل جاؤں ؟ ان سے کیسے بچوں ؟

تیز تیز خیالات نے تیز فعل پر مجبور کیا۔ جلدی سے دروازے سے باہر نکل گیا اور اپنے طوفان خیز خیالات کو اس فعل سے ناممکن بنا دیا۔ نیاز نہیں باہر چھوڑ کر اندر واپس چلا آیا اور تھپکی دے لی۔ ہم دونوں اس خاموشی سے جدا ہو گئے۔

مکان سے نکلتے ہی احمد نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ جگہ وہی تھی جہاں میڈم نے چند گھنٹے قبل میری کمر میں ہاتھ ڈالے تھے۔ ان کا یہ فعل مجھے بتا رہا تھا کہ وہ میرے ناصح بننے پر تیار ہیں۔ اور اس آڑ میں وہ اُس وقت کی جانبین کی تلخی کو فراموش کرانا چاہتے ہیں۔ میں خاموش رہا۔ اپنے کمرے کے قریب پہنچکر میں نے انہیں شب بخیر کہا۔ اُن کے جواب میں اب طنز نہ تھا۔ نرمی تھی اور بربادی ؟ مجھے نصیحت تھی۔ میری ناتجربہ کاری پر گویا بزرگی رحم کھا رہی تھی!

مکان پر سب سوئے پڑے تھے۔ میرے دوست بہت کسب میں ہیں اُن کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ "واپس آ گئے کیوں ؟" انہوں نے میرا خیر مقدم کیا۔ کچھ اُلٹا سیدھا جواب دے کر میں نے کپڑے اُتارے اور پلنگ پر پڑ رہا۔ گھنٹوں میڈم کا خالی مجسمہ میرے سامنے اُنکے قول و فعل کو دکھاتا رہا۔ آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں۔ آخری ارادہ سونے سے قبل یہی تھا کہ صبح کو میڈم کے پاس جاؤں۔ اور معلوم کروں کہ اُن کی طرف سے اس میں کتنی اصلیت ہے ؛

صبح کو ٹہلنے گیا اور لوٹتے ہوئے میڈم کے مکان کی طرف سے واپس آیا۔ احمقانہ کوشش یہ تھی کہ بغیر مکان کی طرف دیکھے نکل جاؤں مکان کی طرف دیکھا۔ دیواریں کھڑی تھیں۔

گھر پہنچکر ایک بخار کی سی حالت میں غسل کیا۔ کپڑے احتیاط سے بدلے۔ کھانا کھایا اور اب بیتابی سے اس بات کا انتظار کرنے لگا۔ کہ میرے دوست اپنے کام سے باہر چلے جائیں۔ خدا خدا کرکے قریب دس بجے مطلع صاف ہوا۔ فوراً پشت کے دروازے سے میڈم کے مکان پر پہنچا نشست کے کمرے میں کوئی نہ تھا۔ آواز دی۔ ایک نوکر نکل کر آیا۔ بیتابی سے سینہ شق ہوا جاتا تھا۔ لیکن بظاہر بہت اطمینان سے نیاز کو پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہ مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہوتے ہیں۔ نوکر نے کہا کہ "میم صاحب ہیں" میں نے بہت روا روی کے لہجے میں کہا کہ "اچھا تو انہیں ہی اطلاع کر دو"۔

دس منٹ کے بیتاب کن انتظار کے بعد میڈم آئیں۔ شب خواب کے کپڑے پہنے ہوئے اور آنکھیں ایسی گویا ابھی سو رہی تھیں چہرے سے صابن پوڈر اور تولئے کی خوشبو آ رہی تھی۔ بال میں کنگھی بھی کئے ہوئے تھیں۔ ہاں کپڑے البتہ شب خوابی کے تھے۔ رات کے واقعہ کا تخیل غائب ہو گیا اور اب میڈم ہی میڈم میرے پیش نظر تھیں۔ آکر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ذرا مجھ سے آگے دونوں کے بیچ میں ایک چھوٹی میز تھی۔ میں اُن کا نیم رُخ دیکھ سکتا تھا۔ اور وہ بغیر مڑے مجھے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ میڈم بہت اطمینان سے گفتگو کر رہی تھیں۔ گویا میں اُن کے لئے اجنبی تھا اور صرف اُن کے شوہر کا دوست تھا۔ آخر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔

میڈم! کیا آپ ایک بات مجھے سچ سچ بتا دیں گی ؟

"پُوچھ کے دیکھئے"

کیا گذشتہ شب آپ کی خواہش نہیں تھی کہ صرف میں ہی آپ کے پاس رہوں اور احمد اور نیاز دونوں دفان ہو جائیں ؟ کیا آپ ایسا نہیں چاہتی تھیں ؟

"شاید کیا معلوم"۔

نہیں میڈم میں صاف جواب چاہتا ہوں۔ کیونکہ رات یہاں میں نے محسوس کیا کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی خواہش ہے۔ میں اب بھی یہی محسوس کرتا ہوں۔ اگر یہ سب کچھ میرا تخیل تھا تو میں آپ سے معافی مانگتا ہوں اور جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔

"(سرد مہری سے) "آپ جب چاہیں جا سکتے ہیں۔ (نرمی سے) لیکن اگر میں تم سے ایک بات کہنے کو کہوں تو کیا تم مجھے "سہل الحصول"

اور "ارزاں عورت" تو نہیں خیال کرو گے ؟"

میڈم کی گردن سرخ ہو گئی تھی - اور کان اور گال تمتما اٹھا تھا

معلوم نہیں آپ کیا پوچھیں گی ؟

اب منہ بالکل دوسری طرف کو پھیر لیا گیا - اگر میں تم سے کہوں

کہ مجھے پیار کرو تو کیا تم ایسا کرو گے ؟

میرے دل کو دھکا سا لگا - کیا یہ سب کچھ سچ ہے ؟ کیا اس

اظہار کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ میرے جذبات سے واقف ہو کر میڈم

مجھے بیوقوف بنا رہی ہیں !

ہاں اگر میرا بھی جی چاہتا ہوگا تو کروں گا اور ضرور کروں گا -

تمہارا جی چاہتا ہے ؟

"ہاں"

"تو کرو"

"کیوں ہم دونوں آدھے راستے پر نہ ملیں - اب جب کہ میری

اور تمہاری خواہشات ایک سی ہیں تو میں کیوں پیش دستی کروں ؟"

یہ سنکر میڈم میری طرف پلٹیں - مجھے دیکھ کر مسکرائیں اور کہنے لگیں

"تم اگر مجھے پیار کرو تو یہ بھی ممکن ہے کہ شاید میں تمہیں اس گھر سے

نکال دوں"

"میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں - میں پہلے ایک ایسی چوٹ

اٹھا چکا ہوں - اور اس کا زخم ابھی تازہ ہے "

"مگر عورت تو ایسا ہی قابو چاہتی ہے"

وہ پھر میری طرف مڑیں - ان کے چہرے پر افسوس کے آثار

تھے - گویا اب انہیں میری طرف سے یہ احساس ہو گیا کہ میں ان سے

کھیل رہا ہوں -

میں بدحواس سا ہو گیا اور کھڑا ہو کر جلدی سے میڈم کی کرسی کے

پیچھے پہنچ گیا - اپنے ہاتھ میڈم کی گردن میں ڈال دیئے اور جھکا چاہتا

تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے میرے دونوں ہاتھ الگ کر دیئے

اور اوپر میری طرف کو دیکھ کر کہنے لگیں :-

"افسوس ! آپ غلطی پر ہیں - شاید میرا منشا تم نہیں سمجھے "

"میڈم - میڈم" میں نے بدحواس ہو کر کہا اور اب میں ان کے

سامنے تھا اور ان کے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا " میں نے کیا کیا"

میڈم کی آنکھوں میں استقلال اور حسرت تھی " نہیں ہرگز

نہیں - تم بزدل ہو - کبھی عورت کو نہیں سمجھ سکتے - اب سب فضول ہے "

مایوسی ایک ٹھنڈی لکیر بن کر میرے جذبات میں دوڑ گئی - اور میں

خاموشی سے اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا - میڈم کی طرف سے منہ موڑ کر نیچے

کر لیا -

میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہیں -

" تمہیں مجھ سے نفرت تو نہیں ہو گئی ہے - میں جاؤں ؟ اور

تمہیں اپنی موجودگی سے دق نہ کروں "

میڈم نے نرمی سے کہا " نہیں مجھے تم سے نفرت بالکل نہیں ہے

اور میں تم سے جانے کو نہیں کہہ سکتی "

کچھ دیر کے سکوت کے بعد میں نے پھر میڈم کے پاس جا کر کوشش کی

کہ انہیں اپنی محبت کا یقین دلاؤں - اور باوجود اس کے کہ میں نے

محسوس کیا کہ وہ ایسا اب بھی چاہتی ہیں - ان کے ہاتھوں نے مجھے ایسا

کرنے سے ناکامیاب رکھا -

میں اپنی بے سود کوشش سے تھک کر پشیمان سا الگ کھڑا

تھا - کہ پیروں کی چاپ سنائی دی اور نیاز دوسرے کمرے میں نمودار

ہوا - میڈم ایسی تڑپ کر کھڑی ہوئیں گویا انہیں کسی نے برقا دیا ہے

چہرہ سرخ - بے تحاشا بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے

میں اپنے شوہر کے پاس پہنچیں اور دونوں ہاتھ اس کے

گلے میں ڈال دیئے - " میرے پیارے - میرے پیارے "

انہوں نے کئی دفعہ کہا اور ہر دفعہ انہوں نے نیاز کی پیشانی اور

گالوں کو چوما -

میں اب اس سے زیادہ کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا -

سناٹے میں اپنی ٹوپی اٹھائی اور لپٹے ہوئے میاں بیوی کی طرف

دیکھے بغیر کمرے سے باہر چل دیا :

(بصیر)

فلسفی عاشق

(اثر حضرت شاہ - ریاض (علیگ)

ہمارے ساتھیوں میں ایک صاحب تھے فلسفی۔ بدقسمتی سے انکو ایک صاحبہ سے عشق ہو گیا۔ فلسفہ، عشق یکجا ہو گئے۔ پھر کیا تھا۔ فلسفۂ عشق پر اکثر وہ اپنے مقالات یار دوستوں کو سنانے لگے۔

ایکدن کا ذکر ہے۔ شام کا وقت تھا۔ کالج میں کھیل بند تھے۔ کیونکہ کسی کورٹ کے ممبر کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہم سب اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ اتنے میں ایک صاحب آئے اور کہنے لگے "آج حضرتِ عاشق کا جنون تیزی پر ہے۔ چلو ان سے لطف اٹھائیں"۔ ہم لوگ ان کے ساتھ ہو لئے۔

پکّی بارک کے ایک کمرہ کے سامنے مونڈھے پڑے ہوئے تھے۔ ایک صاحب منھنی قد کے منہ میں حقہ لگائے ایک مونڈھے پر تشریف فرما تھے اور ان کے گرد دو چار صاحبان سلیقہ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت بار بار حقہ کا کش لیتے تھے۔ اور بلند آواز سے کچھ فرماتے جاتے تھے۔ ہم لوگ بھی مونڈھے لے لے کر ان کے گرد بیٹھ گئے۔

یکایک وہ ہماری طرف پھرے اور بولے "حضرات آپ لوگ مسکرا رہے ہیں۔ خیر مسکرائیے۔ آپ کو کیا خبر کہ کسی کے دل پر کیا گذر رہی ہے

ہم لوگ ایک آواز ہو کر بولے "نہیں نہیں آپ مطمئن رہئے ہم سب آپ پر بھلا ہنس سکتے ہیں؟ ایک اور بات تھی"۔ (خیریت ہوئی انہوں نے وہ بات نہ پوچھی ورنہ آپس میں اختلاف ہو جاتا) حضرت کو شاعری میں بھی دخل تھا۔ خود بھی شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے اور دوسروں کے شعر بھی یاد تھے۔ کہنے لگے:۔ واقعی کسی فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

بہ باغ رفتم و گل چیدم و فغاں کردم	زیارت دل مجروح بلبلاں کردم
بہ من بگفت یکے بلبلے کہن سالے	ہزار سال دریں باغ آشیاں کردم
وفائے عہد جو مدت زگلرخاں مطلب	من ایں معاملہ را کردم و زیاں کردم

اب ہم لوگوں کو یقین ہو گیا کہ واقعی آج دورہ پڑا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ سوچنے لگا۔ کہ کس طرح ان کو ابھارنا چاہئے۔ شاعری کا سلسلہ اچھا نکل آیا تھا۔ ایک صاحب بولے "واقعی عشق بھی کیا چیز ہے۔ اس نے کتنے گھر تباہ کئے۔ یہ ایک عذابِ الٰہی ہے۔ استاد میر نے کیا خوب کہا ہے

"سخت کافر تھا جس نے پہلے پہل ؛ مذہبِ عشق اختیار کیا"

حضرت یکایک کھڑے ہو گئے۔ بگڑ کر بولے "آپ نے یہ کیا کہا کہ عشق گھروں کو تباہ کرتا ہے؟ اور یہ عذاب ہے! آپ کو اس کی لذت ملی ہو تو آپ جانیں۔ یہی زندگی ہے۔ اسی میں زندگی کا لطف ہے۔ بے عشق کی زندگی کوئی زندگی ہے؟ افسوس ظالم تو نے چکھی ہی نہیں۔ استاد امیر نے بھی کس مزے میں کہا ہے۔ ؎

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب ؛ مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

ہجر ہی اصل وصل ہے۔ تڑپ ہی سکون ہے۔ تکلیف آرام ہے اور مصائب ہی مسرت۔ افسوس ہے آپ لوگوں پر جنہیں کسی سے عشق نہیں۔ تمہارے دل نہیں پتھر ہیں۔ تم ذی حس نہیں۔ بے حس ہو۔ ایک میں ہوں کہ میرا کلیجہ پھُن رہا ہے۔ اور مجھے اس میں لطف آرہا ہے۔ اے غمِ جدائی تو اور بڑھ۔ اے سکون کچھ اور دور بھاگ۔ مجھے تو صرف اپنے دوست کی خوشی منظور رہے۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ عُراقی کا شعر بھی کسقدر صحیح تعریف پیش کرتا ہے۔ ؎

بہ عالم ہر کجا درد و غمے بود ؛ بہم کردند و عشقش نام کردند

افسوس میں تم کو حسن و عشق کے معاملات سمجھا نہیں سکتا۔ کیونکہ عشق و تصوف کا ایک معاملہ ہے۔ صوفی تصوف کے مسائل کو اگر سمجھانے کی کوشش کرے تو وہ صوفی نہیں۔ اسیطرح عاشق اگر یہ دعویٰ کرے کہ عشق کی

گہرائیوں کو سمجھا سکتا ہے تو وہ عاشق نہیں۔ ع

آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اب انکا جوش خوب بڑھ چکا تھا۔ حقہ الگ پڑا تھا اور یہ حضرت کھڑے بپھر رہے تھے اتنے میں یونیورسٹی کے قدیم پوٹمین خالق داد خاں تشریف لائے اور حضرت فلسفی کی طرف ایک خط بڑھایا۔ خط کو دیکھتے ہی حضرت کے چہرہ کا رنگ فق ہوگیا۔ جب خان صاحب چلے گئے تو فرمانے لگے۔ دیکھتے ہو میرے محبوب کی شوخی۔ میں نے اسے خط لکھا تھا اور اس نے خط واپس کر دیا۔ وصول بھی نہ کیا۔ خیر اب مجھے اس میں لطف آتا ہے اگر وصول کر کے جواب نہ لکھتا تو زیادہ برا تھا (حضرت کی ایک خوبی تھی کہ ہر بات کی تاویل کر لیا کرتے تھے)

ہم لوگوں کو شوق ہوا کہ کسی طرح اس خط کو دیکھنا چاہئے۔ اشاروں میں آپس میں گفتگو ہوگئی۔ تجویز مقرر کی گئی۔ ایک صاحب ہم لوگوں کو اشارہ سے منع کرتے ہوئے حضرت سے مخاطب ہوئے

جناب آپ کی تقریر و تحریر میں اتنا زور ہوتا ہے کہ اگر کوئی ایک مرتبہ بھی دیکھ یا سن لے تو پھر وہ آپ کا قائل ہو جاتا ہے۔ آپ کا دوست بھی بڑا ہشیار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو خبر لگ گئی تھی۔ اسی لئے اس نے خط واپس کر دیا۔"

محترم کے چہرہ پر ہنسی آگئی۔ بولے۔ اچھا آپ لوگوں سے کیا پردہ آپ ہمارے پرانے دوست ہیں۔ لیجئے میں سنائے دیتا ہوں۔ میں کیا اور میری تحریر کیا۔ لیکن شائد آپ اسے پسند کریں۔

انہوں نے خط کھول کر ہم لوگوں کو سنانا شروع کیا۔ خط تھا بہت طویل۔ اسمیں سے جستہ جستہ میں پیش کرتا ہوں۔ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ القاب دلچسپ تھا اور طویل۔ اسوقت مجھے یاد نہیں۔ القاب میں کئی کئی مصرعے تھے۔ مجھے ایک یاد رہ گیا ہے۔ ع

"جانِ من۔ جانانِ من۔ غنچہ دہن۔ بالکل چمن"

بیوفائی کا گلہ۔ ہجر کی مصیبت۔ وعدہ خلافی کی شکایت۔ جذبات محبت کا بحر بے پایاں۔ محبوب کی تعریف۔ رقیبوں سے خدشہ غرض سب کچھ درج تھا۔ ایک جگہ پھر انہوں نے اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

بہت سے دلائل پیش کئے تھے۔ انکی منطق دانی یا معشوق فریبی ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:۔

مقدمہ اول	مقدمہ دوم	
تم نازک اندام۔	میں لاغر و ناتواں گویا بید مجنوں۔	اس لئے تم اور میں ایک
تمہاری آنکھیں ڈوروں سے سرخ۔	میری کثرت گریہ سے۔	" " "
تمہارے رخ زیبا پر پاؤڈر۔	میرے چہرہ پر گرد	" " "
تم کو بھی مستی۔ مجھے بھی مستی۔	تمہیں بادۂ حسن کی مجھے عشق کی	" " "
تم بھی بیوفا۔ میں بھی بیوفا۔	تمہیں مجھ سے بیوفائی مجھے چارہ گر سے	" " "
تم بھی آہستہ خرام۔ میں بھی آہستہ خرام۔	تم نازکی سے میں ضعف سے	" "

اس قسم کی دلائل کا ایک سلسلہ تھا۔ بہت کچھ فراموش ہوگئیں ہم ابھی اور لطف اٹھاتے اور ہر چیز کی تشریح کراتے۔ مگر مغرب کی اذان ہوگئی۔ اور ہم جرمانہ کے ڈر سے مسجد پہنچ گئے حضرت کو پرانے ساتھیوں نے پہچان لیا ہوگا۔ نام ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ ایک اچھے عہدہ پر براج رہے ہیں۔ اگر کہیں کسی معاملہ میں پھانس لیا تو قیامت ہوگی۔

....

....

شاہ ریاض

افسانہ

سحر جمال

(از حضرت عزیز احمد صاحب خلش صدیقی بی اے لکھنؤ)

جمال حسین تھا اور خود بھی اپنے حسن سے بے خبر نہ تھا۔ اپنے حسن سے واقعی بے خبر ہوتا ہی کون ہے!! ـــــ نہ کہ پھر جمال جس نے اپنی نگاہ جادو اثر کے کرشمے اپنی آنکھ سے دیکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں ایک قسم کی کشش موجود ہے۔ جس کے سامنے ہر قوت سرنگوں ہو سکتی ہے۔ نہ کہ پھر عورت جیسی نازک چیز!! عورت تو اس کی پرستار تھی۔ وہ جدھر نکل جاتا نگاہیں اسمیں جذب ہو کر رہ جاتیں۔ میں سچ کہتی ہوں میں نے اپنی آنکھ سے حسین ترین لڑکیوں کو اس کے سامنے نقش حیرت اور محویت کا بت بنا ہوا دیکھا ہے۔

ممکن ہے میں نے اس کے حسن کے بیان میں مبالغہ سے کام لیا ہو کیونکہ میں خود ایک "عورت" ہوں ـــــ اور ایک ایسی عورت جو اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اس کے کمال حسن کا یہی کیا کم ثبوت ہے کہ دماغ اسکی تنقید سے عاری ہے۔ نظر اس کو دیکھ کر مست ہو جاتی۔ دل اک نغمۂ خاموش میں ڈوب جاتا۔ روح وجد میں آجاتی۔ اور دماغ حیرت آئینہ بنکر رہ جاتا میں آپ کو اس کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ پھر چاہیں آپ مجھے بد مذاق ہی کیوں نہ کہیں ـــــ

اس کا رنگ صندلی تھا۔ چہرہ بیضاوی۔ اور اس کے لبوں کی تراش اور تازگی ترغیب مجسم! ان اودے ہونٹوں میں ہر وقت ایک چمکدار نمی سی رہتی تھی۔ ان پر اکثر اپنی زبان پھیر لیا کرتا تھا۔ گویا اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ خشک نہ ہو جائیں ـــ یہ اس کی اک ادا تھی! ان جادو بھری نازک پنکھڑیوں پر اس کی اونچی ستواں ناک میں بیان نہیں کر سکتی کسقدر بھلی معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس کے داہنے بائیں دو آبدار۔ رس بھری خوبصورت سیاہ آنکھیں قیامت تھیں۔ جس طرح بعض آنکھوں میں ہر وقت ایک خمار سا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں محبت پرفشاں رہتی تھی۔ وہ ہر وقت رازدارانہ انداز میں کچھ کہتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھیں ـــــ مجھے ان سے کسقدر شرم معلوم ہوتی تھی!! اس کی پلکیں لانبی تھیں جنکی جڑیں "نین رس" میں بھیگی رہتی تھیں۔ اس کی ابرو سیاہ اور گھنی تھیں۔ اس کے بال بھی نرے سیاہ تھے۔ اور بے انتہا گھونگھر والے ـــ جیسے "عشق پیچاں" کے لچھے! اوسط درجہ کا اس کا جسم تھا اور اوسط سے ذرا زیادہ اس کا قد ـــ غرض وہ حسین تھا اور ایک حسین مرد! عورت اسے اپنی آنکھوں میں اپنے دل میں جگہ دینے کے لئے مجبور تھی۔ حسن کے معاملہ میں صرف مرد ہی لطیف الحس نہیں ہوتے!

جمال کا دل بھی حسین تھا۔ وہ حسن پرست تھا اور غضب کا حسن پرست! میں نے اپنی آنکھ سے اس کی کیفیت دیکھی ہے۔ جب حسن اس کے سامنے ہوتا۔ تو وہ ایک زخم خوردہ ہرن کی طرح بے بسی کے ساتھ ہر ایک کو دیکھتا۔ اور اس لمحے کے لئے یہ بالکل بھول جاتا۔ کہ وہ خود بھی قاتل ہے اسے قطعی خبر نہ ہوتی کہ اس کی محبت بھری حزن بار آنکھیں اسوقت خود کیوپڈ بن کر میٹھے زہر میں بجھے ہوئے تیر برساتی ہوتی ہیں۔ لیکن جسوقت اسے اپنے بسمل کی تڑپ کا۔ اپنے تیر کی کامیابی کا احساس ہوتا تو وہ گھبرا جاتا اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کرے ـــــ آخر احساس فتح غرور حسن بنکر اس پر غالب آتا اور وہ ایک تمکنت ریز جمود و سکون کے ساتھ اپنی مغرور نگاہیں فرش زمین یا طبق آسمان پر جما کر بیٹھ جاتا۔ اسے یقین ہو جاتا کہ "اب یہ زخمی میرا ہو گیا" اس کے بعد اسے ہوش اس وقت آتا جب "بسمل" کو حسرت نظارہ اور التجائے بازدید کی کچی کلیاں پہلو میں دبائے

ہوئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جانا پڑتا ـــــ اس طرح نہ معلوم
کتنے افسانے نامکمل اور نہ معلوم کتنی زندگیاں ادھوری رہ گئی ہونگی۔
میں نے اسے پہلی مرتبہ اپنے اسکول کے ڈرامے میں دیکھا تھا۔
ڈرامے میں ٹکٹ نہ تھا نہ عام طور پر مردوں کو اجازت تھی۔ صرف
چند مخصوص اشخاص کو دعوتی کارڈ بھیجدیئے گئے تھے۔ اور تمام زنانہ
اسکولوں کی لڑکیاں عام طور پر مدعو تھیں۔ آنے والے مردوں میں سے
ایک جمال بھی تھا۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ آیا جمال ان خاص لوگوں
میں سے تھا جو مدعو کئے گئے تھے۔ یا اپنی کسی ترکیب و کوشش سے وہاں تک
پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ اسکول نسواں کی تقریبیں تو حسن پرستوں کے لئے فردوس کا
حکم رکھتی ہیں!

میں اپنی ہم جماعت شکیلہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور میرے سامنے
دو قطاریں چھوڑ کر مدعو حضرات اور استانیوں کی صف تھی۔ جمال بالکل
میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے اس کو میں صرف اسوقت دیکھ پاتی تھی
جب وہ کسی طرف مڑتا تھا۔ ہال عورتوں اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔
اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس فضائے جمیل میں جو نغمۂ حسن سے
مرتعش تھی۔ جمال کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی اور خود جمال خاموش و
مضطرب آنکھوں والا جمال دوسروں پر کیسی سحر باری کر رہا تھا۔ میں
اس حقیقت پر بھی پردہ نہ پڑا رہنے دونگی۔ کہ خود مجھے بھی ایسا محسوس ہو رہا
تھا کہ جیسے کوئی اندر سے میرے دل کو مسل رہا ہو۔ لیکن میں دوسری لڑکیوں کی
طرح اس کے مظاہرۂ عام کے لئے تیار نہ تھی ـــ حال ظاہر ہو تو
اسی پر ہو جس کا یہ حال بنایا ہوا ہو۔ دوسرے پر کیوں ظاہر ہو؟ کیا کسی سے
اپنے درد کی داد لینا ہے؟ اور پھر اس درد کی جو ایک ایسی ہستی کے لئے ہو
جو گل رہگذر کی طرح ایک لمحے کے واسطے بصارت نواز ہو کر ایک لامحدود
عرصہ کے لئے غائب ہو جانے والا ہو!! لیکن سچ پوچھئے تو میرے دل میں
اسی وقت یہ تمنا بھی پوشیدہ تھی کہ کاش مجھ سے کوئی میری عقل چھین لے۔
کاش کوئی میرے پندار کو چکنا چور کر دے۔ عورت بھی مرد کے حسن سے اسقدر
متاثر ہوتی ہے جسقدر عورت کے حسن سے مرد بلکہ اس سے زیادہ لیکن اس کی
خداداد قوت ضبط اس میں اک شان بے نیازی اور اک کیفیت رمیدگی
پیدا کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بیک وقت "ظالم" بھی ہو جاتی ہے۔

اور مظلوم بھی ـــ مظلوم اس لئے کہ اس طرز عمل سے قدرت کا اصول تحفظ
تو ضرور پورا ہو جاتا ہے لیکن بعض وقت یہی وقتی بے نیازی اور رمیدگی اسے
عمر بھر رلاتی ہے۔ حالانکہ جس طرح رم آہو کا اشارہ یہ ہوتا ہے کہ "تم میرا
تعقب کرو" اسی طرح عورت کے گریز کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا تعقب
کیا جائے اور اسے فتح کیا جائے۔
میں نے شکیلہ کو کہنی سے مخاطب کرتے ہوئے اس لڑکی کی طرف
دیکھنے کو کہا جس کی بیتابیاں اور پرشوق نگاہیں حیا سوزی کی حد تک پہونچی
جا رہی تھیں۔ شکیلہ نے مسکرانے میں میرا ساتھ تو دیا مگر اس کی مسکراہٹ
جو آنکھوں سے غائب ہو۔ صرف لبوں پر ہو۔ سطحی ہوتی ہے۔ مگر پر اسرار اور
پرمعنی۔ وہ مبہوت بیٹھی ہوئی تھی۔ انتہائی سنجیدہ۔ کچھ ناراض سی! ـــ
مجھ سے نہیں۔ اور نہ کسی اور سے بلکہ خود سے یا پھر زمانے بھر سے! میں سمجھ گئی
کہ اس کا زخم سب سے زیادہ گہرا ہے۔ میں چپ ہو گئی۔ اسے زیادہ چھیڑنا
مناسب نہ سمجھا۔ لیکن سب سے زیادہ تعجب مجھے اس بات پر ہے کہ اسوقت
میرے دل میں رقابت کا جذبہ کیوں نہ پیدا ہوا۔ کیا میرا جذبہ کمزور تھا؟
شکیلہ کی ساری پر سبز۔ نیلے اور سنہری رنگ کی آمیزش سے
طاؤسی پھول بنے ہوئے تھے۔ ساری شکیلہ کے جسم کے گرد نہ تھی بلکہ خوبصورت
آنکھوں کا ایک جال تھا جس میں ایک حور لپٹی ہوئی تھی۔ بالکل اسی لائن
میں جمال کے قریب ایک اور لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے شکیلہ کو ایک پھر
مخاطب کر کے پوچھا۔
"کیا یہ نوشابہ ہیں؟"
شکیلہ چونکی اور اثبات میں سر ہلا کر پھر خاموش ہو گئی۔ میں نے
پھر کہا۔
"نوشابہ بہن تو اس ساری میں غضب کی حسین معلوم ہوتی ہیں!"
شکیلہ نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں اور پھر جھکا لیں۔ اس کی
نگاہوں میں حسرت تھی۔ کرب تھا۔ نوشابہ کے حسن کی تعریف سے اسے
تکلیف ہوتی یا یوں کہئے کہ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ ہر عورت کی طرح اس کے
دل میں اس وقت ایک راز دارانہ خواہش اس بات کی تھی کہ کاش
دنیا میں سب سے زیادہ حسین وہ خود ہی ہوتا کہ جمال اس کے سوا کسی
اور کا نہ ہو سکے؟

نوشابہ شکیلہ کی بڑی بہن تھی۔ وہ یوں بھی بے حد حسین تھی مگر اس وقت تو وہ حسینانِ عالم کی تاجدار معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا ناک نقشہ شکیلہ سے بہت مشابہ تھا۔ اتنا مشابہ کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ آگے چلکر ان دونوں میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ میں نے اس سے پہلے اسپر غور نہیں کیا تھا۔ مگر آج دونوں کو ایک لباس میں دیکھ کر میں بھی کہہ اٹھی کہ "دونوں کی صورتوں میں محض سن کا فرق ہے اور "وقت" ان دونوں کی شبیہوں کو ایک کرکے اپنی چابکدستی کا مظاہرہ کرنے کی فکر میں ہے۔"

جب مہمان جانے کے لئے کھڑے ہوئے تو جمال نے ایک آخری نگاہ ڈالی ـــ گویا اس کی مخمور آنکھیں ایک حریص شرابی کی طرح ایک ہی گردش میں ساری شراب پی جانا چاہتی تھیں۔ اس دوران میں اس نے اپنے زخمی کو بھی دیکھا ـــ شکیلہ کو۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ اس کی صورت نے سب کچھ کہدیا۔ لیکن اس میں غالباً جمال کے لئے کوئی ندرت نہ تھی۔ اس زبان کا ماہر ہونے کی حیثیت سے وہ سمجھ تو ضرور گیا ہوگا لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اسے کوئی اہمیت دی یا نہیں۔ اس کی آنکھوں سے اس کے دل کی محرومی کا پتہ ضرور چلتا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر اک شان بے نیازی اور اک عجیب تمکنت تھی جیسے وہ سمجھتا ہو کہ تمام ہستیوں کی مسرت اس کی ایک ہاں پر منحصر تھی۔ یہ احساس بھی انسان میں کس قدر غرور اور ناز پیدا کر دیتا ہے!! لطف یہ تھا کہ وہ بھی مجسم تمنا تھا لیکن ایسی تمنا جو اپنی تکمیل سے بے نیاز ہو۔ اور یہی ستم تھا۔

عورت ـــ ہندوستانی عورت مجبورِ محض ہے۔ اسے اگر کسی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اسے اگر کوئی دیوانہ بنا جاتا ہے تو اس کے لئے سوا اس کے کوئی چارہ نہیں کہ گھل گھل کر اپنی جان دیدے۔ وہ پوری طرح مرد کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ مرد ہی اس پر ترس کھائے تو اس کی تمنا تکمیل تک پہونچ سکتی ہے وہ اتنا بھی معلوم نہیں کر سکتی کہ اس کا قاتل کون ہے۔ مرد آزاد ہے۔ وہ اپنی تمنا کی جستجو میں نکل سکتا ہے۔ وہ اپنے قاتل کا نام و پتہ معلوم کر سکتا ہے اور اپنے مقصد تک پہونچنے کے لئے کم از کم اک جان توڑ کوشش ضرور کر سکتا ہے۔ نہ اس پر مذہب الزام لگاتا ہے نہ اسے سوسائٹی مجرم قرار دیتی ہے۔ برخلاف اس کے عورت بے بس نامراد عورت۔ اس بے زبان گڑیا کی طرح ہے۔ جو دوکان پر کسی گاہک کی نگہِ انتخاب کا نشانہ بننے کے لئے رکھی ہو۔ خواہ کوئی گاہک اسے پسند ہو یا نہ ہو۔ وہ اپنے گاہک نہیں چن سکتی بلکہ گاہک اس کو انتخاب کرتے ہیں۔ گویا اس میں نطق ہے نہ ادراک۔

جمال نے شکیلہ کو مجروح کر دیا تھا اس میں شکیلہ کی کیا خطا تھی۔ کوئی اپنی خوشی سے تو مجروح نہیں ہوتا۔ اب اگر جمال عمر بھر نظر نہ آتا تو وہ بیچاری کیا کر سکتی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا اور شکیلہ کی خوش قسمتی کہ جمال نے اسکول آنا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی مجروح ہوا تھا۔

میری اور شکیلہ کی محبت قابلِ رشک تھی۔ دیکھنے والے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی بہن سمجھتے تھے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے پر پورا اعتماد تھا شکیلہ نے مجھے اپنا راز دار بنا لیا۔ میں بھی سچے دل سے اس کی غمگسار بن گئی جمال مجھ پر اثر انداز ضرور ہوا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میرے دل میں تمنا کا راج ہو شکیلہ نے درمیان آکر مجھے گرفتار ہوتے ہوتے بچا لیا۔ مجھے اس پر نہ حسد ہوتا تھا نہ رشک آتا تھا۔ بلکہ اس کی غمگساری میں ایک خاص لذت حاصل ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا تھا۔ کیونکہ میرے گھر والے ایسے تھے کہ میری تمنا کی قطعی پروا نہ کرتے میں ہندوستان کی ایک کمبخت اور بے بس لڑکی تھی۔ والدین نے قریب قریب میری شادی کا انتظام کر لیا تھا۔ "میری" قسمت کا فیصلہ میرے "خیر خواہوں" نے "اپنی" پسند اور اپنے اصول کے مطابق کر دیا تھا۔ دنیا کا ہر قانون بدل سکتا تھا۔ لیکن یہ فیصلہ بدل نہ سکتا تھا۔ مجھ پر ایک ہستی سے محبت کرنے کا فرض عائد تھا جسے میں نے کبھی اپنے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ بہر حال میں اس قربانگاہ پر چڑھنے کے لئے تیار تھی۔ میرے لئے اور چارہ بھی کیا تھا۔ مجھے اتنا موقعہ ہی کب دیا گیا کہ اپنی پسند سے کام لوں۔ اگر دل کو سمجھانے کے لئے شکیلہ کا بہانہ ہاتھ نہ آتا تو جمال کے خیال کو ترک کرنا محال ہو جاتا جس کا انجام ظاہر تھا۔ غرضکہ جذبات کی تشفی شکیلہ کی ہمدردی اور غمگساری کے سوا کسی اور صورت سے نہ ہو سکتی تھی۔

میں اپنے جذبات کو بھول گئی۔ میں نے اپنے احساسات کو شکیلہ کے احساسات میں فنا کر دیا۔ میں اپنی ہستی کو شکیلہ کی ہستی میں سمو دینا چاہتی تھی۔ تاکہ میری روح میرے قالب سے بے نیاز ہو کر شکیلہ کی روح کی ہم آہنگی میں اپنی پرستش خاموش کو جاری رکھ سکے۔ مگر مجھے افسوس تھا کہ میری رازداری سے

میری ہمدردی سے اس غریب کو کوئی خاص فائدہ نہ پہونچ سکا۔ کیونکہ میں ان معاملات میں ہمیشہ سے کم ہمت تھی۔ میں اسے ہمت کیا دلاتی میں تو اور اس کی ہمت کو توڑ دیا کرتی تھی۔ اسے قدم قدم پر روکتی تھی۔ اسے ضبط سکھاتی تھی۔

شکیلہ سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جمال اکثر اس کے مکان کی طرف سے گذرتا تھا اور بالارادہ گذرتا تھا۔ اس کی متجسس نگاہیں شکیلہ کے بالاخانے پر پڑتی تھیں اور ناکام لوٹنا نہ چاہتی تھیں۔ شکیلہ بھی اکثر ہمت کرکے کوئی بہانہ نکال کر سامنے آجایا کرتی تھی "تاکہ ان کی زحمت جستجو ان کیلئے تکلیف دہ ثابت نہ ہو" جمال شکیلہ کو دیکھتا تھا۔ اس کی نظر جھک جاتی تھی۔ وہ جھکی ہی رہتی تھی اور اگر دیکھتا تھا تو دیکھتا ہی رہتا تھا اسکول تو جمال آیا ہی کرتا تھا۔ لیکن وہاں بہت کم ایسا ہوا کہ اس کی اور شکیلہ کی نظریں ملی ہوں۔ شکیلہ ضرور اس کو دیکھ لیا کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ جمال بھی اس کو دیکھے۔ جمال کی نظروں میں جستجو ضرور ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ ہر دھوکے پر بھی وہ ایک لحظہ رکجا یا کرتا تھا۔ لیکن زیادہ تر وہ گذرتا ہی چلا جاتا تھا۔ اس میں یہ قابل تعریف بات تھی کہ حسن پرست ہونے کے باوجود اپنی عزت کا اسے بڑا پاس تھا۔ حسن پرست عموماً اسقدر محتاط نہیں ہوتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ خود حسین تھا۔

میں شکیلہ کو اس کی زیادہ ہمت افزائی نہ کرنے دیتی تھی۔ ——

کاش مجھے اسی وقت معلوم ہوجاتا کہ یہ میری غلطی تھی۔ شکیلہ کو میری مزاحمت سے تکلیف تو بہت ہوتی تھی مگر میرے خیال سے ضبط کئے بیٹھی رہتی تھی شاید دوسری لڑکی ایسا نہ کرسکتی۔ کبھی وہ کہتی کہ "وہ تو دوڑ کر میرے لئے یہاں آئیں اور میں انکی طرف مخاطب بھی نہ ہوں" —— یہ محض ایک فریاد ہوتی تھی اور جائز فریاد۔ لیکن نہ معلوم کون سی چیز مجھے اس فریاد کو بھی نظر انداز کر دینے پر قادر کردیتی تھی۔ حالانکہ یہ میں سمجھتی تھی کہ محبت کے ساتھ اس کی ہمت بھی بڑھ رہی ہے۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی اسکا باغی چہرہ میرے تصور پر چھا جاتا تھا۔

جمال عموماً چھٹی کے وقت آیا کرتا تھا۔ اس لئے میں دیکھتی تھی کہ آخری گھنٹے میں شکیلہ کا دل کتاب سے اچاٹ ہوجایا کرتا تھا اور اس کی نظر بیچینی کے ساتھ محو جستجو اور صرف انتظار ہو جاتی تھی۔ خوش قسمتی سے درجہ پھاٹک کے سامنے تھا۔ میں ایسے وقت اپنا رخ دوسری طرف کرلیتی تھی۔ تاکہ اسے کسی قسم کی مزاحمت محسوس نہ ہو —— جس گرفتار محبت کو محبوب نوازی کی اجازت نہ ہو کیا اسے اس قسم کی جذبات نوازی سے بھی محروم رکھنا ظلم نہیں ہے؟

جب جمال آجاتا تو وہ میری طرف دیکھتی اور اس کی نگاہ کا انداز مجھے بتا دیتا کہ جمال آگیا۔ میں اسے لے کر چمن میں نکل جاتی اور جھاڑیوں میں پھولوں کے پاس بیٹھ کر اسے میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول کرنے کی کوشش کرتی۔ چھوٹے درجوں کے بچے جن کا گھنٹہ خالی ہوتا پھولوں کی طرح چاروں طرف چھٹکے ہوتے۔ شکیلہ پھاٹک کی طرف اپنا رخ کئے ہوئے گم سم سی بیٹھی رہتی یا کبھی میری باتوں پر "ہوں" "ہاں" کر دیتی۔ اس کا دل کہیں اور ہوتا۔ اس کی نگاہ نچلی نہ بیٹھتی۔ جب جمال کو وہ دیکھ لیتی تو اسکا چہرہ تمتما اٹھتا لیکن جوں جوں وہ نظروں سے اوجھل ہوتا جاتا اس کے چہرے سے رونق زائل ہوتی جاتی —— جس طرح ایک شفاف آئینے کے سامنے سے ایک سرخ بادل آہستہ آہستہ گذر جائے۔ میں اس وقت بھی اس سے نظر نہ ملاتی تھی۔ زمین یا کسی پھول پر نظر جما کر اس سے بات کرتی تھی۔ اور اگر دیکھتی تھی تو چرا کر دیکھتی تھی۔ میں ڈرتی تھی کہ کہیں میری نگاہوں کی مزاحمت اس کے لئے مزید تکلیف کا باعث نہ ہو۔ میں جمال سے زیادہ شکیلہ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ جب ہمارے پاس کوئی اور لڑکی آکر بیٹھ جاتی تو شکیلہ کے کرب کی حالت قابل رحم ہوجاتی۔ پھولوں کی پنکھڑیاں چٹکی سے مسل ڈالتی۔ آنسوؤں کو روکتے روکتے اس کی آنکھیں گلابی ہوجاتیں۔ اور بہت پیاری معلوم ہونے لگتیں۔ میں مذاق میں اس سے کہتی "کاش کوئی اور بھی تمہاری آنکھوں کے اس رنگ میں ڈوب سکتا!" وہ شرما کر گردن جھکا لیتی۔ پھر جب میں اس کا چہرہ اٹھاتی تو اس کے رخساروں کو آنسوؤں سے تر پاتی۔ میرا مقصد یہی ہوتا تھا کہ امڈے ہوئے بادل برس جائیں۔ اس وقت خدا جانے میرے دل میں کہاں کی قوت آجاتی تھی کہ ان باتوں کو برداشت کرلیتی تھی۔ جنہیں بعد کو تنہائی میں یاد کرکے رونا آتا تھا۔

ایک دن وہ گھبرا کر کہنے لگی "آخر کب تک دونوں طرف سے یہ خاموشی رہے گی؟ میری قسمت کا ستارہ کہیں میری غفلت کی تاریکی میں

گم نہ ہو جائے!!"

میں نے سادگی کے ساتھ جواب دیا۔"تم آخر کر ہی کیا سکتی ہو؟ جب وہ مرد ہو کر کسی قسم کی جرأت نہیں کرتے تو تم تو عورت ذات ہو"

"فرض کرو وہ کبھی جرأت نہ کریں!" اس نے تیکھے پن سے جواب کا مطالبہ کیا۔"اور جرأت بھی کریں تو کس طرح۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ نہ معلوم میں ان کی پیش قدمی کو پسند کروں یا نہ کروں۔ آخر انہیں اپنی عزت کا بھی تو خیال ہے۔ وہ کیا جانیں کہ میری خاموشی بے اعتنائی نہیں بلکہ عورت ہونے کی لاج ہے؟ افسانۂ محبت کی سرخی ہمیشہ عورت کو اپنے ہاتھ سے لکھنا چاہئے"

میں مرعوب ہو گئی۔ لیکن فوراً حواس بجا کر کے نہایت بزرگانہ انداز میں سمجھایا کہ "شکیلہ! جتنی دیر ہو اچھا ہے۔ اس معاملہ میں جلدی نہ کرنا چاہئے۔ ممکن ہے ان کے جذبات محض وقتی ہوں۔ نہ معلوم وہ کس قسم کے آدمی ہوں۔ نہ پتہ معلوم نہ نشان۔ خدا جانے تمہارے گھر والوں کے خیالات کیا ہوں ——"

"گھر والوں کے خیالات!!" اس نے انتہائی حقارت آمیز اور طنزیہ انداز میں دہرایا۔ اس کے بعد اس نے کہا۔"اول تو میرے والدین نے مجھے پوری طرح اطمینان دلا دیا ہے کہ میری شادی کے معاملے میں وہ میری رائے کو مقدم سمجھیں گے۔ لیکن اگر وہ سنگ راہ بنے بھی —— تو —— تو ——"

وہ بیدم ہو گئی۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے بگڑ کر کہا۔"بس چپ رہئے" اس کی نگاہیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ میں چپ ہو گئی۔ اس کے بعد وہ خوب خوب مجھ پر برسی۔ میری بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کا غصہ بڑھتا گیا۔ میری خاموشی پر اسے اور غصہ آ رہا تھا۔ اس کا غصہ اور بڑھتا گیا۔ مجھے اس کے معصوم غصہ پر ہنسی آ گئی۔ وہ تلملا گئی۔ غصہ اکدم اپنے تمام منازل طے کر گیا گویا بادل گرج گرج کر آسمان پر اُمڈ رہے تھے۔ آخر انتہا یہ ہوئی کہ وہ رونے لگی۔ جب خوب رو چکی تو اسے اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ اس نے نادم ہو کر میری طرف دیکھا۔ مسکرائی —— جیسے بارش کے بعد سورج کی کرنیں کسی اونچے درخت کی سبز و نم پتیوں پر پڑ کر نہایت دلکش معلوم ہونے لگتی ہیں۔

"میں بھی بعض وقت کیسی بیوقوفی کی باتیں کرنے لگتی ہوں —— آخر دیوانی ہی تو ٹھہری"۔ یہ کہکر وہ میرے پاس سے چلی گئی۔ اسے یقین تھا کہ میں اسے معاف کر دوں گی اور میں نے واقعی اسے معاف کر دیا۔

چار پانچ ماہ یہی حالت رہی۔ نہ جمال اس سے آگے بڑھا نہ شکیلہ کو کسی قسم کی جرأت ہوئی۔ امتحان کے بعد یہ محفل بھی درہم برہم ہو گئی۔ میں نے جمال میں بذاتِ خود کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ مگر اب ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے میں ایک شیریں خواب دیکھ رہی تھی جس کے دوران میں اکدم جگا دی گئی۔ کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جب نہ شکیلہ سے ملاقات نصیب ہو گی نہ جمال کا دیدار۔ شکیلہ کی کہانی کو میں اپنی کہانی سمجھنے لگی تھی۔ اس سے جدا ہوتے وقت مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں اپنی روح سے جدا ہو رہی تھی۔ شکیلہ کی بھی حالت غیر تھی۔ جیسے نبضیں چھوٹ گئی ہوں۔ وہ بے حد ذکی الحس واقع ہوئی تھی۔ اور سر سے پیر تک جذبات۔ اسے ایسی چپ لگی تھی کہ میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ چلتے وقت بھی اس نے کچھ نہ کہا۔ ہاں مگر آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کے پتے لکھ لئے تھے۔ کیونکہ اُسے گونڈے اپنے والد کے پاس جانا تھا جہاں وہ حاکم خزانہ تھے۔ ہم دونوں میں برابر خط و کتابت ہوتی رہی۔ جب دو محبت کرتے ہوئے دلوں کے درمیان سیکڑوں کوس کا فاصلہ واقع ہو تو خط اور تصور کے علاوہ روحوں کی ملاقات کا اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے! شکیلہ کے خطوط بہت پُر درد۔ دلگداز اور موثر ہوتے تھے۔ ان کے ذریعہ سے کل واقعات معلوم ہوتے رہتے تھے ——

اسکول کے بند ہونے کے بعد سے جمال نے شکیلہ کے مکان کے طواف میں زیادتی کر دی تھی۔ پھر اکدم اس میں کمی ہو گئی۔ جمال کچھ مغموم اور بدلا ہوا سا معلوم ہونے لگا۔ نوشابہ خاتون اپنی خالہ کے ہمراہ جودھپور چلی گئیں۔ اس کے بعد جمال کی آمد بالکل بند ہو گئی۔ شکیلہ دیدار کو بھی ترسنے لگی۔ اسے یکایک یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ جمال نوشابہ سے محبت کرتا ہو۔ شبہ پہلے بھی ہوا تھا۔ مگر اب تو اسے یقین ہو گیا تھا —— وہ مضطرب تھی اور میں اس سے ملنے کے لئے بیتاب۔

ابتک تو مجھے امید بھی تھی کہ تعطیل کے ختم ہونے پر شکیلہ سے پھر اسکول میں ملاقات ہو گی۔ لیکن قسمت کے ہاتھوں وہ بھی منقطع ہو گئی۔ کیونکہ امی جان نے کہا۔"اب آگے بڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں" جس کا مطلب

یہ تھا کہ اب میری شادی کردی جائے گی - بات تو دو ماہ قبل ہی طے ہو چکی تھی مگر میں یہ نہ سمجھتی تھی کہ اسقدر جلد گرفتار کردی جاؤں گی - میں نے اختتام تعلیم کا بہانہ رکھ کر اس کی مخالفت کی اور سخت مخالفت مگر والدین تو اپنے آپ کو حکمراں سمجھتے ہیں - لڑکوں کی نہیں چلتی تو پھر لڑکیاں کس شمار میں ہیں! جب ہر کوشش ناکام ہو گئی تو میں نے شکیلہ کو بھی لکھ بھیجا کہ "تمہاری بہن کو دیس نکالا دیا جا رہا ہے - اس میں تمہاری شرکت ضروری ہے - اسکول میں ملنے کی امید تو ٹوٹ گئی - اب یہیں آ کر مل جاؤ - تمہارے بغیر میرے غم غلط نہیں ہو سکتے ...."

اس کا جواب جودھپور سے آیا اور بڑی وحشت اثر خبر لایا - لکھا تھا

"........ میں گھبرا کر جودھپور چلی آئی - میرے شکوک صحیح نکلے - دل کا چور بے نام قاتل اسٹیشن ہی پر نظر آ گیا - غالباً لکھنؤ واپس جا رہے تھے - کیا اب بھی آپ میری بات نہ مانیں گی؟ کیا ان کا جودھپور جانا نوشابہ باجی کی وجہ سے نہ تھا؟ مگر کیا ستم ہے کہ وہ نوشابہ باجی کو چاہتے ہیں - اور نوشابہ باجی وکیل بھائی کو ــــ محبت کسقدر اندھی ہے - اور قسمت کسقدر ظالم - لیکن اگر نوشابہ باجی کو بھی ان سے محبت ہوتی تو ان کے ملاپ میں کوئی مشکل نہ ہوتی ــــ اور ــــ شاید میں ان کے ملاپ کا منظر برداشت نہ کر سکتی - وہ میرے ہو کر رہیں یا کسی کے نہیں - اگر وہ کسی اور کی قسمت میں لکھے ہیں تو خدا کرے کہ میں اس لمحے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہوں - آپ مجھے حاسد کہیں گی - رقابت کا الزام لگائیں گی - لیکن پیاری سہیلی! میں مجبور ہوں - کاش آپ کو بھی کسی سے محبت ہوتی!

.... یہاں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے .... اور سب سے زیادہ تکلیف دہ خبر یہ ہے کہ کل سے نوشابہ باجی بھی اس موذی مرض میں مبتلا ہو گئی ہیں - خدا اپنا فضل و کرم کرے - اب ہم لوگ یہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتے - شاید میری بھی موت ہی مجھے یہاں لائی ہو ....

آپ کی شادی کی اچانک ضرور ہے اور بے موقعہ بھی - لیکن مسرور کن - مجھے آپ پر بڑا رشک آتا ہے - آپ مجھ سے بہت زیادہ خوش قسمت ہیں - جو محبت نہیں کرتے وہی مزے میں رہتے ہیں! میں تو بے بلائے شریک ہوتی - لیکن اب کس طرح ممکن ہے؟ خدا سے دعا کیجئے کہ باجی اچھی ہو جائیں ...... بہرحال میری دلی مبارکباد قبول کیجئے - لیکن جب ملوں گی تو آپ سے آپ کی شادی کی ایک دعوت ضرور لے لوں گی .... خدا حافظ -

"حرماں نصیب شکیلہ"

اس خط نے میرے دل پر جو اثر کیا اس کو بیان نہیں کر سکتی - بار بار اس کے جملے میرے دماغ میں گردش کرتے تھے - شکیلہ کے شکوک کی تصدیق نوشابہ کی مہلک بیماری - شکیلہ کی ملاقات سے ناامیدی ــــ یہ تھے وہ نشتر جو اس خط میں چھپے ہوئے تھے اور میرے دل میں کھٹک رہے تھے میں شکیلہ کو کس طرح یقین دلاتی کہ میں اپنی شادی سے واقعی نفرت کرتی تھی ــــ وہی شادی جس کی وجہ سے اس نے لکھا تھا کہ میں تم پر رشک کرتی ہوں - اور محبت؟ ہاں - شکیلہ نے ٹھیک لکھا - مجھے یہ کہنے کا کوئی حق نہ تھا کہ میں محبت سے بہرہ مند ہوں کیونکہ مجھے اپنے جذبات پر قابو نہ تھا -

شادی کا دن جسے میں موت کا دن سمجھتی تھی - قریب آ گیا - اس کے دو روز پہلے شکیلہ کا ایک اور خط آیا جس میں نوشابہ کے انتقال اور شکیلہ کے نہ آ سکنے کی خبر تھی - ہر وہ لمحہ جو گذر رہا تھا میری شادی کو میری نظر میں تلخ تر بناتا جا رہا تھا - ذرا زمانے کی سفاکی پر آنسو بہائیے کہ ایک ایسی ہستی جو میری روح سے اسقدر قریب تھی اپنی بہن کی موت پر ماتم کر رہی تھی اور اسی وقت یہاں میری شادی رچائی جا رہی تھی - اور ان لوگوں کے نزدیک شادی کے ملتوی کرنے کی ضرورت کیوں نہیں تھی؟ اس لئے کہ ہم میں اور ان میں کوئی رشتہ داری تو تھی نہیں - سبحان اللہ! کیا دلیل تھی!

آخر میری شادی ہو گئی - اور اس رات کو جسے حیاتِ انسانی کی زریں رات کہا جاتا ہے - بجائے اپنے شوہر کے انتظار کے جمال اور شکیلہ کے قصہ پر غور کر رہی تھی - بجائے اس کے کہ ان لمحات رنگین سے کسب لطافت کرتی اور حسن رومانیت سے لطف اندوز ہوتی - میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ اگر انسان کی زندگی زہر کا کڑوا جام بن جائے تو اس کے پینے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے - جو جانور قربانگاہ پر چڑھایا جاتا ہے اسے اپنے جلاد کی شخصیت کے متعلق اتنی کاوش نہیں ہوتی - وہ کوئی بھی ہو - اس کے دل و دماغ پر تو محض یہ خیال چھایا ہوتا ہے کہ "میں قربان ہو رہا ہوں" - میں لرز ضرور رہی تھی - لیکن یہ جوش انتظار نہ تھا بلکہ تصادم اجنبیت کا کھٹکا ــــ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میرا شوہر - میرا نامعلوم خدا - جمال تھا - میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں خوش

ہوؤں یا روؤں۔ وہ پیکرِ خیال جسے میں نے قسمت کی رسائی کے ماورا
سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ بھلا دیا تھا۔ شکیلہ کو سونپ دیا تھا۔ میری آنکھوں کے
سامنے شکل پذیر نظر آرہا تھا۔ میں بدحواس ہوگئی۔ مجھ کو یقین نہ آتا تھا کہ میرے
سامنے وہی بت تھا جس کی پرستش کی رازدارانہ ــــ غیر محسوس حد تک
رازدارانہ۔ خواہش میرے قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں پوشیدہ تھی اور
اب ابھر ابھر کر دل و دماغ سے ٹکرا رہی تھی۔

لیکن ــــ شکیلہ کے خیال نے ساری خوشی پر پانی پھیر دیا
میرے ضمیر کو جگا کر۔ مجھے ہوش میں لاکر میرے رباب کو توڑ دیا جس میں ہزاروں
نغمے گنگنا رہے تھے۔ قدرت کسقدر ستم ظریف واقع ہوئی ہے! اب میں
شکیلہ کو کس طرح منہ دکھاؤنگی؟ کون سا عذر اس کے سامنے پیش کرونگی؟
کیا کہکر اسے دلاسا دونگی؟ وہ کیا خیال کرے گی؟ کیا وہ مجھے مکار اور دغاباز
تصور نہ کرے گی؟ میں اس معاملہ میں اسے ہمیشہ روکتی رہی تھی۔ اس کا
مطلب اب وہ کیا نکالے گی؟ اس نے اپنے خط میں صد درجہ کی رقابت
پرستی کا اظہار کیا تھا ــ کہ "وہ میرے ہوکر رہیں یا کسی کے نہیں" وہ ہرگز
مجھے معاف نہ کرے گی۔ اور اگر معاف بھی کردیا تو وہ اسقدر نازک دل ہے
کہ اس اذیتِ قلبی سے ہرگز جانبر نہ ہوسکے گی۔ میں جانتی ہوں کہ عورت کی
فطرت کیا ہے۔ وہ غیروں سے اتنی رقابت نہیں رکھتی جتنی اپنوں سے
میرا کوئی قصور نہیں۔ لیکن میں اسے اپنی بے گناہی کا کیونکر یقین دلاؤنگی؟
کیا شکیلہ کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ یہ محض اتفاق تھا یا قدرت کا ایک
ادنےٰ سا مذاق۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتی تھی کہ جمال پر واقعی حق
شکیلہ ہی کا تھا۔ اس نے اس کی یاد میں راتیں جاگ جاگ کر کاٹی تھیں
اس نے اس کے تصور کی مورتی پر آنسوؤں کے موتی چڑھائے تھے اور وہ اسکی
خاطر ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار تھی ــــ اگر انسان کے پاس
ضمیر نہ ہوتا تو وہ چین سے ہوتا۔ لیکن کسقدر خود غرض! کسقدر بے حیا!

جمال میری مسہری پر بیٹھ گیا جس سے میرا سلسلۂ خیال ٹوٹ گیا۔
بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ میں اس وقت مسرور تھی اور تا حد مدہوشی
مسرور تھی۔ لیکن مجھے تکلیف بھی تھی۔ اور نزع کی سی تکلیف!!

جمال کا پہلا جلوہ افسردہ۔ میرے لئے اس کا برداشت کرنا بہت
دشوار تھا۔ اس دشواری کو وہی سمجھ سکتا ہے۔ جس نے اپنے محبوب کو مغموم دیکھا
ہو۔ میں یہی سمجھ رہی تھی کہ ان کی افسردگی کا باعث میں ہی کمبخت تھی کیونکہ
میں ان کی محبت میں حائل ہوئی تھی ــ خواہ وہ محبت نوشابہ کے لئے ہو
خواہ شکیلہ کے لئے۔ وہ بہت دیر تک یونہی افسردہ بیٹھے رہے۔ ہر لمحے کے ساتھ
ان کی افسردگی بڑھتی جاتی تھی۔ میں بولنا چاہتی تھی مگر ہمت نہ ہوتی تھی۔ حیا
اجازت نہ دیتی تھی۔ آخر ان کی حسین آنکھوں سے ایک رقیق موتی ڈھلک کر
دامن میں جذب ہوگیا۔ اور دوسرا گوشۂ چشم میں دمکنے لگا۔ ان کو اس حال
میں دیکھ کر میں کس طرح چپ رہ سکتی تھی۔ میں نے بولنے کا تہیہ کرلیا۔ کئی بار
(آواز سرمہ در گلو ہوکر رہ گئی) میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میرے جسم میں لرزش
تھی۔ آخر میں اتنا کہنے میں کامیاب ہوگئی کہ

"آپ روتے کیوں ہیں؟ میرا کوئی قصور نہیں"۔

میرے جملے کے آخری ٹکڑے سے وہ چونکے پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے

"میں آپ کی حالت پر افسوس کررہا ہوں۔ میرے ساتھ آپ کی
شادی کرکے آپ پر ظلم کیا گیا ہے"۔

میں نے دبی آواز میں جواب دیا۔

"آپ کو میری قسمت پر رائے زنی کرنے کا کیا حق ہے؟"

وہ مسکرائے۔ مگر پھر سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"مجھے آپ سے ہی نہیں بلکہ کسی سے شادی کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔
میں حسن پرست ہوں۔ حسن پرست کو شادی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس کی
فطرت کا یہی تقاضا ہے کہ وہ ناکام رہے۔ حسن پرست حسن کی دھیمی سے دھیمی
کرن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور عورت ایک حقیر سے حقیر ذرہ کی
رقابت کو برداشت نہیں کرسکتی" بیوی توجہ چاہتی ہے اور میں لاابالی۔
اس کے علاوہ حسن پرست کی زندگی اسی میں مضمر ہے کہ اس کی منزل اس سے
گریزاں رہے۔ اس کی فطرت ایک دائمی تعاقب چاہتی ہے ــــ"

"میں اس نکتۂ حسن پرستی کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن
میں اتنا جانتی ہوں کہ سب عورتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ
اگر عورت کو محبت ہو تو محبت کی خاطر وہ سب کچھ کرسکتی ہے"۔ میں نے ڈرتے
ڈرتے کہا۔

"محبت؟ ــــ عورت کی محبت! یہ صرف دور سے مجھے ترسانے کے لئے
پیدا ہوئی ہے"۔ اس نے انتہائی تلخی کے ساتھ کہا۔

یہ سنکر مجھے بیحد تعجب ہوا ـــ وہ جمال جسپر عورت جان دیتی تھی وہ جمال جو شکیلہ کا خدا تھا۔ وہ جمال جس کی پرستش خاموش میرے دل کی عصوم تمنا تھی۔ وہ جمال جس نے میری نظر کے سامنے حسین ترین پیکر ہائے دوشیزگی کو مجروح کر دیا تھا۔ عورت کی محبت کے لئے ترس رہا تھا! اس پر مجھے یقین نہ آتا تھا۔ کم از کم اس پردۂ ہستی پر تو کوئی عورت میری نظر میں ایسی نہ تھی۔ جو جمال کی دعوت محبت کو ٹھکرا سکتی۔

میں نے موقعہ کو غنیمت جان کر کہا۔

"یہ آپ کا خیال ہے ـــ شکیلہ سے زیادہ کوئی عورت محبت نہیں کر سکتی۔"

"شکیلہ کون؟" اس نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔ پھر میرا باریک گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "چہرہ کھول کر مجھ سے باتیں کیجئے مجھے الجھن ہوتی ہے۔ بہت دیر سے اس الجھن کو برداشت کر رہا ہوں"

مجھے دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"کیا میں نے آپ کو اس سے پہلے کہیں دیکھا ہے؟"

میں نے سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"کیا گرلس اسکول کا ڈرامہ آپ کو یاد نہیں؟"

اس نے گھبرا کر کہا۔

"اتنی باتیں مجھے یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ اس قسم کی صورت میں نے اس سے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے"

اس کے بعد وہ مسہری کے تکیہ سے ٹیک لگا کر کسی خیال میں ڈوب گیا۔ ـــ یکایک اس نے پھر سوال کیا۔

"اچھا یہ شکیلہ کس کا نام ہے؟"

میں گھبرا گئی کہ اس کا جواب کیا دوں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جواب سے ایک بہت بڑی اہمیت اور ذمہ داری وابستہ ہے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اس جواب کو دوسرے موقعہ کے لئے اٹھا رکھوں اس وقت کسی طرح ٹال دوں۔ میں نے کچھ دیر توقف کرکے کہا۔

"میں یہ آپ کو نہیں بتا سکتی۔ کسی ناکام کو بدنام کرنے سے کیا فائدہ؟"

"بدنامی کی اس میں کیا بات ہے؟"

"کیوں نہیں۔ بدنامی بھی بے عزتی بھی"

"وہ کس طرح؟"

"اگر کوئی شخص کسی سے محبت کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف سے خاطر خواہ جواب نہیں ملتا تو اس کے لئے خاموشی ہی بہتر ہے۔ کم از کم دوسرے کی نظر میں حقیر تو نہ ہوگا۔ شکیلہ آپ سے محبت کرتی ہے اور اپنے دل کی پوری قوت کے ساتھ محبت کرتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے آپ کو اس سے محبت نہیں آپ کو اس کا نام تک نہیں معلوم ـــ میں اس کی راز دار تھی اور اسی رازداری کا پاس ہے کہ میں اس کا نام و نشان اس کے دیوتا کے سامنے بھی افشا کرنا نہیں چاہتی ـــ"

اس نے بات کاٹ کر کہا۔

"خدا کے لئے میرا دماغ خراب نہ کیجئے۔ یا الٰہی میں کسقدر گنہگار ہوں خدا کے لئے بتا دیجئے کہ شکیلہ کون ہے اور اس کے متعلق آپ کیا جانتی ہیں ـــ ـــ لیکن نہیں آپ میری منکوحہ ہیں آپ مجھے نہیں بتا سکتیں۔ نہ مجھے آپ سے پوچھنا چاہئے۔ مجھے کسی سے نہ پوچھنا چاہئے۔ مجھے شکیلہ کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو یہی بہتر ہے۔ کیونکہ میرا دل بہت رقیق ہے۔ شاید میں اپنے فرائض کو بھول جاؤں ـــ"

میں نے پر مذاق انداز میں کہا۔

"حسن پرست بھی فرائض کا احترام کرتے ہیں؟"

اس نے فوراً جواب دیا۔

"ہاں۔ حسن پرست بھی شریف ہوتے ہیں ـــ لیکن دیکھئے میں شوہر ہونے کے کسقدر ناقابل ہوں۔ ہماری شادی کی یہ پہلی رات ہے جو خوشبو میں بسی ہوئی ہے۔ اس کا تقاضہ یہ تھا کہ میں آپ سے اظہار محبت کرتا اور اگر جھوٹ بولتے مجھے شرم آتی تو کم از کم آپ کے حسن کی تعریف کرتا۔ اس موقعہ کی رومانیت پر نغمہ سرائی کرتا اور محبت بھری باتیں کرتا۔ لیکن ان تمام فرائض کو نظر انداز کرکے میں آپ سے اس ہستی کا نام و نشان پوچھ رہا ہوں۔ جس سے قدرتاً آپ کو رقابت ہونا چاہئے ـــ یہ میری کتنی بڑی غلطی ہے آپ ہی بتائیے کہ کیا مجھے شادی کرنا چاہئے تھی؟"

میں دم بخود تھی وہ کانپ رہا تھا۔ آخر میں نے کہنا شروع کیا۔

میں دوسری عورتوں کی طرح رقابت پرست نہیں۔ اس کے علاوہ میں شکیلہ کی دوست تھی اور رازدار۔ لہذا میری کوشش یہ تھی

کہ آپ کا اور شکیلہ کا ملاپ ہو جائے۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی کو کیا کیا جائے کہ آپ کی شادی میرے ساتھ لکھی تھی ـــــ میں اس کو اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھتی لیکن ضمیر کی سرزنش ہمارے عیش کو برباد کر دے گی اور شکیلہ کی آہ ہمارے آشیانے کو خاک کر ڈالے گی۔ میں اسے کس طرح یقین دلاؤنگی کہ میں نے آپ سے جان کر شادی نہیں کی۔ میں اب بھی ہر اس صورت کے لئے تیار ہوں جس سے آپ دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں ـــــ رہا یہ خیال کہ رقابت کیوجہ سے میں اس کا نام ونشان نہ بتاؤں گی بالکل غلط ہے۔ وہ میری ایک ہم جماعت تھی اس سے زیادہ مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ اور خواہ یہ معلوم ہو یا نہ ہو کہ وہ کیا ہے کون ہے کہاں ہے۔ یہ معلوم ہو جانا بہت کافی ہے کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے اور سچ پوچھئے تو بمقابلہ میرے آپ اس سے زیادہ واقف ہیں ـــــ "

جمال ہنس پڑا۔ اس نے کہا۔

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ میں بمقابلہ آپ کے زیادہ واقف ہوں ـــــ یہ شاید آپ رقیبانہ اندازے سے کہہ رہی ہیں ـــــ رہی میرے اور شکیلہ کے ملاپ کی صورت تو اس امر کے متعلق میں اتنا کہدینا کافی سمجھتا ہوں کہ قسمت پر صبر کرنا سب سے بڑی شرافت ہے۔ میں نے آپ سے شادی کی ہے تو تادم آخر اسے نباہونگا ـــــ اور اس کی خاطر حسن پرستی! ـــــ ہاں حسن پرستی کو بھی چھوڑ دینے کی کوشش کروں گا"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"ایسا وعدہ نہ کیجئے جو پورا نہ ہو سکے۔ حسن پرستی بالارادہ کون کرتا ہے یہ چیز تو جزو فطرت ہوتی ہے"

اس نے کہا۔

"ہاں یہ آپ ٹھیک کہتی ہیں ـــــ لیکن میں آپ کو بتانا یہ چاہتا ہوں کہ میں آپ کا کتنا احترام کرتا ہوں ـــــ کیونکہ میں سب کچھ ہوں کمینہ نہیں ہوں"

"خدا کے لئے ایسی ترغیب کی باتیں نہ کیجئے کہ میں اپنے فرض کو بھول جاؤں۔ میں آپ کے اس "احترام" کی قدر کرتی ہوں اور اس پر نازاں ہوں ـــ لیکن آپ کی شرافت کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ اس ہستی کا خیال کیجئے جو آپ سے محبت کرتی ہے ـــــ میں شکیلہ کے بارے میں کہہ رہی ہوں"

"مجھے آپ کی زبان سے یہ باتیں سنکر سخت تعجب ہو رہا ہے ـــ آپ کی باتیں انسانی فطرت کے خلاف ہیں"

" آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ اگر یہ باتیں دنیا کے سامنے پیش کی جائیں تو وہ ہرگز اسے باور نہ کریں گے کیونکہ زیادہ تر لوگ خود غرض ہوتے ہیں۔ اسقدر خود غرض کہ خود غرضی کو وہ انسانی فطرت سمجھنے لگے ہیں ـــ لیکن میں کہتی ہوں کہ اگر انسان کے پاس ضمیر نہ ہوتا تو وہ واقعی خود غرض ہوتا اور دلیر خود غرض"

"تو پھر آپ ہی بتلیئے میں اس معاملہ میں کیا کر سکتا ہوں"۔

"اچھا یہ بتلیئے کہ آپ کو کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟ آپ نے کبھی کسی کی گلیوں کی خاک چھانی ہے"

" آپ کو معلوم نہیں کہ حسن پرست گلیوں کی خاک چھاننے ہی کیلئے پیدا ہوا ہے؟ "

"ہاں ـ مگر حسن پرست کو محبت نہیں ہوتی ـــ وہ ہر دھوکے کو محبت سمجھ لیتا ہے"

"لیکن کیا ان دھوکوں کے حسین ہونے سے آپ کو انکار ہو سکتا ہے؟

ـــــ سنئے میں آپ کو اپنے حالات سناتا ہوں ـــــ حقیقتاً مجھے آج تک کسی عورت سے محبت نہیں ہوئی۔ قطع نظر اس عالمگیر جذبۂ محبت سے جو ہر حسن پرست کے دل میں قدرت ودلیعت کر دیتی ہے۔ ایک بار دھوکا ہوا تھا۔ لیکن وہ بھی بہت جلد جاتا رہا۔ میرا افسانہ جس کو میں "دھوکا" کہتا ہوں۔ آپ کے اسکول کے ڈرامہ سے شروع ہوا۔ میں ہمیشہ سے حسن پرست واقع ہوا تھا اور ایک خوش نصیب حسن پرست کیونکہ "حسن" خود میری نظر کا گرویدہ۔ میری جنبش نگاہ کا تابع نظر آتا تھا۔ مجھے اس یقین میں بڑی لذت محسوس ہوتی تھی کہ ہر عورت مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اور میں جس پر چاہوں حکومت کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے یہ دھوکا ہی ہو۔ اور محض مغالطہ مگر بڑا حسین دھوکا تھا اور بڑا رنگین مغالطہ۔ میں اپنی زندگی اسی دھوکے میں مبتلا رہ کر گذار دینا چاہتا تھا۔ اور کبھی یہ جاننا ہی نہ چاہتا تھا کہ یہ دھوکا ہے۔ میں حسن کا دلدادہ تھا۔ وہ جہاں ہو جس میں ہو۔ جس رنگ میں ہو۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ حسن کا بہترین مظہر "عورت" ہے لیکن حسن ایک شخصیت میں محدود نہیں ہو سکتا اور ہر پیکر جمیل کو میں حاصل نہیں کر سکتا

اس لئے سب سے بہتر میں اس بات کو سمجھتا تھا کہ سب کی تمنا کی جائے لیکن کسی کو حاصل نہ کیا جائے - چنانچہ میں شادی سے بھی متنفر تھا - کسی ایک ذات میں اتنا ڈوب جانا کہ پھر کسی اور میں حسن نظر ہی نہ آئے اسکو میں اندھا پن سمجھتا تھا - حسن کا کوئی "آئیڈیل" نہیں - دنیا کی تمام عورتوں میں کوئی ایک عورت بھی ایسی نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ "میں سب سے زیادہ حسین ہوں" جس طرح ہر پھول اپنی جگہ پر پھول ہوتا ہے اور کسی ایک پھول کو حسین ترین پھول - یا آئیڈیل پھول کی حیثیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا - کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ گلاب زیادہ حسین ہوتا ہے یا کنول ؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ایک متین و سنجیدہ لڑکی زیادہ حسین ہوتی ہے یا شوخ اور چنچل ؟ کم از کم میں تو آج تک نہیں طے کر سکا - میری نظر میں دونوں اپنی اپنی جگہ پر قیامت ہیں - لہذا مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی ایک ہستی کے لئے پیدا نہیں ہوا ہوں بلکہ دنیا کے تمام حسن کے لئے - لیکن جس روز میں نے نوشابہ کو اس ڈرامہ کے موقعہ پر طاؤسی ساری پہنے ہوئے دیکھا - اس روز مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میں صرف اسی ایک ذات کے لئے پیدا ہوا ہوں - اور دنیا کا مجموعی حسن وہی ہے - میں نے اپنی حسین اور دلکش زندگی کی لذت کو نوشابہ کی آرزو پر قربان کر دیا - مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ نوشابہ کو خدا نے مجھ سے دنیا کے مجموعی حسن کی دل آزاری کا انتقام لینے کی غرض سے پیدا کیا تھا - دنیا کی ہر عورت کے لئے مجھ میں دلکشی تھی مگر نوشابہ کیلئے نہ تھی - مجھ سے محبت کرنا تو در کنار وہ میری طرف دیکھتی بھی نہ تھی - اسکی اس بے نیازی اور بے توجہی سے میرے پندار کو ٹھیس لگی - میں نے اسپر قابو پانے کی کوئی ممکن صورت اٹھا نہ رکھی - جب میری ہر کوشش ناکام ہو چکی تو میں اس نتیجے پر پہونچا کہ نوشابہ جانتی ہی نہیں محبت کیا چیز ہے اس کا دل سرد ہے - اس میں جذبات پیدا ہی نہیں ہوتے - خدا نے اس سے اس کی زندگی کا جوہر اس کا اصلی حسن چھین لیا --- میرے نزدیک محبت انسان کی روح کا حسن ہے - حسن بغیر محبت کے اس جڑاؤ لیمپ کی طرح ہے جو اوپر سے بہت خوبصورت ہو - لیکن اندر سے روشنی نہ ہو - اعضا کا تناسب بہتر سے بہتر ہو - چہرے کی تراش حسین سے حسین ہو لیکن اگر دل میں محبت کے جذبات نہیں ہیں تو حسن بے جان ہے۔ نگاہ میں محبت کا رنگ نہیں ہے تو آنکھیں بے نور ہیں محض تناسب اعضا پر جان دینے کو جی نہیں چاہتا لیکن محبت بھری نگاہ پر سوز زندگیاں ملیں تو وہ بھی نثار کی جا سکتی ہیں - حسن مخاطب ہی زہد شکن ہوتا ہے حسن کی برگشتگی بھلی نہیں معلوم ہوتی --- چنانچہ جب میں نے نوشابہ میں یہ کمی محسوس کر لی تو میری نگاہ میں اس کا حسن گم ہو گیا - میری پسندیدگی ختم ہو گئی - میری آرزو مر گئی - لیکن محبت شاید اب بھی میری رگ رگ میں چھپی ہوئی ہے - اکثر بیٹھے بیٹھے اس کا خیال آجاتا ہے جب کبھی کسی میں اس کی مشابہت دیکھ لیتا ہوں تو تڑپ اٹھتا ہوں اور نظارے کو "جنبشِ مژگاں" بھی "بار" ہو جاتی ہے"۔

اتنا کہکر وہ دم لینے کے لئے رک گیا - ایک ٹھنڈی سانس لی اور مجھ سے پان کی فرمائش کی - میں پان بنانے میں مصروف ہوگئی تو اس نے پھر کہنا شروع کیا -

"اس آرزو سے دست بردار ہوکر اس عارضی دیوانگی سے رخصت ہوکر میں پھر اپنی پہلی زندگی میں آگیا - جہاں حسن ہی حسن تھا - جہاں محبت ہی محبت تھی - جہاں نگہ بندہ نواز اور عشرتِ نظارگی سے زینت حیات تھی - جہاں ناکامی حیات سوز نہ تھی بلکہ سرمایۂ لذات - اور باعثِ جذبات مجھے اپنی دیوانگی پر افسوس آیا کہ میں نے ایک دھوکے میں مبتلا ہوکر اس فضائے حسن و محبت سے کیوں منہ پھیر لیا تھا ! !"

میں نے پانوں کی تھالی اس کی طرف کھسکا دی - اس نے ایک پان اٹھا کر کھا لیا اور پھر کہنے لگا -

"جب میں جودھپور سے واپس آیا جہاں نوشابہ اسکول کے بند ہونے کے بعد چلی گئی تھی تو یہ معلوم ہوا کہ میری شادی کی تاریخ بھی طے ہو چکی ہے - گویا ایک قفس سے نکلنے کے بعد میرے لئے دوسرا قفس تیار تھا - میں اپنی زندگی کو اپنی فطرت کو اپنی حسن پرستی کو نذرِ قفس کرنا نہ چاہتا تھا --- مگر --- قدرت کی ستم ظریفی سے خدا بچائے - ایسے شکنجے میں کس دیتی ہے کہ اس سے نکلنا محال ہو جاتا ہے --- اچھا ہٹایئے ان باتوں سے کوئی بحث نہیں کہ میری شادی کیسے ہوئی - آپ کی جو فرمائش تھی وہ میں نے پوری کر دی ---"

اس کے اس مقام پر رک جانے سے مجھے تکلیف ہوئی - میں چاہتی تھی کہ وہ یہ بھی بتا دے کہ میری شادی اس کے ساتھ کیسے ہوئی - لیکن میں اصرار کس طرح

کر سکتی تھی۔

اس کی باتیں سنکر اور یہ خیال کرکے کہ نوشابہ جس نے جمال کو اسقدر موہ لیا تھا اس دنیا کو خیرباد کہہ چکی تھی۔ اور اس کی جمال کو مطلق خبر نہ تھی۔ میرا دل بھر آیا۔ میں نے اپنے اس سے آگاہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا لیکن میرے دماغ میں ایک انوکھا خیال آیا۔ وہ یہ کہ جب نوشابہ کے حسن نے جمال کو موہ لیا تھا تو شکیلہ کا حسن بھی ضرور اسے موہ لے گا۔ کیونکہ وہ دونوں ایک ہی طرز ادا اور ایک ہی رنگ میں پردۂ ہستی پر رونما ہوئی تھیں ——— میں سوچنے لگی اور انتہائی انہماک کے ساتھ سوچنے لگی۔ میرا دل شکیلہ کے لئے رو رہا تھا۔ میں اپنی ہر مسرت اور ہر تمنا کو قربان کرکے شکیلہ کو محبت میں کامیاب دیکھنا چاہتی تھی۔ میں اپنے ضمیر کی تشفی کرنا چاہتی تھی۔

میں سوچ رہی تھی اور بڑی امیدوں کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے جمال سے بے خبر سی ہوگئی تھی۔ اب ہوش میں آئی تو اسے ایک عجیب لے میں ایک بے پناہ دھیمے ترنم کے ساتھ اس شعر کو گاتے ہوئے سنا کہ ؎

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی ؎ ہاں مگر چین سے بسر نہ ہوئی

وہ مسہری کے تکیہ سے ٹیک لگائے لیٹا تھا۔ نگاہیں چھت کی طرف تھیں۔ اور اب وہی غم انگیز شیریں راگ چھیڑے ہوئے تھے کہ ؎

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی ؎ ہاں مگر چین سے بسر نہ ہوئی

میں جمال کے ساتھ اپنے دن ایک مہمان کی حیثیت سے گذار رہی تھی۔ دل اس کے گھر کو اس کی ہر چیز کو خود اس کو اپنا سمجھنے پر آمادہ ہوتا تھا لیکن شکیلہ کا خیال قدم جمنے نہ دیتا تھا۔ سکون مکمل ہونے سے پہلے اضطراب میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ خیالات مجتمع ہوتے ہی پھر منتشر ہوجاتے تھے۔ جمال حسن پرست تھا لیکن مکمل ہونے سے پہلے اضطراب میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ خیالات مجتمع ہوتے ہی پھر منتشر ہوجاتے تھے۔ جمال حسن پرست تھا لیکن مجھے اس سے شکوہ نہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ ایک حسن پرست کے ساتھ زندگی کس طرح خوشگوار رہ سکتی ہے۔ اور اس معاملہ میں میں شکیلہ میں بہت سی کمیاں دیکھتی تھی۔ جمال مجھ میں زیادہ دلچسپی نہ لیتا تھا۔ لیکن میں خود اس میں پوری طرح دلچسپی لیتی تھی ——— وہ مجھے پسند ضرور کرنے لگا تھا۔ مگر محض ایک مہذب اور قابل قدر "شریک زندگی" کی حیثیت سے۔ میں یہ بھی دیکھ رہی تھی۔ کہ یہ پسندیدگی رفتہ رفتہ محبت بن رہی ہے۔ لیکن اس سے میں خائف تھی کیونکہ اس سے جمال اور شکیلہ کے درمیان کی دیوار اور سنگین ہو رہی تھی

ایک روز پھر میں نے جمال کو ٹٹولنے کے لئے شکیلہ کا قصہ نکالا۔ وہ تلملا گیا۔ اور ایک شدید روحانی کرب کے ساتھ اس نے کہا۔

"خدا کے لئے اس کا ذکر نہ کرو۔ جس خیال کو میں بھلا دینے کی کوشش کر رہا ہوں تم اسے کیوں جگاتی ہو؟ مجھے اب اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے۔ کہ تمہارے علاوہ کسی اور کے ساتھ میں ازدواجی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ میں شکیلہ کے آگے شرمندہ ہوں۔ اور اس سے معافی مانگنے کے لئے بیتاب لیکن میں اپنے گھر کو اجاڑنے پر ہرگز تیار نہیں ہوسکتا اور کیا معلوم یہی ہمارے اور شکیلہ دونوں کے حق میں بہتر ہو۔ اگر شکیلہ محبت کرتی ہے تو کرے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن اس محبت میں جو تکلیف ہو اس کا برداشت کرنا بھی اس کا فرض ہے۔ یہی محبت کی عظمت ہے اس کے علاوہ محبت میں شادی کوئی لازمی چیز نہیں۔ اگر بغیر شادی کے قربت میں دوام حاصل ہوسکے تو کوئی شادی نہ کرے۔ شادی محض جدائی کے ڈر سے کیجاتی ہے ——— دیکھو اب میرے قدموں کو لغزش کا سبق نہ دینا"

میں نے کہا۔ "اگر نوشابہ آپ کو محبت کی دعوت دے اور خود حاضر خدمت ہوکر محبت کی بھیک مانگے؟"

وہ بیتاب ہوکر اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے مسکراتا ہوا چھوڑ کر باہر چلا گیا یہی اس کی کمزوری تھی۔ اور اسی سے میں نے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا تھا۔

والد صاحب کا تبادلہ گونڈے سے گورکھپور ہوگیا۔ مجھے دو ماہ لکھنؤ میں رہنے کے بعد وہیں بلا لیا گیا۔ عید کا چاند وہیں دیکھا تھا۔ اسکول کھلنے پر شکیلہ لکھنؤ آئی لیکن میں اس وقت گورکھپور میں تھی۔ اس کا بہت بیتابانہ شکوے شکایات کا خط گونڈے ہوتا ہوا گورکھپور پہونچا۔ مجھے شکیلہ سے اس قدر شرم معلوم ہونے لگی تھی کہ میں اسے خط لکھتے بھی جھجکتی تھی۔ اس سے ملنے کے لئے جی بیچین ضرور تھا مگر جب اس کا سامنا کرنے کا خیال آتا تھا۔ تو میرا عجیب حال ہوجاتا تھا۔

تقریباً ایک سال تک ہم دونوں ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ آخر لکھنؤ سے خط آیا کہ جمال کے والد پر فالج گر گیا ہے اور حالت نازک ہے۔

ہم سب جیسے بیٹھے تھے۔ ویسے ہی اٹھے چلے گئے۔ لیکن ہمارے پہونچنے سے پہلے ہی وہ اس دار فنا کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ جمال کا برا حال تھا۔ اسے اپنے والد سے غیر معمولی محبت تھی۔ ان کے انتقال سے جمال کی مشغولیت میں اضافہ ہوگیا۔ کیونکہ جائداد کا کام اب اسے خود دیکھنا تھا۔ اب گھر میں وہی سب کا مربی تھا۔ اس کی آزادی تکلیف دہ حد تک محدود ہوگئی۔ گویا ایک قدرتی دریا کو جو مظاہر فطرت سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا بہہ رہا تھا پختہ نہر بنادیا گیا۔ جمال جیسے لاابالی طبیعت رکھنے والے کو جو تکلیف ہونا چاہئے ظاہر ہے۔ وہ اب کافی سنجیدہ اور متفکر رہنے لگا تھا۔ مجھے افسوس ہوتا تھا کہ مجھ سے اس کا دل نہ بہلتا تھا۔

ایک روز شام کو جمال گھوم کر لوٹا تو پیشانی پر شکن تھی جو خیالات کی گہرائی کی شاہد تھی۔ ہونٹ خشک تھے اور ان کو وہ زبان سے نم کرنا بھول گیا تھا۔ صندلی رنگ مائل بہ زردی تھا۔ آنکھیں ایک زخمی ہرن کی آنکھوں کی طرح اظہار بےبسی کر رہی تھیں۔ باتوں کا جواب ملتا تھا مگر بہکا بہکا سا میں سمجھ گئی کہ دل پر کوئی تازہ چوٹ لگی ہے۔

"کس کو دیکھ لیا؟" میں نے خوش مزاجی کے ساتھ دریافت کیا۔ وہ گھبرا گیا۔

"کسی کو نہیں"۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ مغموم ہوگیا۔ جیسے چراغ کی لو ہوا کے جھونکے سے بھڑک کر پھر مستقل ہوگئی ہو۔ وہ جب مغموم ہوتا تھا تو اس کے حسن کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ میں تھوڑی دیر تک تو اسے حریصانہ نگاہ سے دیکھتی رہی اس کے بعد از سر نو اصرار شروع کیا۔

بڑی منتوں کے بعد آخر کار اس نے بتانا شروع کیا کہ

"آج میں غلطی سے نوشابہ کے مکان کی طرف سے گذر رہا تھا کہ سامنے وہ غارتگر ہوش نظر آگئی — اور — امید کے خلاف متوجہ تھی اور مائل بہ کرم — میں تڑپ جانے پر مجبور تھا۔ میں اگر اسے نہ دیکھوں تو اس سے بے نیاز رہ سکتا ہوں۔ لیکن اگر وہ سامنے ہو اور نگاہ بندہ نواز کے ساتھ۔ تو پھر میں اپنا نہیں رہتا۔ اسی خطرے کے خیال سے میں نے ادھر سے نکلنا بھی ترک کر دیا تھا — لیکن آج — آج —"

وہ چپ ہوگیا۔ اسے واقعی دلی تکلیف تھی۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا ساتھ ہی مجھے حیرت بھی تھی کہ اس نے نوشابہ کو کہاں سے دیکھ لیا۔ کیا یہ حسن جمال کے تخیل کی کارفرمائی تھی؟ لیکن اکدم میری سمجھ میں بات آگئی۔

"اچھا تو کیا آپ نوشابہ سے ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے بیساختگی کے ساتھ سوال کیا۔ گویا سارے امکانات عالم میری ہی مٹھی میں تھے۔ اس نے گہری نگاہ سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں" اس نے طے کرتے ہوئے کہا۔ اور باہر چلا گیا۔ میں سوچ میں پڑ گئی۔

اس واقعہ کے چوتھے روز شکیلہ خود میرے گھر آئی۔ ہم دونوں دیکھتے ہی ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اور بڑی دیر تک روتے رہے۔ گھر میں مہمان تھے۔ اس لئے کوئی مفصل گفتگو نہ ہوسکی اور مفصل گفتگو میں ابھی چاہتی بھی نہ تھی۔ میں پریشان تھی کہ اس سے کیا کہوں۔ خاصکر جب اس نے انتہائی سادگی اور بےتکلفی کے ساتھ کہا۔ "لاؤ تمہارے شوہر کی تصویر کوئی ہو تو دکھاؤ۔" تو مجھ پر جیسے بجلی گر گئی۔ اسوقت تو میں نے یہ کہکر ٹال دیا کہ "ابھی موجود نہیں" لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مستقبل میں کیا کرونگی۔ سب سے بڑا ڈر یہ تھا کہ کہیں جمال پر اس کی نظر نہ پڑ جائے۔ مگر اس روز شکیلہ کو بھی جلدی تھی۔ میں نے بھی جانے کی اجازت دیدی لیکن مفصل ملاقات کے لئے ایک دن مقرر کر دیا۔

شکیلہ کو اس مرتبہ دیکھ کر سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ لوگوں کی پیشین گوئی کے مطابق اب اس میں اور نوشابہ کی صورت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس سے میرے اس خیال کی بھی تصدیق ہوگئی کہ اس روز جمال نے شکیلہ ہی کو نوشابہ سمجھا تھا۔ میں خیالات میں ڈوب گئی اور امکانات کی وسعت پر غور کرنے لگی۔

میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ جمال آگیا۔ آج بہت عرصہ کے بعد وہ نسبتاً کچھ مسرور سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

"آج کون آیا تھا؟"

میں نے مسکرا کر اس کی نظر سے نظر ملائی۔ اور ایک منٹ کے وقفہ کے بعد جواب دیا۔

"نوشابہ"

اکدم اس کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔ اس کے بعد قدرے تبسم کے ساتھ کہا

"طعنے دیتی ہیں آپ؟"

"میں اور آپ کو طعنہ دوں گی! — توبہ کیجئے! — یقین نہیں؟ — اچھا بتائیے آپ نوشابہ سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"دیکھئے یہ چھیڑ تکلیف دہ ہے اور خطرناک!" اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا آپ شکیلہ سے ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے ذرا شرافت کے ساتھ پوچھا۔

"مجھ سے پہیلیاں کیوں بجھواتی ہیں آپ؟ بتا نہ دیجئے ٹھیک ٹھیک کہ کون آیا تھا؟" اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"نوشابہ کو آپ کیا جانیں"

"میں آپ سے زیادہ جانتی ہوں — وہ میرے ساتھ پڑھ چکی ہے"۔

"اچھا بتائیے نوشابہ کون ہے؟"

"نوشابہ وہی ہے جس کو میں شکیلہ کہتی ہوں — یا یوں کہئے کہ شکیلہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ جسے آپ نوشابہ کہتے ہیں"

"یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟"

"اسی طرح جسطرح اور باتیں ہوتی ہیں"

"اچھا آپ کہتی تھیں کہ شکیلہ محبت کرتی ہے"

"میں اب بھی یہی کہتی ہوں"

"لیکن نوشابہ تو مجھ سے نفرت کرتی تھی"

"آپ نے پہلی غلطی یہ کی کہ شکیلہ کو نوشابہ سمجھا — اور اس سے بڑی یہ کہ اس کی ذہنیت کو نہ سمجھے"۔

"کیا معلوم؟ انہیں کے ایک ملازم سے نام معلوم ہوا تھا اب وہ کمبخت بھی نہیں رہا جس سے دوبارہ جا کر پوچھوں۔ لیکن یہ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی"

"معلوم ہوا کہ عورت کی فطرت کے متعلق آپ کو قطعی علم نہیں"

"نہیں اس معاملہ میں مجھ سے غلطی نہیں ہوسکتی"۔

"اچھا تو بتائیے مجھے آپ سے محبت ہے یا نہیں — نہیں معلوم؟ وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی۔ اچھا تو یہ بتائیے کہ آپ میری شکیلہ یا اپنی نوشابہ سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم"

"اب آپ کو کچھ نہیں معلوم؟ — آپ شاید مجھ سے ڈرتے ہیں۔ اچھا پرسوں دس بجے رات کو — لیکن شرط یہ ہے کہ زبان سے لفظ "نوشابہ" نہ نکلے — خبردار"

شکیلہ مقررہ دن ساڑھے آٹھ بجے رات کو آگئی۔ تنہائی اور خلوت کا پورا انتظام تھا۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں لیکن میں نے اپنی شادی کا راز اسے قطعی نہ بتایا۔

"اچھا شکیلہ!" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔" اب تم ہمیں اپنی داستان سناؤ — اسکول کا کیا رنگ ہے؟ تمہارا دیوتا تمہیں نظر آتا ہے یا نہیں؟ معاملات کہاں تک پہونچ چکے ہیں"

اس نے میری طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کر کہا" بجھتی ہوئی آگ پر تیل کیوں چھڑکتی ہو؟ دکھے ہوئے دل پر نمک پاشی نہ کرو۔ تم کو کیا معلوم کہ مجھ پر کون کون سی حالتیں گذر گئی ہیں۔ تم کو میری کیا فکر؟ ایک مجروح محبت کی غم بھری داستان سننا گناہ ہے"

اس کے الفاظ میرے دل میں چھد رہے تھے اس کی بھرائی ہوئی آواز رگ جان پر چھری پھیر رہی تھی۔ میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"دیکھو شکیلہ میرے دل کو نہ دکھاؤ۔ تم خوب جانتی ہو کہ میں تم سے ملنے کے لئے کسقدر بیچین تھی — مجھے اور تمہیں جو مجبوریاں جدا کئے رہیں کیا تم ان سے بے خبر ہو؟ — تم کو ابھی معلوم نہیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں"

اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

"دیکھو رونا نہیں۔ آج کے جیسے مبارک دن آنسو بہانا نازیبا ہے"

"مبارک دن!!" وہ زہرخند کے ساتھ بولی۔" میری قسمت میں جتنے مبارک دن تھے سب ختم ہوگئے۔ ابتو صرف موت کے مبارک دن کا انتظار ہے"۔

"اچھا یہ بتاؤ" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "کیا تمہیں اب بھی اپنے اس نامعلوم پر تم سے محبت ہے؟ — جو بقول تمہارے

تم سے محبت نہیں کرتا۔"

اس نے نگاہیں دوسری طرف کرلیں اور خاموش ہوگئی۔

"ادھر دیکھو!" میں نے کہا اور اس کی ٹھوڑی پکڑ کے اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں۔ اس کے سیاہ دیدے آنسوؤں میں تیر رہے تھے ——— دیکھتے ہی دیکھتے وہ دو لبریز جام چھلک پڑے۔ اس نے چہرہ پھر جھکا لیا۔ میرا دل کراہا۔ لیکن میں نے اس کراہ کو لبوں تک نہ آنے دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔" میں نے کچھ توقف کے بعد پوچھا "تم انہیں دیکھو گی؟ ——— ان سے ملاقات کرو گی؟"

اس نے پہلے حیرت اور پھر ایک کڑوے تبسم کے ساتھ مجھے دیکھا۔ وہ سمجھ رہی تھی۔ کہ میں اس سے مذاق کر رہی ہوں۔

"کیا تم مجھے جھوٹا سمجھتی ہو؟" میں نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

"نہیں" اس نے جواب دیا "لیکن میں اب ان سے مل کر انہیں تکلیف پہونچا کر کیا کروں گی؟" اللہ اللہ کیا حسرت تھی!

میں نے بات کاٹ کر ذرا ترش روئی سے کہا۔

شاید نوشابہ کا خیال تمہیں ستا رہا ہے! ——— لیکن وہ تمہاری صرف خیال آرائی تھی۔ اب میں حقیقت سے واقف ہوگئی ہوں۔ اس کے علاوہ اب تم خود بھی تو نوشابہ ہی ہو۔ تم نے آئینے کو غور سے نہیں دیکھا!" یہ کہتے ہوئے میں نے آئینے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرا ہاتھ روکتے ہوئے کہا "سبھی لوگ یہ کہتے ہیں ——— مگر کیا صورت کے ساتھ قسمت بھی بدل جاتی ہے؟ ——— کاش ——— "

"کیا علم قیافہ پر تمہیں اعتبار نہیں؟"

"جتنے علم ہیں سب جھوٹے ہیں"

"اچھا خیر!" میں نے پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا "اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تمہیں ان کی ہر خطا سے چشم پوشی کرنا چاہئے۔ محض ایک غلط فہمی پر ناراض ہوجانا یہ تو محبت کے شایانِ شان نہیں"

"ناراض! ——— مجھے ناراض ہونے کا حق ہی کیا ہے؟"

"اچھا تو اپنے آنسو پونچھو۔ لبوں پر مسکراہٹ لاؤ ——— دس بجے وہ آئیں گے۔ تمہیں غمگین دیکھ کر ان کا دل دکھے گا۔ کیا ان سے ملنے کی امید تمہیں خوش نہیں کرسکتی؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——— آخر یہ سب اور آپ کے گھر پر کس طرح ممکن ہے؟"

"دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ سب سمجھا دوں گی۔ لیکن ابھی نہیں ذرا صبر کرو"

وہ خاموش ہوگئی غالباً اسے میری بات پر یقین نہیں آیا۔ لیکن اس کا اضطراب بڑھ رہا تھا اور اس کی نظر بار بار گھڑی پر پڑ جاتی تھی۔ میں اس سے برابر باتیں کرتی رہی۔ پرانے قصے دہرا دہرا کر اس کے جذبات کو جگاتی رہی۔ تاکہ جذبات اسقدر بڑھ جائیں کہ رقابت کا جذبہ بھی فنا ہوجائے۔ گویا میں "بین" پر افسانہ محبت کو گا گا کر ایک ناگن کو مست کر رہی تھی۔

شکیلہ باتیں کرتے کرتے رک گئی اور گھبرا گھبرا کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ جمال کھڑا مسکرا رہا تھا۔ شکیلہ کو دیکھ کر وہ بیخود تھا وہ "بےحس نوشابہ" کی بجائے "با محبت و مضطرب نوشابہ" کو دیکھ کر محو حیرت تھا۔ حالانکہ نظر ملتے ہی شکیلہ کا سر جھک گیا تھا۔ لیکن اس کی گردن کے خم کا انداز شرم کا پتہ دیتا تھا۔ گریز کا نہیں۔ جمال بھی سرشار رہتا اور پُرشوق۔ امید بھری نظروں سے شکیلہ کو گھور رہا تھا۔ مجھ سے وہ اس قدر غافل تھا جیسے میرا وجود ہی نہ ہو۔ جمال نے ہمہ تن شوق اور سراپا محبت بن کر کہا۔

"نوشابہ! اپنی محبت کے مارے جمال پر آخر تمہیں ترس آ ہی گیا!!"

میں نے دانتوں میں انگلی داب لی۔ شکیلہ نے تڑپ کر میری طرف پرغضب نگاہوں سے دیکھا۔ میں ایک مجرم کی طرح سہم گئی۔ جمال کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ اسے محض ایک ادا سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شکیلہ نے بھی جمال کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ لیکن جب آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تو کہا۔

"میں نوشابہ نہیں ہوں۔ میں منحوس شکیلہ ہوں۔ تم مجھے یوں نہ گھورو۔ میری طرف سے اپنی نگاہیں پھیر لو" وہ یہ کہتی ہوئی قریب کے کمرے کی طرف چلی۔ جمال تڑپ اٹھا۔ اور اس کی منتیں کرتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

"تم کچھ بھی ہو۔ تمہارا نام کچھ بھی ہو۔ مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں ــــــ دیکھو کیا تمہیں میری نگاہوں میں محبت نظر نہیں آتی؟ کائنات کا ذرّہ ذرّہ گواہ ہے کہ میں نے ہمیشہ انہیں رنگین۔ عرق آلود آنکھوں سے محبت کی ہے۔ ہمیشہ انہی نازک نازک لبوں سے لفظ محبت سن لینے کے لئے تڑپا کیا ہوں۔ ہمیشہ انہیں سیاہ سیاہ پیچیدہ زلفوں میں میرا دل الجھا رہا ہے..."

جمال اسی قسم کی باتیں کرتا رہا شکیلہ نے کمرے کے اندر پہونچکر دروازہ میں کنڈی لگالی۔ ادھر دروازہ بند ہوا اُدھر جمال بل کھا کر دروازے کے پردہ سے لپٹ گیا۔ پردہ ٹوٹا اور پردہ کے ساتھ وہ خود بھی فرش پر آرہا۔ میں دم بخود بیٹھی ہوئی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ میرا سارا کھیل بگڑ گیا تھا۔

آخر میں اٹھی اور دوسرے دروازے سے شکیلہ کے پاس گئی۔ وہ تخت پر منہ لپیٹے پڑی سبکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر بٹھا دیا اور طنز کے تلخ ترین لہجہ میں کہا۔

"یہی آپ کو محبت کا دعوےٰ تھا؟ محبت اسی کو کہتے ہیں؟ تمہاری ہی جیسی لڑکیاں محبت کو بدنام کرتی ہیں۔ تم نے رقابت کی انتہا کر دی۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہارا غرور جمال کی جان لے کر رہے گا۔ــــ اب آج سے تم میرے سامنے یہ نہ کہنا کہ مجھے جمال سے محبت ہے یا تھی"۔

اس کو میرے الفاظ سے بڑی چوٹ لگی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"میں گنہگار ضرور ہوں۔ لیکن اس پھٹکار کی مستحق نہیں۔ آپ نے دیکھا مگر سمجھا نہیں کہ وہ ان محبت بھری پرشوق نظروں سے مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ بلکہ مجھ سے کوسوں دور نوشابہ کو۔ ان کی نگاہیں میرے دل تک نہ پہونچتی تھیں۔ بلکہ میری جلد سے ٹکرا کر کہیں اور چلی جاتی تھیں ان کا دل میرے دل کو اجنبی تصور کرتا تھا۔ ان کی روح میری روح کو غیر مانوس سمجھتی تھی۔ وہ نوشابہ کے دل نوشابہ کی روح کی تلاش میں تھے وہ میری صورت سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ میرے دل میں نہ اُترتے تھےــــ جب تک دل نہ ملیں روحیں ایک دوسرے میں سما نہ جائیں۔ اس وقت تک "محبت" محبت نہیں ہوتی"

بات وہ معقول کہہ رہی تھی۔ لیکن میں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا "تم غلط کہتی ہو۔ تمہیں ایسا اس لئے محسوس ہوا کہ نوشابہ کے متعلق تمہارے خیالات قائم ہو چکے تھے۔ یہ صرف ناموں کا الٹ پھیر ہے۔ میں تمہیں بتاچکی ہوں کہ انہوں نے تمہارا نام معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن تمہارے ملازم نے بجائے تمہارے نوشابہ کا نام بتا دیا۔ افسوس ہے کہ تمہاری محبت اتنی سی غلط فہمی سے نفرت میں بدل گئی۔ کیا تم نے انہیں یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ تمہارا نام جو کچھ بھی ہو۔ مجھے تم سے محبت ہے؟"

اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ابھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"اگر تمہیں ان سے محبت نہیں رہی تو جانے دو۔ میں شرمندہ ہوں کہ اتنی مصیبت اٹھا کر میں نے تمہاری آرزو کو پورا کرنے کی کوشش کی میں تم سے شکایت نہ کروں گیــــ لیکن ذرا اس پر غور کر لو۔ کہ ایک ہستی ایسی بھی ہے جو یہ جاننے کے باوجود جمال سے محبت کرتی ہے۔ کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ اگر وہ جمال سے شادی کر لے تو تم اس سے نفرت نہ کرنا نہ جمال کو مجرم قرار دینا"۔

آخری فقرہ کہتے کہتے میں لرز گئی۔ اس نے نظر جھکا لی۔ میں وہاں سے یہ کہتی ہوئی چلدی کہ

"اچھا میں جاتی ہوں جمال کی خبر لوں ـ وہ بیہوش ہو کر گر گیا تھا۔ خدا جانے کس حال میں ہو۔ تمہارا دل تو پتھر ہو گیا"۔

جمال کے پاس آئی تو دیکھا کہ وہ بیہوش نہ تھا بلکہ بے حس و حرکت فرش پر کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کسی خیال میں مستغرق تھا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہاــــ بالکل ہی بیماروں کی آواز میں۔

"دھوکے کو میں نے پھر دھوکا نہ سمجھاــــ کسقدر نادان ہوں!"

"جی نہیں۔ دھوکا نہیں"۔ میں نے ذرا سختی کے ساتھ کہا۔" بلکہ آپ نہ "نوشابہ" بھولیں گے نہ "شکیلہ" آپ کو یاد ہوگا۔ حالانکہ پوری طرح میں نے سمجھا دیا تھا۔ بجائے شکیلہ کے نوشابہ سنکر وہ بدگمان ہو گئی اور وہ حق بجانب تھی"۔

وہ بھی خاموش بیٹھا رہا۔ میں بھی چپ رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ شکیلہ بھی میری بیٹھ کے پیچھے آکر بیٹھ گئی۔ اب بھی اس کو کبھی کبھی سسکیاں آجاتی تھیں۔ میں نے مڑ کے اس کی طرف دیکھا اس نے

اپنی اشک آلود آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ کیا مجھے معاف کیا جاسکتا ہے؟" دونوں طرف خاموشی تھی۔ میں وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا تو وہ دونوں میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول تھے۔ وہ محبت کرنے والے دلوں کی پہلی ملاقات اور پہلی گفتگو کسقدر دلکش اور سہانی ہوتی ہے۔

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں سر سے پیر تک لرزہ براندام تھی ابتک میں نے انتہائی ہمت سے کام لیا تھا۔ لیکن اب ہمت جواب دے رہی تھی۔ میں نے طے کیا تھا کہ ان دونوں پروانوں کو ایک دوسرے میں مست چھوڑ کر کہیں چلدوں گی۔ کہاں جاؤں گی۔ کیا کروں گی۔ یہ مجھے خود معلوم نہ تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی ہمت کو جگایا۔ میں نے دل کو سمجھایا کہ انسان دوسروں کے لئے جیتا ہے اپنے لئے نہیں۔ اپنے ضمیر کی تشفی کی خاطر انسان کو بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئیے۔

میں فوراً کرسی کو میز کے قریب گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور ایک خط شکیلہ کے نام دوسرا جمال کے نام لکھ کر لفافوں میں نام لکھدیئے۔ لفافوں کو بند ہی کر رہی تھی کہ کمرے کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھی اور غلام گردش کو طے کرکے بیرونی دروازے کو کھول کر کھڑی ہو گئی رات اندھیری اور سنسان تھی۔ سامنے سے ایک کالی گھٹا اٹھ رہی تھی۔ سر پر تارے چمک رہے تھے۔ باغ میں نرم ہوا چل رہی تھی جس سے پتوں اور شاخوں میں ہلکی ہلکی جنبش ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ مجھے جانے سے منع کر رہی ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سوچا کہ مجھے جلدی کرنا چاہئیے۔ اسوقت جبکہ ایک انسانی زندگی برباد ہو رہی تھی مظاہر فطرت اپنے پورے حسن پر تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آخر میں آنسوؤں کو بہنے کی اجازت دے کر کلیجہ پر پتھر رکھ کر دروازے سے نکل پڑی لیکن اس سے پہلے کہ تاریک رات شفقت مادرانہ کے ساتھ مجھے اپنی آغوش میں چھپالے کسی نے پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں سہم گئی۔ اس کے بعد ہی اس تاریک اور سنسان فضا میں ایک نازک آواز بلند ہوئی اور اس نے چلاکر کہا۔

"بانو۔ تم کہاں جاتی ہو؟"

یہ شکیلہ کی آواز تھی۔ میں نے ہاتھ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کمر سے لپٹ گئی۔ جمال بھی آگیا اور وہ دونوں مجھے گرفتار کرکے مکان کے اندر واپس لے گئے۔ میں رو رہی تھی۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہو رہا تھا کہ شکیلہ خلاف امید بہت مسرور معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ظریفانہ انداز میں کچھ کہنا چاہتے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ سب باتیں نمائشی ہیں۔ اور محض درد و غم کی پردہ پوشی کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی ہے۔ اور اس لئے بھی کہ میری دل شکنی نہ ہو۔ جمال بالکل خاموش تھا۔ کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا گرد و پیش سے بے خبر متعلقات سے بے نیاز۔ شکیلہ اکدم ظریفانہ انداز میں بول اٹھی۔ میں چونک گئی۔ اس نے کہا "ہاں تو اس وقت آپ باغ کی سیر کو جا رہی تھیں؟ — اسقدر اندھیری رات میں باغ نہ جایا کیجئے ——— اور پھر تنہا!!"

میں بالکل خاموش رہی۔ وہ پھر کہنے لگی۔

"اچھی بانو! تم نے سنا؟ —— جس لڑکی کا ذکر ابھی ابھی تم نے مجھ سے کیا تھا معلوم ہوا کہ اس نے جمال سے شادی کر لی۔ میری طرف سے اسے مبارکباد دیدینا"۔

میں بے چینی کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر سکون کے ساتھ جواب دیا۔

"لیکن تم نے یہ بھی سنا کہ اس کی شادی جمال سے کس طرح ہوئی۔ اور وہ تمہارے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار تھی۔ یہ خط جو تم لئے ہو اس کو شاید ابھی تم نے نہیں پڑھا"

"اچھی طرح پڑھ لیا ورنہ میں آپ کو گرفتار کسطرح کر پاتی؟ —— اب میں آپ کو ہمیشہ کے لئے اس مکان میں نظربند کرتی ہوں اور جمال کو آپ کا نگراں مقرر کرتی ہوں۔ کبھی کبھی میں دیکھنے آیا کروں گی"

مجھے اس کی بے محل ظرافت پر تعجب بھی ہو رہا تھا۔ اور غصہ بھی آرہا تھا۔

"صاف صاف باتیں کرو شکیلہ!" میں نے کہا۔ "تم جمال سے محبت کرتی ہو اور جمال تم سے۔ میں تم دونوں کے درمیان دیوار کی طرح حائل کر دی گئی ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ مجھے تم جانے دو ورنہ زندگی بھر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا —— شکیلہ! ضمیر کی آسودگی کے بغیر زندگی عذاب ہو جائے گی"

"لیکن میرے پاس بھی تو ضمیر ہے!" اس نے انتہائی درد کے ساتھ کہا۔ اور اب اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"بانو" وہ کہتی رہی۔ "میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ تم کچھ خیال نہ کرو۔ میں سچے دل سے کہتی ہوں کہ مجھے تم سے قطعی شکایت نہیں اور میں صورت حال کو پوری طرح سمجھ گئی ہوں۔ تم نے جو کچھ کر سکتی تھیں کیا۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ تمہارے ضمیر کی تشفی ہو گئی۔ اب میرے ضمیر کو بھی مجروح نہ کرو ——— اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں خودکشی کر لونگی۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں برابر آیا کروں گی۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہئے۔ محبت کو ناکامی ہی سے دوام حاصل ہے"

اس کی ظرافت ختم ہو گئی تھی۔ وہ سنجیدہ ہو کر آبدیدہ ہو گئی تھی اب وہ جمال سے مخاطب ہو کر بولی۔

"اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو میری بانو کا خیال رکھئے گا۔ اس نے ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے اس نے ہماری محبت کو ہمیشہ گی بخشدی ہے۔ ذرا میری موٹر دروازے پر لگوا دیجئے اور مجھے سوار کرا دیجئے۔ بہت رات گئی ہے۔ انشاءاللہ پھر آؤنگی"۔

میں نے کہا۔ "شکیلہ اس قصہ کو طے نہ سمجھو۔ میں تمہارے فیصلہ پر عمل کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ میں تمہیں اس وعدے پر جانے دوں گی کہ کل ہی تم پھر آؤ۔ تاکہ تم سے مفصل طور پر باتیں کر کے اپنا نقطۂ نظر تمہیں سمجھا دوں کل ہی آخری فیصلہ ہو گا"۔

اس نے کچھ سوچا۔ اس کے بعد بولی۔ "اچھی بات ہے میں کل آؤں گی۔ ضرور آؤنگی"۔

اس کے بعد وہ مجھ سے بغلگیر ہو گئی۔ ہم دونوں رو دیئے۔ ہم اور جمال اسے دروازے تک پہونچانے گئے۔ ڈرائیور اتفاق سے کہیں چلا گیا تھا۔ ہم لوگوں نے کہا کہ "ذرا اور انتظار کر لو شاید آجائے" لیکن اس نے نہ مانا۔ "بہت رات ہو گئی ہے"۔ اس نے کہا۔ اب میں رک نہیں سکتی۔ مجھے خود "ڈرائیو" کرنا آتا ہے۔ ڈرائیور جب آجائے تو اسے بھیجدیجئے گا"۔ ہم لوگوں نے اسکی مخالفت کی لیکن وہ فوراً "جاکر" "اسٹرنگ" پر بیٹھ گئی۔ اس نے "سلف" لگایا ہی تھا کہ ڈرائیور آ گیا۔ ہمنے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ "لو ہٹو ڈرائیور آ گیا" اس نے کہا۔ "تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مجھے موٹر چلانا نہیں آتا"۔ یہ کہکر اس نے ڈرائیور کو پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور کھٹ سے نکل گئی۔ ہم لوگ حیران کھڑے رہ گئے

شکیلہ کے چلے جانے کے بعد میں نے اس دن کے واقعات کا تجزیہ شروع کیا۔ ایک ایک کر کے کل واقعات میرے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ شکیلہ نے مجھے متحیر کر دیا تھا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ طفلانہ خصلت شکیلہ اسقدر جلد اتنی سمجھدار ہو گئی ہے۔ وہی نازک مزاج شکیلہ جو ذرا سی دلشکنی اور ذرا سی ناامیدی پر رو دیا کرتی تھی۔ یا جھنجھلا پڑتی تھی اس نے اسقدر زبردست قوت برداشت کا مظاہرہ کس طرح کر لیا۔ شاید نازک ہستیاں ہی سب سے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ میں اسی قسم کے خیالات میں منہمک تھی۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ جمال بھی اسی طرح خیالات میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ گھڑی کی ٹک ٹک سے کان پھٹنے لگے۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جمال بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا اور خواب میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اکدم وہ چیخ پڑا۔ میں سہم گئی۔

"کیا بات ہے" میں نے قریب جا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ——— کچھ نہیں"۔ اس نے کہا اور نڈھال ہو کر لیٹ گیا

اس کے سینے کا زیر و بم اس کے دل کی دھڑکن کا پتہ دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کی دھڑکن کانوں سے سنائی دینے لگی۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ ہم دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔ میں بیٹھی رہی اور مجھے نہیں معلوم کہ کب تک بیٹھی رہی ——— جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ جمال میرے سر کو اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے غور سے چہرہ دیکھ رہا ہے۔ میں نے گردن موڑ کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے تین بجے تھے۔ جمال نے میرے چہرے کو پھر اپنی طرف کر لیا اور کہا۔

"میں نے خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں خودکشی کرنے کی نیت سے دریا کی طرف جا رہا ہوں۔ اس کے کنارے پہونچکر میں نے پانی کی سطح کو دیکھا اس میں مجھے شکیلہ کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ابھی یہاں نہ آؤ۔ پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ چلو میں بانو کے پاس تمہیں ملونگی میں گھر لوٹ آیا تم پر جو نظر ڈالی تو تم بالکل شکیلہ کیطرح نظر آئیں ——— یہی بہت دیر سے غور کر رہا ہوں کہ تم شکیلہ ہو یا بانو"۔

میں نے چپ چاپ اس خواب کو سنا اور چپ ہی رہی۔ صبح یہ خبر

نواب آصف الدولہ کا مرغ خانہ

(از خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

نواب آصف الدولہ کو مرغ بازی اور ہاتھی کی جنگ کا بیحد شوق تھا۔ اور ان کے عہد میں فیل خانہ اور مرغ خانہ قابل دید تھا۔ مرغ خانہ مشک گنج کے قریب ایک بڑی عمارت میں تھا۔ اور بڑے بڑے نامی مرغ باز اسمیں نوکر تھے اس کا خرچ ہزار روپے کا تھا۔ بڑے بڑے والیانِ ملک اسے دیکھنے آتے۔ مرغ خانہ ایک بہت بڑی کوٹھی میں تھا۔ اور ہر ایک مرغ باز کے متعلق صرف پانچ پانچ مرغ تھے۔ مرغ مختلف النسل تھے۔ ہر مرغ باز کا فرض تھا کہ اپنے اپنے مرغ کی نسل کی مرغیاں حاصل کرائے اس لئے ضرور سال بھر میں صرف دو انڈے لیکر دو بچے حاصل کرے کیونکہ مرغ کی عمر دس برس کی تجویز کی گئی تھی۔ مرغ کو جنگ کے واسطے تیار کرنا بھی ایک جدا فن تھا۔ جسوقت مرغ دو برس کا ہوتا تھا تو اُسے جنگ میں پیش کرتے تھے۔ اور جب سال بھر سے کم کا ہوتا تھا اور اذان دینے لگتا تھا اُسے مرغیوں سے بچاتے تھے۔ اور اگر فربہ ہوتا تو جلاب دے کر دُبلا کرتے۔ نحیف ہوتا تو کچے انڈے کی زردی روغنِ بادام شہد میں کھلاتے اور روغنی روٹی کی گولیاں بنا کر کھلاتے پھر نہایت صاف چاندنی بچھا کر ایک انیلا مرغ اُس کے سامنے فرش پر لاتے اور دو چار پالی کرتے۔ مہینے میں دو ایک بار یہی شغل جاری رہتا۔ جب اس کے خار نکل آتے تو اسپر لوہا چڑھا دیتے پھر نواب سے عرض کرتے کہ حضور ہمارے پاس ایک مرغ تیار ہے۔ پچاس مرغ باز اس خدمت پر ملازم تھے۔ گرمی کے زمانے میں اُنکو ٹھنڈے پانی سے نہلاتے تاکہ گرمی نہ معلوم ہو اور سردی کے زمانے میں دس بجے تک دھوپ کھلاتے۔ اس کے بعد پانی میں کچھ دوائیں ڈال کر نیم گرم پانی سے نہلا کر کچھ غذا کھلا کر ٹاپے کے اندر کر دیتے ہر فصل اور موسم میں مرغ کو روزانہ نہلاتے تھے۔ اور صاف کپڑے سے پوچھ کر اُنکو غذا دیتے بعض مرغ جو جوانی میں گرمی سے زیادہ پریشان ہوتے تھے انہیں دن میں دو دفعہ نہلا کر غذا دیتے تھے۔ نواب آصف الدولہ بہادر خود تامجان میں سوار ہو کر مہینے میں ایک مرتبہ ضرور اُن کا معائنہ کرکے مرغ بازوں کو مناسب ہدایتیں کرتے تھے مرغ خانہ ایک محلہ تھا جو آج تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے اُس کے چاروں طرف مرغ باز رہتے تھے جنکی پرورش اس پیشہ کی بدولت تھی۔

باہر کے زمیندار وغیرہ آتے تھے اُنکی خواہش یہی ہوتی تھی کہ جسطرح ممکن ہوسکے نواب آصف الدولہ کا مرغ خانہ اور فیل خانہ دیکھ لیں بہت رشوتیں دے کر بہت سفارشیں اٹھوا کر مرغ خانہ کی زیارت نصیب ہوتی تھی اس مرغ خانہ میں طرح طرح اور نسل نسل کے ہزاروں قسم کے مرغ تھے جو عالم شباب سے گزر جاتے تھے۔ اُن سے انڈے لے کر بچے لئے جاتے تھے ان سے انڈے لینے کے بعد جنگ کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ ایک مکان کے روشن حصہ میں صاف اور سفید فرش بچھا ہوتا تھا جسے اکھاڑہ کہتے تھے جسپر مرغ ٹہلائے جاتے تھے۔ جب کوئی مرغ کسی بیماری میں مبتلا ہوجاتا تھا تو شفاخانہ میں بھیجدیا جاتا تھا۔ شفاخانہ مرغ خانے کے قریب اور مریض مرغ اس میں رہتا تھا۔ معمولی بیماری ہوتی تو مرغ باز اُس کا علاج کرتے اور اگر کوئی بیماری سخت ہوتی تو حکیم مرزا علی بہادر علاج کے واسطے بلائے جاتے جو مرغ خانے کے شفاخانہ کے ملازم تھے جیسے رتوندی۔ فالج۔ درد گردہ وغیرہ میں مبتلا ہوتا حکیم مرزا علی بہادر پہلے مرغ باز تھے۔ مرغوں کا علاج کرتے کرتے حکیم بن گئے اور بڑا تجربہ انہیں اس بارے میں حاصل تھا ابتدا میں ایک مرغ باز نوکری کی تلاش میں لکھنؤ آئے تو اُنہیں معلوم ہوا کہ نواب صاحب کا مرغ خانہ دنیا میں ایک ہے اور پچاس مرغ باز اس سرکار میں نوکر ہیں تو مرغ خانہ دیکھنے کا بڑا شوق ہوا۔ بہت کوشش کی ناکام رہے ایک دن قسمت سے مہاراجہ ٹکیت رائے کے دربار تک رسائی ہوئی۔ بچارے رو رو کر اپنی

غربت کا حال کہنے لگے۔ کہ بندیل کھنڈ کے راجہ کے یہاں مرغ بازوں میں نوکر تھا۔ نام تخنیف میں آیا ہے۔ مدت سے لکھنؤ دیکھنے کا شوق تھا۔ یہاں دو مہینے سے پڑا ہوا ہوں۔ نواب تک پہنچنا تو کجا کوئی مرغ خانہ بھی دکھائی نہیں دیتا شاید حضور کی توجہ سے یہ آرزو پوری ہو جائے۔ مہاراجہ کی کوشش سے انہیں مرغ خانہ دیکھنا نصیب ہو گیا۔ دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں۔ عملہ والوں سے ملے ان کے جاہ احتشام کو دیکھا۔ اُن کی سواریاں دیکھیں۔ سازوسامان دیکھا۔ سفید پوشاکیں دیکھیں۔ خرچ دیکھے۔ دل میں کہنے لگے اللہ اللہ جس کے ادنےٰ نوکروں کی یہ شان ہے اس کے مالک کا کیا پوچھنا اس سرکار میں تو دولت کا مینہہ برس رہا ہے۔ لالچ آیا کہ کسی طرح نواب آصفؔ الدولہ کے دربار تک رسائی ہو جائے تو کیا پوچھنا ہے۔ مگر ہم ایسے مسافروں کی رسائی کہاں ممکن ہے۔ مہینوں مہاراجہ کی خدمت میں حاضری دی۔ ایک دن دبی زبان سے یہ بھی عرض کیا۔ آپ کی بدولت مرغ خانہ تو دیکھ لیا۔ مگر ایک دل میں حسرت باقی رہ گئی۔ مہاراجہ نے پوچھا وہ کیا۔ عرض کیا نواب کی قدمبوسی کی آرزو باقی ہے۔ فرمایا یہ مشکل کام ہے۔ نواب کے دربار کے لئے قواعد ہیں۔ آداب ہیں۔ ان کے تم متحمل نہیں ہو سکتے ابھی تم سے یہاں کے رئیسوں کا دربار نہیں دیکھا تو نواب کے دربار میں کیونکر جا سکتے ہو۔ عرض کیا اگر حضور توجہ فرمائیں تو احسان ہوگا۔ غرض کچھ منت وسماجت کی۔ مہاراجہ کو اُن کے حال پر رحم آ گیا۔ فوراً وعدہ کر لیا۔ اچھا موقع سے دیکھا جائے گا۔ ایکدن موقع پا کر انسے کہا کل آٹھ بجے سے درِ دولت پر حاضر رہنا دس بجے کے بعد تمہاری طلبی ہوگی۔ مرغ باز جن کا نام صفدر علی تھا بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز سویرے سے درِ دولت پر حاضر ہوئے۔ مرؔدہے کو اپنا نام بتایا۔ صبح سے بیٹھے بیٹھے گیارہ بجے تو مرؔدہے نے ہاتھ پکڑا اور درِ دولت میں لال پردہ اُٹھا کر عرض بیگی کے حوالہ کر دیا۔ اس نے ہدایت کی جیسا ہم کہیں اُسی تعلیم سے آداب بجا لانا۔

اب جو دوسرا پردہ اُٹھتا ہے تو کیا دیکھا کہ دو طرفہ زرق برق پوشاک پہنے ہوئے ایک ایک کرسی اعلےٰ مرتبہ کے لوگ رونق افروز ہیں۔ اور بیچ میں شہ نشین پر حضور اعلےٰ جلوہ فرما ہیں۔ سونے کا چتر لگا ہوا ہے مورچھل بردار مورچھل جھل رہا ہے۔

خدام خاص دست بستہ کھڑے ہیں۔ کسی کی طاقت نہیں جو آنکھ بھر کے دیکھ سکے سب خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُن کے بدن میں زلزلہ پیدا ہو گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ نیم قد ہو کر چلنے کا حکم ملا۔ دو آدمی پکڑے ہوئے تھے۔ عرض بیگی نے حکم دیا سات مرتبہ جھک کر سلام کرو چار و ناچار جھک کر نگہ نیچی کر کے سلام کیا اور نذر کی دو اشرفیاں دکھائیں جس پر حضور نے ہاتھ رکھدیا۔ زبان بند ہو گئی۔ منہ سے کچھ نہ بول سکے غش پر غش آنے لگے۔ مرؔدہے انکو الٹے پاؤں واپس لائے۔ درِ دولت سے باہر کر دیا مردے کی طرح ڈال دیا۔ جیسے گئے تھے واپس آ گئے۔ بہت شرمندہ ہوئے اور پھر جانے کی ہمت نہ کی۔ ناکام اپنے شہر واپس گئے۔ اور عمر بھر اپنی قسمت کا رونا رویا کئے۔

نواب کے ایک رفیق نے عرض کی حضور ایک مرغ باز دہلی سے آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر حضور حکم دیں تو جاؔوے سے مرغ لاؤں جو دنیا میں سب سے بہتر ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ جاوے کے مرغ ہمارے یہاں موجود ہیں۔ انہیں نے کہا کہ حضور وہ کہتے ہیں کہ جاوے کا جو کالے تالو کا ہوتا ہے وہی شیر مرغ کہلاتا ہے دہلی کے بادشاہوں کی سرکار میں تھا۔ ہر کسی کو اُس کی شناخت نہیں ہے میں خود خرید کر لایا تھا۔ فرمایا کیا مضائقہ ہے اس سے ہمارے واسطے کل مرغ منگاؤ اسے یہاں سے ہزار روپیہ مل گیا اور چھ مہینے میں واپس آیا اور چار مرغ چکلے چوڑے لا کر حاضر کئے بہت سا انعام ملا۔ وہ مرغ باز نوکر ہو گیا۔ اسوقت مرغ بازی کا طریقہ بہت خراب تھا۔ یعنی حضور عالی لڑائی کے مرغ کے کانٹے پر لوہے کا خول چڑھا دیتے تھے۔ اور اس زمانے میں یہی رواج تھا۔ کہ سب مرغ باز اپنے اپنے مرغ کے کانٹے پر لوہے کا خول چڑھا دیتے تھے جس سے کبھی کبھی مرغ ایسا زخمی ہو جاتا تھا کہ جانبری کی امید نہ رہتی تھی۔ مگر نواب آصفؔ الدولہ کی درگاہ میں ہر شخص کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ مرغ بازی کے لئے حضور میں درخواست کر سکے کہ مرغ لڑانا چاہتا ہوں۔

بلکہ خود سرکاری مرغ لڑائے جاتے تھے۔ اور سرکاری عہدہ دار اس میں تماشہ دیکھنے آتے تھے۔ جن رئیسوں کو مرغ کا شوق تھا وہ مرغ پالتے محض نواب کی خوشی کی غرض سے اور جب حکم ہوتا تھا اپنا مرغ مشق کرتے تھے۔ اور بعض نواب کے عزیز یہ شوق کرتے تھے کوئی مہینہ خالی نہ جاتا تھا

کہ مرغ بازی کا شغل نہ ہوتا۔ نواب عضد الدولہ شجاعت علی خاں مرزا جنگلی نواب مرزا فخر الدین حیدر نواب امیر الدولہ عرف مرزا اینڈو نواب مرزا انجم الدین حیدر نواب سالار جنگ نواب حسن رضا خاں صاحب۔ نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں ان سب کے یہاں مرغ پلے تھے اور ان کے بڑے بڑے کارخانے تھے۔ نواب امیر الدولہ کا کارخانہ محلہ کاظمین کے قریب منصور نگر سے آگے تھا۔ قریب سعادت گنج کے اور انکا مرغ خانہ بھی وہیں تھا۔ ایک روز حضور سے کہا۔ حضور میرے یہاں ایک مرغ تیار ہوا ہے حکم ہو اہم کو دکھاؤ۔ مرغ دیکھا فرمایا۔ ہمارے مرغ خانہ سے ایک مرغ پسند کرو حیدر بیگ خاں نے ایک مرغ اسیقدر قد کا اور اسی وزن کا انتخاب کیا۔ اور حضور سے عرض کیا فلاں مرغ اسی وزن کا تجویز کیا گیا ہے۔

آپ نے فرمایا اچھا ہے تو اگلی اتوار کو مرغ لڑے گا یہ شہرت تمام شہر میں پھیل گئی اور جو لوگ حضور میں حاضر ہوتے تھے اپنے اپنے سامان کرنے لگے۔ مرغ باز بھی اپنے مرغ کو تیار کر رہا ہے جب دونوں طرف سے مرغ باز تیار ہو گئے تو مرغ خانہ میں حاضر ہوئے وہاں ایک وسیع کمرہ تھا جس میں سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ دونوں مرغ باز اپنے اپنے مرغ فرش پر ٹہلانے لگے۔ اتنے میں حضور تامجان پر سوار ہو کر تشریف لائے سب نے سرخم ہو کر تعظیم دی۔ اس کے بعد ملک الشعرا میر تقی میر دہلوی پالکی میں سوار ہو کر آئے۔ جرنل سلیمن مارٹن صاحب۔ نواب حیدر بیگ تشریف لائے اور مرغ بازی اس طرح شروع ہوئی کہ نواب آصف الدولہ کا مرغ باز اور حیدر بیگ خاں کا مرغ باز دونوں آمنے سامنے بیٹھے اور اپنے اپنے مرغ کو سامنے چھوڑ دیا۔ دونوں مرغ تیار تھے اور جوانی میں چڑھے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ برابر کی چوٹیں چلنے لگیں دونوں طرف کے مرغ زخمی اور رکوفتی ہو گئے۔ گھنٹہ بھر کے بعد دونوں نے اجازت لے کر اپنے اپنے مرغ کو سینکا اور خون پوچھا اور پھر ٹہلایا اس کے بعد پھر آمنے سامنے چھوڑے گئے دونوں گتھ کے شیرانہ وار کرنے لگے۔ ایک نے دوسرے کو مارے چونچوں کے زخمی کر دیا۔ دونوں طرف لہو بہنے لگا مرغ باز اپنے اپنے مرغ کو شہ دیتا تھا ہاں بیٹا اور دو چار ہاتھ رکنا نہیں پالا مار لیا ہے۔ شاباش ہے پیچھے نہ آنا ایک حملہ اور کر اور دوسرا

مرغ ذرا تیز ہو کر اچھلا۔ مرغ باز نے کہا غصہ نہ کرو حریف کو جواب دو اُس نے دو چار پنجے جھاڑ دیئے۔ ایک نے دوسرے کو نیچے رکھ لیا۔ پپوٹے چلنی چلنی ہو گئے۔ باچھیں چھل گئیں۔ جب تین گھنٹے پورے ہو گئے تو سب کو خیال ہوا اب دونوں تھک گئے دونوں اٹھا لئے جائیں مگر مرغ باز نے کہا ابھی مرغ میں طاقت ہے ایک گھنٹہ اور لڑ سکتا ہے۔ آخر گھنٹہ بھر تک دونوں جی توڑ کر لڑا کئے نہ اُس کی فتح نہ اس کی فتح آخر مرغباز نے پھر مرغ کو شہ دی ہاں بیٹا ایک چوٹ ایسی کرو کہ حریف منہ پھیر دے۔ یہ سنکر نواب کے مرغ نے پیٹ میں حریف کے ایسا کانٹا مارا کہ لوہے کی نوک لگنے سے اس کے پیٹ کی کھال کٹ گئی اور آنتیں نکل پڑیں۔ اس پر بھی وہ مرغ برابر لڑنے لگا۔ نواب نے حکم دیا فوراً اُٹھا لو مرغ باز نے اپنا مرغ اٹھا لیا اور پیٹ کی کھال میں ٹانکے دے کر کچھ روغن زیتوں ملا۔ اور اس کے زخم پوچھے جرنل سلیمن صاحب نے آصف الدولہ بہادر سے عرض کی حضور کی ایک صورت بہت ظلم آمیز ہے یعنی مرغ کے کانٹے اک تو یونہی خطرناک ہوتے ہیں۔ اسپر حضور کا حکم ہے کہ اسپر خول چڑھایا جائے اس سے اور زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ نوبت ہلاکت کی آجاتی ہے۔ میں حیدر بیگ خاں کے مرغ کی تعریف کروں گا کہ باوجود ایسا گہرا زخم کھانے کے پھر اپنی جان کا پاس نہیں کیا اور برابر حریف کے مقابلہ ڈٹا رہا۔ اگر یہ خطرناک چیز کو آپ دفع کر دیں تو مجھے امید ہے کہ ضرور تمام مرغ اس آفت سے بچ جائیں۔ میں نے اسوقت اپنی آنکھ سے دیکھا کہ کانٹا مرغ کے پیٹ میں گھس گیا۔ اُس کا کام تمام ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ نواب نے اپنے متوسلین کی طرف رخ کیا۔ سب نے کہا کہ واقعی جرنل صاحب کی تجویز بہت کارآمد ہے۔ مرغ کے کانٹے یونہی کیا کم خراب ہوتے ہیں اس پر لوہے کا خول جان لیوا بنجاتا ہے۔ نواب نے حکم دیا کہ آج سے کسی مرغ کے کانٹوں پر خول نہ چڑھایا جائے بلکہ ان کے کانٹوں پر کپڑا لپیٹ دیا کریں تاکہ وہ مہلک طریقہ سے زخمی نہ ہوں۔ نواب کی اس رائے کو سب نے پسند کیا اور اس دن سے مرغ کو اس تکلیف سے آزادی مل گئی۔ مگر اس کے محرک جرنل سلیمن صاحب بہادر تھے جن کو مرغ کی یہ حالت دیکھ کر کمال افسوس آیا۔ تیسرے دن مرغ باز امیر الدولہ حیدر بیگ کا مرغ دکھانے لایا تو اس کے پیٹ میں زخم کا کہیں کوئی نشان تک نہ تھا ایک مرتبہ جرنل برسلو صاحب

رزیڈنٹ ہو کر لکھنؤ آئے اور نواب سے خوب پینگ بڑھے۔ ایک مرتبہ نواب سے فرمائش کی حضور کے یہاں کوئی مرغ کی لڑائی ہو تو مجھے ضرور یاد فرمائیے گا۔ نواب نے اسی وقت دربار کی طرف دیکھا الماس علی خاں نے عرض کی غلام کے یہاں ایک مرغ جاوے کا تیار ہوا ہے اگر حکم ہو تو حاضر ہے نواب نے فرمایا ہم کو پریسیڈنٹ صاحب کی خاطر ملحوظ ہے۔ اچھا اتوار کو دس بجے مرغ لے کر حاضر ہو جانا اور ہمارے مرغ خانہ سے ایک مرغ تجویز کر لو۔ الماس علی خاں نے اسی قد و قامت اور اسی وزن کا ایک مرغ تجویز کیا۔ اتوار کے دن صرف طلبیدہ دس حضرات تشریف لائے۔ ملک الشعرا میر تقی بھی اپنی جھالدار پالکی پر تشریف لائے جان برسٹہ صاحب اپنی پالکی پر ہندوستانی لباس میں تشریف لائے۔ مہاراج ٹکیٹ رائے میاں الماس علی خاں اپنے حضور بوچے پر سوار ہو کر رونق افروز ہوئے دونوں مرغ باز اپنے اپنے مرغ لے کر میدان میں آئے اور فرش پر ٹہلانے لگے۔ دونوں کو چھوڑ دیا اب پیچھے ہٹ کر بیٹھے۔ دونوں مرغوں نے آفت جوت دی ایک گھنٹہ گذر گیا۔ حکم ہوا اٹھاؤ نہیں۔ مرغ باز مایوس ہو کر دو گھنٹہ کامل لڑنے کے بعد نواب کے مرغ نے گردن ڈالدی اور دیر تک چونچیں کھایا کیا۔ لیکن پیچھے قدم نہیں ہٹایا لائیں اور چونچیں کھاتے کھاتے زخمی ہو گیا۔ اور بہت مضمحل۔ لیکن حریف کے سامنے ڈٹا رہا۔ سب گمان غالب تھا کہ نواب کا مرغ اب بھاگ جائے گا الماس علی خاں دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج جاوے والا مرغ جیتے گا اور یہ گمان یقین سے بدل جاتا تھا۔ جواب نواب کا مرغ افیونیوں کی طرح گردن ڈالے ہوئے زمین دیکھ رہا۔ تین گھنٹے ہوئے چار گھنٹے ہوئے یہانتک کہ الماس علی خاں کا مرغ بھی تھک گیا اُس کا بھی دم آگیا۔ ہانپنے لگا۔ کسمانے لگا۔ کندھے ڈال دیئے۔ پر کھول کھول کر رہ جاتا۔ اب نواب کا مرغ افیون کے نشہ سے بیدار ہوا۔ اپنے حریف پر حملے پر حملے کرنے لگا۔ چونچوں سے زخمی کر دیا ہاتھ بھر اونچا ہو کر لائیں رسید کیں اب الماس علیخاں کے مرغ کی خیر نظر نہیں آتی بازی کا رخ بدل گیا۔ اور ساری محفل کا خیال ہو گیا اب سو ہاتھ نواب کا مرغ مارے گا۔ جب دونوں مرغ نہایت کوفتہ ہو گئے دم ٹوٹ گیا تو نواب کے مرغ نے اُچک کر ایک لات اس زور سے ماری کہ الماس علی خاں کا مرغ پیٹھ موڑ کر لوک دم بھاگا۔ اس بازی میں نواب کو ایسی خوشی ہوئی کہ حکم دیا بادشاہی مصور کو بلوا کر حاضرین جلسہ کی تصویر کا ایک گروپ بنایا جائے۔ چنانچہ گروپ اس وقت تک حسین آباد کے تصویر خانے میں جو تالاب کے قریب موجود ہے اور قابل دید ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ مصور نے اپنے قلم سے ابھی ابھی تصویر بنائی ہے ❊

. . . .

(عشرت لکھنوی)

چچا چھکن کے ابتدائی کارنامے

(از جناب محمد ابراہیم خاں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

رات کے کوئی نو بجے ہوں گے جو چچا چھکن نے باہر سے دروازہ پر دستک دی۔ پانچ منٹ کے وقفہ کے بعد اندر سے زنجیر کھلی اور چچا چھکن چوروں کی طرح دبے پیروں گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو غلیل کا چلّہ اُتار کر غلیل کھونٹی پر لٹکائی۔ گلے سے غلوں کا تھیلا اُتار کر اُسی کھونٹی پر لٹکایا۔ پھر خاکی نیکر اور قمیص اُتار کر جوتا اُتارا سلیپر پہنے۔ مٹکے سے پانی لیا اور ہاتھ منہ دھونے بیٹھ گئے۔ چچی نے اُنکی کسی بات کا نوٹس نہ لیا۔ وہ اپنی بچی کو لئے ہوئے پلنگ پر لیٹی رہیں البتہ کن انکھیوں سے چچا چھکن کی تمام حرکات دیکھ رہی تھیں۔ اب چچا چھکن آستینیں چڑھا کر پلنگ پر اس انتظار میں آ بیٹھے کہ چچی اُن کے سامنے کھانا لا کر رکھیں گی۔ مگر چچی اسی طرح لیٹی رہیں۔ بلکہ چچا چھکن کی طرف سے کروٹ لے کر بچی کو تھپکنے لگیں حالانکہ بچی غفلت کی نیند پڑی سو رہی تھی۔ چچا آخر تو کوئی بچہ نہ تھے کہ اس بے رخی کی وجہ نہ سمجھ سکتے۔ جانتے تھے کہ آج بیگم صاحبہ بے حد خفا ہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ اُن کا خفا ہونا بے جا بھی نہیں۔ سوچ رہے تھے کہ اگر آج خیریت سے گزری تو شکار پر اور اُن دوستوں پر جو زبردستی شکار کے لئے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آئندہ لعنت بھیجدیں گے اور پھر بیگم صاحبہ کو کم از کم اس معاملہ میں ہماری طرف سے کوئی شکایت کا موقع نہ ہوگا۔

اس حالت میں پندرہ منٹ گزر گئے۔ جب چچا چھکن نے دیکھا کہ بیگم صاحبہ کے نزدیک ہماری موجودگی ابھی تک مشتبہ ہے تو اُٹھے۔ کہ آپ ہی باورچیخانے سے کھانا لا کر کھالیں۔ چچی تاڑ گئیں کہ وہ کیا حرکت کرنے والے ہیں۔ آخر تھیں تو ہندوستانی ہی بیوی یہ تکلیف چچا چھکن کو دینا نہ چاہتی تھیں۔ اُن کی بھی ہر ہندوستانی بیوی کی طرح یہ خواہش تھی کہ میاں ہمیشہ کم از کم اس معاملہ میں تو انکا دستِ نگر ہی رہے۔ اُٹھیں اور بغیر کسی لفظ کے زبان سے نکالے کھانا گرم کیا۔ ایک کٹورے میں ٹھنڈا پانی لیا اور دونوں چیزیں سامنے لا کر رکھدیں اور پھر بدستور اپنی چارپائی پر جا لیٹیں۔

چچا چھکن نے کھانا ختم کیا۔ ہاتھ دھوئے پانی پیا اور اس انتظار میں پھر پلنگ پر آ بیٹھے کہ بیگم صاحبہ اپنے ہاتھ سے گلوری بنا کر دیں گی۔ مگر یہ وجہ آج تک کسی کی سمجھ میں آئی ہی نہیں کہ جب بیویاں خفا ہوتی ہیں تو خواہ گھر کے تمام کاج کرتی رہیں مگر اپنے ہاتھ سے گلوری ہی بنا کر دیں گی۔ آخر کار چچا چھکن کو اٹھنا پڑا اور خود گلوری بنا کر کھائی۔

اب جو پیٹ کی آگ بجھ چکی۔ طبیعت کو یکسوئی ہوئی اور جسم کو راحت ملی تو چچا چھکن نے چاہا کہ بیگم صاحبہ کو منائیں اُن کا غصہ ٹھنڈا کریں۔ اوران سے بہ عاجزی عرض کریں کہ اب ہماری توبہ ہے جو شکار کو جائیں اور اگر اُنکی مرضی ہو تو ابھی ابھی غلیل کو چولھے میں رکھدیں۔ غلوں کو پھینکدیں اور شکاری لباس کو اُن پر سے تصدق کر کے کسی غریب شکاری کو دیدیں۔ اس لئے وہ اپنے پلنگ سے اُٹھے اور ابھی بیگم صاحبہ کے پلنگ سے فاصلہ ہی پر تھے کہ جُھک جُھک کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ٹھیک اُن کے چہرہ سے ایک بالشت کی بلندی سے بیگم صاحبہ کی آنکھوں کو تلاش کرنے لگے۔ چچی نے یہ دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور جب چچا چھکن نے پوچھا کہ کیا سو گئی ہو؟" تو اس طرح چونک پڑیں کہ گویا خواب میں جنت کی سیر کر رہی تھیں اور وہاں سے کوئی اُن کو زبردستی باہر نکال رہا ہو۔

چچی ۔" توبہ کیا ہے۔ دن بھر کی تھکی ہاری کو سونے بھی دوگے یا نہیں؟"

چچا چھکن ۔ "ابھی بھی کیا نیند ۔ ابھی تو دس بھی نہیں بجے ۔ لوگ جاگتے ہیں ۔"

چچی ۔ "تو تم کو مجھ سے کیا غرض ۔ جاؤ اپنے شوق پورے کرو ۔ جہاں دن گنوایا وہاں رات بھی سہی"۔

چچا چھکن ۔ "کیا واقعی خفا ہو ۔ اگر شکار سے خفا ہو تو جاؤ اب شکار کو نہیں جائیں گے ۔ مگر سیدھے منہ بات تو کرو ۔"

چچی ۔ "مجھے شکار وکار سے کیا غرض ۔ جاؤ گے اپنے لئے نہ جاؤ گے اپنے لئے ۔"

چچا چھکن ۔ "اچھا تو خفا کس بات پر ہو ۔ کچھ منہ سے بھی کہو گی یا نہیں"۔

اب چچی اٹھ کر بیٹھ گئیں ۔

چچی ۔ "ایک صبح سے گئے گئے اب رات کو دس بجے گھر میں گھسے ہیں ۔ نہ یہ خبر کہ کیا پکے گا نہ یہ خبر کہ گھر میں کچھ ہے یا نہیں ۔ مکان کیا ہوا ۔ سرائے ہوئی کہ رات کو آکر پڑ رہے ۔ واہ ۔"

چچا چھکن ۔ "اچھا اب اس غصہ کو تھوکو گی بھی یا نہیں ۔ اب آئندہ جو گھر سے باہر بغیر اجازت جائے وہ مردود ۔ بس!"

چچی ۔ "بیسیوں مرتبہ ایسے وعدے کر چکے ہو ۔ تمہارا اعتبار کیا ۔ خیر یہ بھی دیکھا جائے گا ۔ مجھے پردیس میں لا ڈالا ہے نہ پاس نہ پڑوس دن میں چور گھس آئیں تو جو چاہیں اٹھالے جائیں ۔ میں اکیلی عورت ذات کیا کر سکتی ہوں"۔

چچا چھکن متعجب ہو کر بولے ۔ "پردیس! پردیس کیسا ؟"

چچی ۔ پردیس برابر ہی ہے ۔ نہ اپنا محلہ نہ اپنے ملنے والے ایک شہر ہوا تو کیا ۔ خدا بھلا کرے بی پڑوسن کا اگر اسے کام سے فرصت ہوئی تو بیچاری دیوار پر تھوڑی دیر کے لئے آکھڑی ہوتی ہے اسی سے دو چار باتیں کر لیتی ہوں اور بس"۔

یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے کہ چچا چھکن کی شادی کو تین یا چار سال کا عرصہ ہوا تھا اور وہ انتہائی وحشت جو آخر کار ان کا طرۂ امتیاز بنی ۔ ابھی پیدا نہ ہوئی تھی ۔ اپنے پہلے مکان سے بوجوہ ایک دوسرے محلہ میں کرایہ کے مکان میں اٹھ آئے تھے ۔ مکان کچھ زیادہ بڑا نہ تھا ۔ اس میں تین در کا ایک مختصر دالان تھا ۔ دالان ہی میں ایک کوٹھری تھی ۔ دالان کے آگے ایک تنگ برآمدہ اور برآمدہ کے آگے تین چارپائی کا صحن تھا ۔ یہ تو تھی مکانیت اب رہے مکین ۔ تو چچا چھکن ایک چچی دو ۔ اور ایک بچی تین ۔ کسی نے کہا ہے ایک اکیلا دو بھتیرے تین کا پورا کنبہ ۔

اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اس مختصر مکان میں ایک مختصر کنبہ قیام پذیر تھا ۔

رات کا یہ انتظام ہوتا تھا کہ دالان کے دو دروازوں کی زنجیر اندر سے لگا دی جاتی تھی ۔ اور تیسرے دروازے کی زنجیر باہر سے گرمی کا موسم تھا اس لئے صحن میں دو پلنگ بچھتے تھے ایک پر چچا چھکن اور دوسرے پر چچی مع بچی کے سوتی تھیں ۔

چچا چھکن ۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ دفتر سے آنے کے بعد میں ہونگا اور گھر ۔ اور قسم خدا کی وہ وہ لطیفے بیان کروں گا کہ ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جاؤ ۔ اس تنہائی اور وحشت کا تو خاتمہ ہی سمجھو ۔ اب انشاء اللہ تعالیٰ کل سے یہی پروگرام رہے گا"

چچی اسپر ذرا مسکرائیں مگر چچا چھکن نے نہیں دیکھا ورنہ اس شکر رنجی کا تو وہیں خاتمہ ہو جاتا ۔ مگر یہ سعادت جو "بزور بازو نیست" کے خلاف "بزور بازو" حاصل ہونے والی تھی کسی اور ہی لطیفہ غیبی کی منتظر تھی ۔ چچا چھکن نے دل میں سوچا کہ اگر اسوقت چچی کی توجہ کسی اور طرف ہٹا دی جائے تو ممکن ہے کہ یہ غم و غصہ کے بادل جلد چھٹ جائیں ۔ رہا شکار کا معاملہ تو دیکھا جائے گا ۔ پھر موقع ملے گا یا نہیں ۔ آئندہ کی خبر تو اللہ میاں ہی کو ہے ۔ اس لئے کہنے لگے :۔

"خدا کی قدرت کے بھی عجب کھیل ہیں ۔ آج ہمارے دوست مرزا حسینا بیان کر رہے تھے ۔ کہ حیدرآباد یا کہیں اور کا واقعہ ہے کہ جنگل میں ایک شخص کہیں کو چلا جا رہا تھا ۔ بیچ جنگل میں پہنچکر اس نے دیکھا کہ ایک مست ہاتھی چنگھاڑتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا چلا آرہا ہے ۔ بیچارے کے اوسان خطا ہو گئے ۔ کوئی درخت بھی قریب نہ تھا کہ اسپر چڑھ کر اپنی جان بچاتا ۔ غریب کو موت نظر آنے لگی ۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ سامنے ایک غار ہے ۔ بلا وسواس اس میں گھس گیا ۔ یہ جگہ پہلے سے زیادہ محفوظ معلوم ہوئی ۔ غار تھا بڑا جہاں تک جا سکا گھسا چلا گیا ۔ آخر جب وہ

غار ختم ہوا تو وہ آدمی وہیں پر ہانپتا کانپتا جا کر بیٹھ رہا۔ ہاتھی کی یہ کیفیت کہ مارے غصہ کے غار کے منہ پر کھڑا ہوا چنگھاڑیں مار رہا تھا اور غار کے اندر جہاں تک اس کی سونڈ جا سکتی تھی ڈال کر چاہتا تھا کہ اس آدمی کو پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ غار میں اندھیرا تھا۔ اول اول تو اس آدمی کو وہاں کچھ نظر نہیں آیا مگر جب اندھیرے میں آنکھیں دیکھنے کی عادی ہو چکیں تو اُس نے دیکھا کہ غار کے ختم پر ایک محراب سی بنی ہوئی ہے اور کوئی کالی کالی شے اس محراب کے درمیان بیٹھی ہوئی ہے مگر معلوم نہ کر سکا کہ کیا ہے۔ جب ہاتھی نے غار کے اندر سونڈ ڈال ڈال کر ایک شور سا مچا دیا تو اُس کالی شے کو حرکت ہوئی اور جہاں وہ آدمی بیٹھا ہوا تھا اُس کی دوسری طرف سے وہ شے نکل کر غار کے منہ کی طرف چلی تو اس آدمی نے دیکھا کہ وہ کالی شے ایک بہت بڑا بچھو تھا۔ آدمی کے ہوش غائب ہو گئے۔ اب اس کو ہر طرف موت نظر آنے لگی۔ اگر غار سے باہر نکلتا ہے تو ہاتھی کاہے کو زندہ چھوڑے گا اور اگر غار کے اندر ہی رہتا ہے تو بچھو کے ایک ڈنک ہی میں خاتمہ یقینی تھا۔ سوچا کہ جب موت آ ہی گئی ہے تو کیا چارہ۔ باہر مرنے سے تو غار کے اندر ہی مرنا بہتر ہے کہ قبر کا تو کام دے گا۔ یہ سوچ کر وہ آدمی غار کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ وہی بچھو غار کے اندر چلا آ رہا ہے۔ یہ دم بخود بیٹھا رہا۔ بچھو جس راستہ سے گیا تھا اُسی راستہ سے واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا ہاتھی کے شور و غل کی آواز اب بند ہو گئی تھی۔ یہ خیال کر کے کہ شاید ہاتھی مایوس ہو کر چلا گیا ہو وہ آدمی آہستہ آہستہ غار سے نکل کر باہر آیا تو اس کا خیال صحیح نکلا۔ ہاتھی کا پتہ بھی نہ تھا۔ البتہ زرد رنگ کا کچھ پانی سا بہہ رہا تھا۔ سمجھ گیا کہ کیا ہوا تھا۔ بچھو کے ایک ڈنک سے وہ عظیم الجثہ ہاتھی پانی ہو کر بہہ گیا۔ اس آدمی نے اللہ تعالے کا شکریہ ادا کیا اور اپنے راستے چلا گیا۔ سچ ہے جس کو خدا رکھے اُس کو کون چکھے۔"

چچی حیرت سے اس بیان کو سُن رہی تھی۔ چچا چھکن سمجھے کہ اب جلد معاملہ صاف ہوا چاہتا ہے ایک اور ایسا ہی قصہ بیان کر دوں تو پھر فرصت ہی فرصت ہے۔ یہ سوچ کر چچا چھکن نے ایک اور قصہ بیان کرنا شروع کر دیا۔

"اور وہ روزی رساں تو ایسا ہے کہ انسان کی عقل کام نہیں کرتی ایک صاحب جو حیدرآباد میں تعلقہ دار تھے وہ اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے تھے کہ اُن کے علاقہ میں ایک کنواں کھودا جا رہا تھا۔ جب کھدتے کھدتے پانی نکل آیا تو اُس پانی میں ایک بڑے تربوز کی برابر اور ویسا ہی گول ایک پتھر ملا۔ لوگ اُس عجیب پتھر کو لے کر تعلقہ دار صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ بھی متعجب ہوئے اور حکم دیا کہ اس پتھر کو اُن کے سامنے دو ٹکڑے کیا جائے۔ جب اُس پتھر کے دو ٹکڑے کئے گئے تو دیکھا کہ پتھر کے اندر تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس پانی میں سے ایک چھوٹی سی مینڈکی پھدک کر باہر آ گئی۔ لوگ...... سخت...... حیرت.... زدہ...... ہوئے۔ پتھر س پانی...... کہاں...... سے آیا...... ...... اور........"

چچا چھکن اس حکایت کے آخری حصہ پر پہنچ رہے تھے کہ اُن پر نیند کا سخت غلبہ طاری ہوا۔ پہلے تو آواز میں کمزوری واقع ہوئی۔ پھر الفاظ بے ترتیب ہو گئے۔ ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ کئی سکنڈ کے بعد ادا ہونے لگا۔ جملے بے ربط ہو گئے اور آخر کار ایک لمبے خراٹے پر یہ حکایت "تمت تمام شد" ہو کر رہ گئی۔ چچی کچھ پہلے سو چکی تھیں۔ اتنے میں دالان کی اندر سے زنجیر بجنی شروع ہوئی۔ اس آواز پر چچی ذرا ہوشیار ہوئیں پھر پوری آنکھیں کھول کر غور سے سننے لگیں۔ زنجیر برابر بج رہی تھی۔ چچی نے "بلی۔ بلی" کہکر دھتکار دیا۔ آواز موقوف ہو گئی مگر چچی کو دہشت سے نیند نہ آئی۔ آدھ گھنٹہ کے بعد پھر زنجیر بجنے لگی۔

نیا مکان نیا محلہ چچی بھوت پریت کی پہلے تو بڑی قائل تھیں مگر چچا چھکن نے ہمیشہ یہی کہا کہ بھوت پریت نام ہے فقط وہم کا اور یہ سب مزخرافات ہے اور کچھ نہیں۔ چچی اُنکی ہم خیال تو نہیں بنیں البتہ عقیدہ میں کمزوری ضرور پیدا ہو گئی۔ اسوقت اُن کو یہی خیال آ رہا تھا کہ اگر بلی ہوتی تو بھاگ گئی ہوتی۔ ہو نہ ہو اس مکان میں کچھ خلل ہے۔ چچی نے پھر دھتکار دیا اور پھر زنجیر کا بجنا موقوف ہو گیا۔ مگر اب چچی کی نیند کوسوں دور تھی۔ چچا چھکن مزے سے خراٹے لے رہے تھے۔ اب جو تیسری مرتبہ زنجیر بجنا شروع ہوئی تو چچی سے نہ رہا گیا۔ اور چچا چھکن کے اس طرح بے خبر سونے پر خفا ہوتے ہوئے اُنکو ایک مرتبہ تو جھنجھوڑ ہی ڈالا۔

"ایسی بھی بھلا کیا نیند۔ گھر میں کیسا شور ہو رہا ہے اور آپ ہیں

کہ مُردوں سے شرط باندھ کر سوئے ہوئے ہیں۔ گھر میں چور گھس آئیں سینہ لگجائے اور کچھ ہو جائے تم کو خبر بھی نہ ہو۔ اے بس اب آنکھیں کھولوگے بھی یا نہیں۔ کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ سنتے ہو"۔ چچی نے غصہ سے کہا۔

ایک مرتبہ چچا چھکن نے کروٹ بدل کر "اونہہ" تو کہا اور پھر سوگئے

اب چچی کو تاب نہ رہی جلدی میں جو پلنگ سے اُٹھیں پاس ہی میز پر پانی کا بھرا گلاس رکھا تھا۔ اُس میں جو ٹھوکر لگی تو تمام پانی اچھل کر چچا چھکن کے منہ اور سر پر پڑا۔ چچا چھکن "کیا ہے۔ کیا ہے"۔ کہتے ہوئے نیم بیدار ہوئے۔ چچی نے موقع غنیمت جان کر چچا چھکن کا ہاتھ پکڑ کر پلنگ پر بٹھا ہی تو دیا اور کہنے لگیں کہ "دیکھو تو دالان کی زنجیر کیوں بج رہی ہے"۔

زنجیر بجنا موقوف ہو چکی تھی۔ چچا چھکن بولے۔

"خواہ مخواہ نیند خراب کرتی ہو۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا"۔

"ذرا صبر سے کام لو اور غور سے سنو"۔ چچی نے کہا۔ اتنے میں زنجیر پھر بجنا شروع ہوئی۔

چچا چھکن بولے "بلّی ہوگی۔ ذرا ڈنڈا دینا ابھی بھگائے دیتا ہوں"۔ یہ کہکر چچا چھکن کود کر جو پلنگ سے اُٹھے تو چچی نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگیں

"میں یوں نہ جانے دونگی۔ مجھے تو کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے۔ بلی کو تو دو مرتبہ دھتکار چکی ہوں اگر بلی ہوتی تو بار بار کیوں آتی"

چچا چھکن تعجب سے بولے "کیا مطلب۔ کیا مطلب کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے یعنی کیا؟"

چچا چھکن کی نیند اب بالکل غائب ہو چکی تھی۔ کچھ سوچ کر پھر بولے "کیا تمہارا خیال ہے کہ اس گھر میں کچھ آسیب ہے"۔ اور پھر فوراً ہی یا تو پلنگ سے یوں اُٹھے تھے یا پھر بیٹھ گئے۔

"ہاں"۔ چچی نے کہا۔ اسی لئے تو میں تم کو اکیلا نہیں جانے دیتی"

کہنے کو تو چچا چھکن ہمیشہ چچی سے یہی کہتے رہے کہ بھوت پریت کوئی چیز نہیں صرف وہم ہی وہم ہے مگر اب جو ایک صورت پیش آئی تو دل میں ڈرنے لگے۔ پھر بھی ایک عورت کے سامنے کمزوری کیوں دکھانے لگے تھے کہنے لگے۔

"میں تو ڈرتا ڈراتا ہوں نہیں۔ تم ڈرتی ہو تو ڈرو۔ اور جو تمہارا دل نہیں مانتا تو یوں کرو کہ دونوں ساتھ چلیں۔ دیکھیں تو بھوت کیسا ہوتا ہے؟"

چچی کو یہ تجویز پسند اور چچا چھکن نے یوں طے کیا کہ چچی تو لالٹین لے کر ساتھ چلیں اور چچا چھکن اپنا ڈنڈا لے کر چلیں۔ چنانچہ چچی نے تو لالٹین لی اور چچا چھکن بانکپن سے اپنا ڈنڈا ہاتھ میں لئے ساتھ ساتھ چلے۔ دالان کی زنجیر کھول کر جو اندر گھسے ہیں تو روشنی میں ہر چہار طرف غور سے دیکھا مگر کچھ نظر نہ پڑا۔ اچھی طرح دیکھ بھال کر دونوں باہر نکل آئے اور چچا چھکن پلنگ پر بیٹھکر پھر زنجیر بجنے کا انتظار کرنے لگے۔

اس مرتبہ زنجیر زیادہ زور سے بجنے لگی۔ گویا کوئی شے ہے جو باہر نکلنے کے لئے بیتاب ہو رہی ہے۔ چچا چھکن جو ابھی تک اپنی مردانگی کو برقرار رکھے ہوئے تھے زیادہ خوف زدہ ہونے لگے۔ چچی نے کہا کہ اسوقت اچھا موقع ہے۔ جلدی سے زنجیر کھول کر دیکھیں تو کیا ہے۔ چچی کی موجودگی سے چچا چھکن کی ہمت بندھی ہوئی تھی۔ اس لئے پھر اسی عمل کا اعادہ کیا گیا مگر نتیجہ وہی کا وہی رہا۔ اب چچا چھکن کو یقین ہونے لگا کہ بیشک یہ تو کوئی بھوت ہی ہے جو زنجیر تو برابر بجائے جا رہا ہے مگر باوجود تلاش کے نظر نہیں آتا۔ رہی سہی ہمت بھی جواب دینے لگی۔

چچی ذرا سوچ کر بولیں۔ ایکے ایسا کرو کہ بغیر روشنی کے دالان میں داخل ہوں اور پھر وہاں روشنی کرکے دیکھیں کہ کیا اصرار ہے"۔ چچا چھکن نے بادل ناخواستہ اس تجویز کو قبول کیا اور چچی ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں دیاسلائی لئے ہوئے ساتھ ہوئیں۔

جلدی سے دروازہ کھول کر دونوں اندر داخل ہوئے۔ چچا چھکن ڈنڈا لئے ہوئے کچھ آگے تھے۔ دفعتاً چچا چھکن کی زور سے چیخ نکلی اور ساتھ ہی ایک آہ کی آواز آئی۔ چچی نے جلدی سے لالٹین روشن کی تو دیکھا کہ چچا چھکن گھٹنہ پکڑے بیٹھے ہیں۔ چچی "کیا ہوا کیا ہوا"۔ کہتی ہوئی قریب گئیں مگر چچا چھکن فوراً ہی "کچھ نہیں۔ کچھ نہیں"۔ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ اندھیرے میں کوئی جسم ان کے پیر سے مَس ہوا تھا اور انہوں نے اضطراری طور پر فوراً ہی ڈنڈے سے حملہ کیا۔ مگر دالان کی چھت نیچی ہونے کی وجہ سے پہلے تو ڈنڈا چھت سے ٹکرایا اور پھر کچھ اس طرح گرا کہ بجائے زمیں بوس ہونے کے چچا چھکن کے گھٹنے کی خبر لے لی۔

اب چچا چھکن کے دل سے بھوت پریت کا خیال تو جاتا رہا تھا کیونکہ انہوں نے اپنے پیروں پر سے ایک نامعلوم جسم کو گزرتے ہوئے

محسوس کیا تھا۔ اب بیخوف ہو کر چلانے لگے۔

"کہاں جائے گا مردود۔ اگر جان ہی سے نہ مار ڈالا ہو تو نام بدل دینا بتا کہاں ہے۔ کدھر ہے۔ لوں تیری خبر۔ بہت دیر سے پریشان کر رکھا ہے گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر میں بھاگ کر آتا ہے"۔

چچا چھکن کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔ چچی کھڑی کھڑی چچا چھکن کا تماشہ دیکھ رہی تھیں جو پے در پے اپنے ڈنڈے کو گھما گھما کر دالان کے چاروں کونوں میں مار رہے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ چلاتے بھی جا رہے تھے۔

"بی ہمسائی خیریت تو ہے۔ یہ کیسا شور ہے۔ ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں"۔ ایک عورت نے برابر والے مکان کی دیوار سے آواز دی۔ مگر یہاں سنتا کون تھا۔ چچا چھکن نہ تو کچھ بتاتے ہی تھے اور نہ چپ ہی ہوتے تھے۔ شور بڑھ رہا تھا۔

"کہاں جا کر بیٹھا ہے۔ ذرا نکل تو مزہ چکھاؤں۔ بہت دق کر چکے ہو۔ بس اب نکل آؤ۔ ایک ڈنڈے کا دم نہیں آئے ہیں ہم سے اُلجھنے۔ ساری بڑھیاں مر گئیں نانی سے ٹھٹول"۔

اتنے میں چچی سے بولے "ذرا لالٹین ادھر تو لاؤ کوٹھری اور دیکھ لیں"۔

"آخر کچھ بتاؤ تو ہے کیا۔ تم نے کیا دیکھا۔ کوٹھری میں کیا ہے"۔ چچی نے دق ہو کر پوچھا۔

چچا چھکن بولے۔ باتوں میں دیر نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں بھاگ جائے ذرا جلدی کرو۔ ہاں یونہی چلی آؤ۔ ڈرو نہیں"۔

جونہی کوٹھری کے کواڑ جو بھڑے ہوئے تھے کھلے اور لالٹین کی روشنی پڑی تو چچا چھکن نے فوراً ایک نعرۂ جاں گداز کے ساتھ ایک وار ڈنڈے کا کیا جو چچی کے کپڑے والے صندوق پر پڑا۔

چچی غصہ سے بولیں "اے میں کہتی ہوں تم کو ہو کیا گیا ہے۔ خواہ مخواہ شور مچا رکھا ہے سارے محلہ کو سر پر اٹھا لیا۔ نہ کچھ بتاتے ہو نہ کچھ کہتے ہو۔ میرے صندوق کو ہی توڑ ڈالا۔ ذرا حواس درست کرو"۔

چچا چھکن نے سنا بھی نہیں وہ ایک گوشہ کی طرف گھٹنوں پر ہاتھ رکھے ہوئے جھک کر کسی چیز کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ چچی نے بھی اُس چیز کو دیکھ لیا اور ہنستے ہنستے بیتاب ہو گئیں۔ چچا چھکن کو اُن کی یہ بے وقت کی ہنسی سخت ناگوار گزری اور غصہ سے کہنے لگے "یہ ہنسی کا کون موقع ہے۔ نہ معلوم کیا بلا ہے۔ جو دو صندوقوں کے درمیان کالی کالی بیٹھی ہوئی ہے۔ کیا معلوم جو کوئی بھوت ہی ہو اور اس نے ہم کو ڈرانے کے لئے یہ شکل اختیار کر لی ہو"۔

چچی نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے جواب دیا "تمہیں تو اللہ میاں نے ویسے ہی مرد بنا دیا۔ صاف نظر آ رہا ہے۔ میں پوچھتی ہوں تم تو بھوتوں کے قائل ہی نہ تھے اب کیوں ان کا اقرار کرنے لگے"۔

چچا چھکن چوہے کو پہچان چکے تھے۔ اکڑ کر کہنے لگے۔

"اب بھی کون بھوتوں کا قائل ہے۔ میں تو تم کو چڑانے کیلئے کہہ رہا تھا"۔

مشکل یہ تھی کہ چوہا سہما ہوا دو صندوقوں کے درمیان سمٹا سمٹایا ہوا اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں ڈنڈے کا کام نہ تھا۔ اس کو ماریں تو کیسے ماریں صدقے جائیے چچا چھکن کی عقل رسا کے کہ چچی تو سوچتی ہی رہیں انہوں نے اس مشکل کو بھی حل کر لیا۔ بڑے بوڑھوں کی ایک نشانی تلوار گھر میں رہ گئی تھی فوراً نیام میں سے نکال اس کی نوک سے چوہے کا کام تمام کر دیا اور تن کر کہنے لگے "دیکھا بہادری اسکو کہتے ہیں۔ اگر تمہاری طرح میں بھی ڈر گیا ہوتا تو آج رات نیند آنے سے رہی تھی اور کل ہی مکان بدلنا پڑتا وہ علیحدہ"۔

غرضکہ وہ چوہا مکان کے باہر پھینک دیا گیا۔

رات کافی جا چکی تھی۔ چچا چھکن اور چچی دونوں خوب ہلکان ہو چکے تھے۔ پلنگ پر پہنچنے کی دیر تھی کہ دونوں غافل ہو کر سو گئے۔ چچی کی حسب عادت نماز فجر کے وقت آنکھ کھل گئی۔ سر میں درد تھا بہتیرا چاہا کہ پھر پڑ کر سو رہیں مگر نیند نہ آئی۔ اس لئے گھر کے کام کاج میں مشغول ہو گئیں۔ چچا چھکن بدستور سو رہے تھے۔ جب دس بجے کا عمل ہوا تو چچی نے چچا چھکن کو یہ کہہ کر جگانا چاہا۔ "اے بس اب اٹھو گے بھی یا نہیں۔ دس بج رہے ہیں۔ کیا دفتر نہ جاؤ گے۔ اور آج کھاؤ گے کیا؟"

چچا چھکن نے نیم باز آنکھوں سے گھر میں پھیلی ہوئی دھوپ کو دیکھا۔ اور یہ کہتے ہوئے چادر تان کر پھر سو گئے۔

"نیند ابھی نہیں بھری۔ دفتر کی تعطیل ہے۔ تھیلے میں چار کبوتر اور تین فاختہ پڑی ہیں۔ انہی کو بھون بھان لو۔ کل جائیں گے تو زیادہ شکار لائیں گے"۔

(محمد ابراہیم خاں)

انتخاب

(افغانی سرحد کا ایک دلچسپ افسانہ)

(از جناب محمد اختر صفوی ۔ صفی پوری)

عظیم نے صحن باغ میں داخل ہو کر ایک بیفکرانہ نظر سے ہر چہار طرف دیکھا۔ وہ کسی خیال میں غرق تھا کہ اتفاقاً اس کی نظر سامنے کی جانب گلاب کی ایک گھنی جھاڑی سے گزرتی ہوئی ایک سفید ریشمی متحرک کپڑے پر پڑی پہلے تو ایک لمحہ کے لئے تجسس آمیز حیرت کے ساتھ اس کی بھنویں ایک دوسرے سے مل گئیں۔ لیکن پھر اس کو خیال گزرا کہ غالباً یہ اس کے باپ کے دوست محمد اکبر کی لڑکی سلمیٰ ہے۔ عظیم کے دل میں اس کے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

عظیم اپنے باپ عزیز کے ہمراہ تجارتی سلسلہ سے آج ہی صبح محمد اکبر کے یہاں پہونچا تھا۔ عظیم اور اس کا باپ گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ اثنائے راہ میں عزیز نے اس کی شادی کے متعلق عظیم کا عندیہ لینے کی غرض سے متفرق و متعدد سوالات کئے۔ عزیز نے کہا کہ ایک جوان آدمی کے لئے یہی زمانہ ہوتا ہے۔ کہ وہ شادی کرکے اپنا گھر آباد کرے۔ عظیم کا یہ زمانہ بالکل آزادی کا تھا۔ چنانچہ وہ کئی سرحدی یورشوں میں بھی حصہ لے چکا تھا اور اسی آزادی کو دور کرنے کے لئے عزیز کی انتہائی خواہش تھی کہ عظیم کو متاہل زندگی کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ اپنے باپ کے استفسار پر عظیم نے مسکرا کر گردن جھکالی اور اپنے دل میں کہا کہ میں شادی کرکے اپنی آزادی کو بیوی کی خاطر ہرگز ہرگز برباد نہیں کرسکتا۔ زندگی ابھی ہزاروں ایک سے ایک بہتر اور دلچسپ چیزوں سے معمور ہے۔ وحشی اور جنگلی گھوڑوں کو سدھانا آزادانہ اور بیفکرانہ جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومنا اور اسیطرح کے دسیوں دلچسپ مشاغل میرے لئے کافی ہیں۔

عظیم کی خاموشی پر اس کے باپ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنے اکلوتے لڑکے کے چوڑے سینے بھرے بھرے بازوؤں۔ حسین اور شگفتہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "محمد اکبر کی لڑکی جہیز بکثرت پائیگی۔ میں محمد اکبر سے اس کے متعلق گفتگو کروں گا۔"

آپ ان سے گفتگو کیجئے آپ کی خوشی۔ عظیم نے مسکراتے اور شرم سے اپنی گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں شادی خود اپنے انتخاب سے اور جسوقت مناسب سمجھونگا اسوقت کرونگا۔"

عظیم کے اس جواب کے بعد اس کے باپ نے گفتگو کا موضوع بدلدیا اور کم از کم عظیم نے تو اس خیال ہی کو اپنے دماغ سے نکال دیا۔

لیکن اسوقت سفید ریشمی ساری کی جھلک نے عظیم کے دماغ کو بیسیوں خیالات کی آماجگاہ بنادیا۔ کیا یہ سلمیٰ ہے؟ لیکن وہ تو سوائے اپنے عزیزو قریب کے اور سب سے پردہ کرتی ہوگی۔ پھر آخر یہ ہے کون؟

عظیم آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا اور پھلوں کے درختوں کی آڑ لیتا ہوا باغ کے کنارے پہونچا۔ اس وقت نہ تو باغ کا کوئی ملازم اور نہ خود لڑکی اس کی موجودگی سے واقف تھے۔ عظیم کا مقصد لڑکی کو خوفزدہ کرنا نہ تھا بلکہ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اگر یہی سلمیٰ ہے تو وہ اپنے باپ کے کہنے کو ٹال کر کیا واقعی کوئی حسین چیز ہاتھ سے کھو رہا ہے۔ چنانچہ جب عظیم بالکل قریب پہونچا تو اس نے درختوں کی آڑ سے ایک زریں کنارے کی ساری دیکھی اس وقت صرف ایک جھاڑی ان کے درمیان حائل تھی اس لڑکی کی پشت عظیم کی طرف تھی۔



ایک مہاراجہ اپنے محل میں-راجپوت مصوری کا نادر نمونہ

عظیم نے اس لڑکی کو ذرا اور قریب سے دیکھنا چاہا اور کچھ آگے بڑھا۔ لیکن باوجود انتہائی احتیاط کے اس کی شلوار گلاب کی ایک شاخ میں اُلجھ گئی۔ اتنی آواز ایک چوکنا ہرنی کے لئے کافی سے زیادہ تھی اور وہ پلٹ کر پشت کی جانب دیکھنے لگی۔ اسوقت عظیم کے ہوش و حواس گم تھے۔ خدا کی قدرت کا ایک مکمل اور حسین ترین نمونہ اس کے سامنے موجود تھا۔ وہ سپیدۂ صبح سے زیادہ حسین تھی۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی مقناطیسی کشش تھی اور ایک اجنبی شخص کی خلاف امید موجودگی کے احساس کے باعث ان سے حیرت اور استعجاب کی بارش ہو رہی تھی

ایک لمحہ کے لئے وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ حیرت اور تعجب نے اس کے پیر زمین میں گاڑ دیئے لیکن دوبارہ جب اس کو ایک اجنبی کی موجودگی کا خیال ہوا تو اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اور وہ اپنے گھر کی طرف بھاگی لیکن عظیم نے اپنے ارادہ کے نتائج سے بے خبر اپنی حرکت کے طشت از بام ہونے کے عواقب سے لاپروا اس سے بھی زیادہ تیز دوڑ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں" عظیم نے اس کے حسین چہرہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن مثلِ برق وہ ایک طرف کو مڑی اور ساری کو مضبوطی کے ساتھ اپنے جسم سے لپیٹتے ہوئے باغ کے دوسرے کنارے کی طرف بھاگی۔ یہاں پہونچکر چوکنا ہرنی کے مانند اس نے اپنے شانوں کو دیکھا لیکن عظیم کو بالکل قریب پہونچتے دیکھ کر اور یہ محسوس کر کے کہ اب اس سے جائے مفر نہیں تو وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح پلٹ پڑی۔ اس کا چھوٹا سا سینہ مارے گھبراہٹ کے اُبھرا ہوا تھا۔ اور آنکھوں سے بجائے خوف و ہراس کے غضب اور غصہ کے آنسو بہہ بہہ کر اس کا گریبان تر کر رہے تھے۔ لیکن جب عظیم سامنے پہونچا تو سلمیٰ کو قریب اور غور سے اسے دیکھنے کا موقع ملا۔ عظیم اس وقت معصومیت اور عجز و انکسار کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کے سیاہ بال سرگیں آنکھیں۔ سرخ و سفید چہرہ حسین خد و خال اور اس پر شباب اور بہادری کے جوہر جو نمایاں طور پر عیاں تھے ان سب نے مل کر پہلی ہی نظر میں سلمیٰ کے غضب اور غصہ کو ہرن کر دیا۔ لیکن پھر اس نے اپنے اپنے کو سنبھالا اور زمین پر پٹخ کر کہا۔ "تم کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو یہ ایک خانگی باغ ہے جس میں صرف میرے خاندان کے افراد آ جا سکتے ہیں"۔

"میں آپ کو کوئی تکلیف پہونچانا نہیں چاہتا" عظیم نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم پیچھے گھوم کر مجھے نہ دیکھتیں تو میں کب کا چلا گیا ہوتا۔ لیکن اب تمہیں دیکھنے کے بعد میں سب کچھ بھول گیا۔ ہاں تم سے کچھ دیر بات چیت کرنے کی خواہش ضرور باقی رہ گئی ہے"۔

"تم مجھ سے ہرگز گفتگو نہیں کر سکتے۔ یہ ایک معیوب بات ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئے"

تمہارے باغ سے سامنے والی پہاڑی کا منظر جس کو تم ابھی دیکھ رہی تھیں کسقدر ——"

"میں ابھی تم سے کہہ چکی کہ میں ہرگز کوئی بات چیت تم سے نہیں کر سکتی" اس نے خوف سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آخر اس میں نقصان کیا ہے" عظیم نے لجاجت کے ساتھ دریافت کیا "تمہیں یہاں کوئی دیکھ نہیں رہا ہے مجھے بھی ان پہاڑیوں کا منظر بہت پسند ہے وہ اس وقت کتنی حسین نظر آ رہی ہیں۔ لیکن ان تک رسائی میرے اختیار سے اتنی ہی باہر ہے جتنی تم تک"

سلمیٰ نے گھبرا کر اپنے چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور بھاگنے کی کوشش کی لیکن عظیم نے ایکبار پھر اس کا راستہ روک لیا اور اپنے بازوؤں کو پھیلا کر اس کو اپنی آغوش میں لینا چاہا۔ سلمیٰ نے کترا کر عظیم کی گرفت سے اپنے کو بچایا اور قبل اس کے کہ بھاگے ایکبار پھر عظیم کو سر سے پیر تک بغور دیکھا اس وقت عظیم یہ سمجھ چکا تھا کہ یہ محمد اکبر کی لڑکی ہے۔ اور انہی خیالات میں غرق ایسا کھڑا تھا گویا پتھر کا مجسمہ ہے جو اس جگہ نصب ہے۔ یہی وہ سلمیٰ ہے جس کے ساتھ اس کا باپ اس کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ عظیم نے اپنے دل میں کہا "مجھے یقین ہے کہ نورجہاں اس سے زیادہ حسین نہ ہوگی۔ ایک متفکرانہ مسکراہٹ کے ساتھ جو عظیم کے ہونٹوں پر نمایاں تھی وہ آہستہ آہستہ اپنی جائے قیام پر واپس آیا۔

شادی؟ گھر؟ ہوں! یقیناً یہ ایک بہت خطرناک جال ہے۔ جس میں پھنس جانیکے بعد رہائی معلوم! لیکن ایکبار مجھے سلمیٰ کو پھر دیکھنا ہے۔ اور اس سے گفتگو کرنا ہے۔ اپنے دل میں ملنے کا مضبوط ارادہ کر لے عظیم نے ملنے کے ذرائع پر غور کرنا شروع کیا۔ چنانچہ باغ کے مالی کی وساطت سے ملنا اس کو ممکن نظر آیا

"میں اس کو رشوت دے کر اور پھر انعام کا وعدہ کر کے راضی کرونگا کہ وہ میرا ایک پرچہ سلمیٰ تک پہونچا دے۔" عظیم نے کہا۔ چنانچہ دوسرے دن ایک پرچہ پر مختصراً مندرجہ ذیل عبارت لکھی۔

"تمہیں پریشان ہونے یا خوف کھانے کی ضرورت نہیں مجھے چند باتیں تم سے بہت ضروری "

"کہنا ہیں بعد مغرب باغ کے مشرقی گوشہ میں مجھ سے ملو میں انتظار کروں گا۔" "عظیم"

اس پرچہ کو لے کر عظیم باغ کے مالی کے پاس پہنچا اور چند منٹ تک اِدھر اُدھر کی گفتگو کرنے کے بعد اسنے یہ پرچہ مع چند روپیوں کے مالی کے ہاتھ میں دیدیا اور اس کو بحفاظت سلمیٰ تک پہونچا دینے کی تاکید کرتے ہوئے مزید انعام کا وعدہ کیا اور چلا آیا۔ انتہائی بے چینی کے ساتھ عظیم نے بقیہ دن گزارا جب شام کا دھندلکا چھانا شروع ہوگیا۔ چرواہے اپنے مویشیوں کو واپس لے آئے اور وحوش وطیور اپنے اپنے آشیانوں میں تمام دن کی تگ و دو کے بعد واپس لوٹ کر شب باش ہوگئے اور جب ہر طرف خاموشی چھاگئی تو عظیم اپنے کمرہ سے نکلا اور آئندہ روند کی نظروں سے بچتا ہوا باغ کے مشرقی گوشہ کا راستہ لیا۔ یہاں پہنچکر عظیم کی عجیب حالت تھی دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور پتیوں کی سرسراہٹ پر بھی جو ہوا کی وجہ سے اِدھر اُدھر اُڑ رہی تھیں وہ چونک چونک پڑتا تھا۔ ایک چھوٹا سا حلقہ بنا کر عظیم نے سخت انتظار کے عالم میں اس کا چکر کاٹنا شروع کیا۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ اس کا دل بیٹھا سا جاتا تھا۔

"وہ نہیں آئے گی! مجھے یہ پہلے ہی سوچ لینا چاہئے تھا۔ عظیم اپنے دل سے یونہی گفتگو کر رہا تھا۔ کہ پشت کی جانب اس کو کچھ آہٹ معلوم ہوئی ابھی وہ اچھی طرح پلٹنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ سلمیٰ انتہائی شرمائی اور لجاتی ہوئی اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

"میں یہاں ٹھہر نہیں سکتی۔" اسنے آہستہ سے کہا۔ "نہ مجھ کو یہاں آنا چاہئے تھا۔ تمہیں مجھ سے کیا کہنا ہے؟"

ایک لمحہ کے لئے عظیم کے دل کی حرکت بہت تیز ہوگئی۔ اور وہ بالکل کوئی جواب نہ دے سکا۔ آخر کچھ دیر کے بعد بمشکل اس نے دل کو قابو میں کیا اور کہا۔ بہت ہی منکسرانہ انداز میں کہا۔ "عالم نسواں میں تمہاری وہ حیثیت ہے جو ستاروں میں ماہتاب کی۔ تم سے کچھ دیر کے لئے بھی گفتگو کرنا میرے لئے انتہائی باعث فرحت و انبساط ہے۔ تم سے ملنے سے جو خوشی مجھے حاصل ہوئی ہے وہ کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی"

"تم نے مجھے لکھا ہے کہ کچھ بہت ضروری باتیں تمہیں مجھ سے کہنا ہیں۔" سلمیٰ نے پریشانی کی حالت میں کہا۔

"مجھے یہ کہنا ہے کہ تمہاری خدمت کرنا میرے لئے انتہائی موجب مسرت ہے۔ میں تمہیں خوش رکھنے کے لئے اپنی جان بھی قربان کرنیکے لئے تیار ہوں"

"بس یہی کہنا تھا۔"

"ارے ظالم یہ کافی نہیں؟ ہاں میں تمہارے ہونٹوں سے یہ بھی سننا چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے ناخوش نہیں ہو۔ میری پیاری سلمیٰ مجھو یقین دلادو کہ ایسا نہیں ہے۔"

عظیم ایک عالم وارفتگی میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا اور سلمیٰ خاموش کھڑی سن رہی تھی۔

"نہیں نہیں میں تم سے ہرگز خفا نہیں ہوں" سلمیٰ نے آہستہ سے کہا۔ عظیم ایک قدم اور آگے بڑھ گیا تاکہ اس سے زیادہ قریب ہوجائے

"مجھے اب جانا چاہئے"۔ سلمیٰ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "رات زیادہ ہوگئی۔ خادمائیں مجھے تلاش کرتی ہوں گی یہ کھانے کا وقت ہے"

"لیکن علی الصباح میں یہاں سے چلا جاؤں گا"

"اسقدر جلد" یہ الفاظ عالم بیخودی میں ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ سلمیٰ کے منہ سے نکل گئے۔

"لہٰذا تھوڑی دیر میرے پاس اور ٹھہرو" عظیم نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"نہیں نہیں وہ لوگ یا تو میرے منتظر ہونگے یا مجھے تلاش کر رہے ہونگے"

"میں بلا ایکبار تمہیں اور دیکھے نہیں جا سکتا۔"

"اب یہ قریب قریب غیر ممکن سا معلوم ہوتا ہے"۔ اس نے عظیم کے چہرہ پر اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔ سلمیٰ کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اسوقت شراب محبت سے معمور تھیں۔ اس کا خوبصورت

جسم مثل ایک غنچۂ نو دمیدہ کے تھا۔ جس کی خوشبو کی لپٹوں نے ہوا میں مل کر ہر کہ ومہ کی مشام جان کو معطر کر رکھا ہو۔ عظیم اسوقت بالکل بیخود ہو رہا تھا قبل اس کے کہ وہ اس کی حالت کو محسوس کرے اس کے ہاتھ پھیلے اور سلمیٰ کو اپنے حلقہ میں لے کر گلے سے لگا لیا ایک لانبی سانس لینے کے بعد چند لمحوں کے لئے سلمیٰ نے اپنے کو عظیم کے مضبوط ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ کچھ دیر کے بعد سلمیٰ نے اپنی اس حالت کو محسوس کیا اور جلدی سے "مجھے چھوڑ دو"

"میں تمہیں دوبارہ پھر دیکھوں گا"

"میں ترسے کہ چلی کہ اب یہ قریب قریب غیر ممکن سا نظر آتا ہے میں جب تک اپنے کمرے میں سونے کے لئے نہ چلی جاؤں۔ میری خادمائیں میرے ساتھ رہیں گی۔

"تو مجھے ایکبار پیار ہی کر لو"

"نہیں نہیں مجھے جانے دو!"

جواب کے لئے عظیم نے اس کے سر کو پیچھے ہٹایا اور آہستہ سے مُہر محبت ثبت کر دی۔ سلمیٰ نے عظیم کی گرفت ڈھیلی پا کر مثل ہرنی کے ایک جست کی اور اس کی گرفت سے نکل کر درختوں کی آڑ لیتی ہوئی اپنے کمرے کیطرف بھاگ گئی ٭

(۲)

دوسرے دن علی الصباح عظیم اور اس کا باپ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے گاؤں کو روانہ ہوئے قبل اس کے کہ راستہ کا گھماؤ سلمیٰ کے مکان کو ان کی نظروں سے پوشیدہ کر دے۔ عظیم نے پیچھے مڑ کر دیکھا اسوقت سامنے کے بالاخانے کی کھڑکی میں سے ایک ارغوانی نقاب ہوا میں اڑتی دکھائی دی۔ عظیم یہ دیکھ کر مسکرایا اور اپنے گھوڑے کو کچھ روک کر تاکہ اس کا باپ آگے ہو جائے۔ ہاتھ کا اشارہ کیا۔ جواب میں ایک سرخ رومال کو جنبش ہوئی اور پھر یکایک کھڑکی بند ہو گئی۔

اثنائے راہ میں عظیم کا باپ خلاف معمول زیادہ خاموش تھا اور اس کے چہرے سے غم و غصہ کا بھی اظہار ہو رہا تھا۔ عظیم نے اپنے باپ کی اس خاموشی کو حسب توقع منافع بخش سودا نہ ہونے کا سبب سمجھا۔ پشاور پہونچکر عظیم اور اس کا باپ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ اس کا باپ تو اپنے گاؤں کو جو پہاڑوں کے درمیان واقع تھا چلا گیا۔ اور عظیم نے دوسری سمت پشاور سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کی جہاں گھوڑوں کا میلہ ہو رہا تھا راہ لی۔ عظیم جب میلے میں پہونچا تو دوپہر کا وقت تھا۔ پہلی ہی نظر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ میلہ ابکی بار ہلکا ہے۔ اول تو جانور بہت کم تھے اور جو تھے بھی وہ معمولی قسم کے چھوٹے چھوٹے۔ عظیم گھومتا اور گھوڑوں کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ کہ اس کی نظر ایک طرف کچھ آدمیوں کے مجمع پر پڑی یہ لوگ ایک گھوڑے کا مول کر رہے تھے۔ عظیم بھی پہونچا اسوقت گھوڑے کا سر صرف مجمع کے اندر سے دکھائی دے رہا تھا اور صرف سر ہی کو دیکھ کر عظیم نے اندازہ کر لیا کہ جانور اچھا ہے۔ کانوں کی نوکیلی لویں چوڑی پیشانی ستا ہوا منہ پھولے ہوئے نتھنے چھوٹا سا دہانا اور چمکدار آنکھیں دیکھ کر عظیم نے اسے بہت پسند کیا۔ عظیم نے جب مجمع کے اندر گھس کر اسے غور سے دیکھا تو اس کو سخت حیرت ہوئی۔ مضبوط اور صاف ہاتھ پیر۔ چوڑا سینہ بھاری پشت اور لمبی دم۔ اتنا نفیس گھوڑا یہاں آیا کہاں سے عظیم نے اپنے دل میں سوچا اور پھر جس قیمت پر اس کی گفتگو ہو رہی تھی وہ اور بھی تعجب کن تھی آخر جب دام نہیں پٹے اور سب لوگ یکے بعد دیگرے چلے گئے تو عظیم نے پہلے تو اپنا روپیہ شمار کیا اس کے بعد وہ اس سوداگر کے پاس پہنچا۔

سلام علیکم۔ عظیم نے پہونچتے ہی کہا۔

وعلیکم السلام۔ سوداگر نے جواب دیا۔

مجھے ایک گھوڑے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس مرتبہ میلہ بہت ہلکا ہے اچھے جانور ہی نہیں آئے اور جو ہیں وہ مجھے پسند نہیں تاہم سو روپیہ تک میں تمہیں اس گھوڑے کی قیمت دے سکتا ہوں۔

سوداگر بہت زور سے ہنسا اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "جناب اس طرف چلے جایئے گدھے آپ کو وہاں ملیں گے"

مجھے معلوم ہے اور میں اسی طرف سے آ رہا ہوں اور اگر آپ اس سے زیادہ مانگیں گے تو میں اسی طرف چلا جاؤں گا۔

سوداگر نے عظیم کو غور سے دیکھا اور اس قسم کی گفتگو کو فضول سمجھ کر کہا کہ "میں آپ سے ایکسو اسی روپے لونگا" عظیم نے ایک تنقیدی نظر سے گھوڑے کو دیکھا اور اپنے جی میں کہا۔ یہ جانور اس قیمت میں یا تو بہت سستا ہے یا پھر گراں یہ صاف صاف جوا ہے اگر ہار گئے تو سراسر نقصان اور اگر جیت گئے

تو پھر فائدہ ہی فائدہ۔ چنانچہ اس نے خریدنے کا ارادہ مستقل کرکے اپنے کرتے کے
نیچے سے ایکسو پچاس روپیہ کے نوٹ نکالے اور کہا کہ میرے پاس صرف اسقدر
ہے اب تمہارا جی چاہے تو اس قیمت پر دیدو ورنہ تمہاری خوشی۔ سوداگر نے
کن انکھیوں سے نوٹوں کی طرف دیکھا اور عظیم سے متعجب ہوکر پوچھا آپ
اسپر سواری کرکے دیکھیں گے بھی نہیں۔

نہیں۔ عظیم نے جواب دیا۔

"خیر لے لیجئے خدا آپ کا محافظ ہو"۔ سوداگر نے کہا اور نوٹ شمار
کرنے لگا۔

عظیم نے گھوڑے کی رسی اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے گھوڑے کے
پاس لاکر اس کو بھی باندھ دیا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر گھومنے کے بعد عظیم جب
میلے سے روانہ ہوا تو کافی دیر ہوچکی تھی۔ وہ ابھی راستہ ہی میں تھا کہ اندھیرا
چھاگیا۔ چنانچہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے اس نے شب گذاری
علی الصباح جب عظیم بیدار ہوا تو سب سے پہلے اسکی نظر ایک بہت روشن
ستارے پر پڑی چنانچہ اسنے اپنے اس نئے گھوڑے کا نام "ستارہ" رکھدیا
گھوڑوں کو دانا کھلانے کے بعد عظیم پھر روانہ ہوگیا اور بعد دوپہر اپنے
گاؤں میں پہونچگیا۔ شام کے وقت عظیم نے اپنے باپ کو گھوڑا دکھایا۔ اس کی
خریداری کا قصہ سناتے ہوئے عظیم نے کہا کہ میں دو چار دن میں اس پر
سواری کروں گا۔ "ہاں ہاں" اس کے باپ نے جواب دیا۔ "یہ بہت
نایاب قسم کا گھوڑا ہے تم نے بہت اچھا کیا جو اس کو خرید لیا"۔

"اس کو پھرانے اور شائستہ کرنے کے بعد میں اس کی قیمت کم از
کم ایک ہزار روپیہ وصول کروں گا" اور پھر کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ "اس کے
بعد میں آپ کے حسب منشا شادی کے متعلق غور کرونگا"

عظیم کے باپ نے جس کے چہرہ سے برہمی کے آثار نمایاں ہوچکے تھے
کہا۔ "پہلے مجھے تمہارے لئے دولھن تلاش کرنی ہوگی"۔

"میرا یہ خیال تھا کہ آپ تلاش کرچکے ہوں گے" عظیم نے معصومانہ
انداز سے کہا۔

عظیم کے باپ کی برہمی اور ہوگئی "نہیں" اس نے جواب دیا۔
"مینے محمد اکبر سے اس کے متعلق گفتگو کی لیکن ہمارے ساتھ وہ اس رشتہ
کیلئے تیار نہیں ہے اس کی گفتگو سخت تحقیر آمیز تھی"

عظیم اپنے باپ کی طرف مڑا اسوقت اس کا چہرہ مارے غصہ کے
تمتا رہا تھا۔ "کیا آپ کا اس سے یہ مطلب ہے کہ ہم اس کے برابر کے نہیں
—— ہمارا خاندان اتنا ہی پرانا ہے۔ جتنا کہ محمد اکبر کا" —— "بالکل ٹھیک
میرے بیٹے لیکن تم نے دیکھا ہوگا کہ محمد اکبر اب مالدار ہوگیا ہے وہ اب
بجائے گھوڑوں کے سوداگر کے لڑکے کے۔ اپنی لڑکی کے لئے کسی اور کا
خواہشمند ہے۔ مینے جب اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو پہلے تو وہ
بہت مسکرایا اور کہا۔ کہ "وہ اپنی لڑکی کی شادی کی گفتگو محمد جمال کے
ساتھ کر رہا ہے جو پشاور کے ایک مالدار بیرسٹر ہیں"۔

"اور —— اور —— لڑکی۔ اس کا کیا خیال ہے۔ اس شادی کے
متعلق؟"

عظیم کا باپ ہچکچایا۔ "لڑکی کو اس سے کیا تعلق" اور میرے خیال
میں تو اس غریب کو ابھی اس کا علم بھی نہ ہوگا اور بفرض محال اگر معلوم
بھی ہے تو جہاں اس کا باپ چاہے گا اسکو وہیں شادی منظور کرنا پڑیگی"

"ہوں" عظیم نے کہا اور چلا گیا۔ لیکن اس کی رگوں میں اس وقت
افغانی خون جوش مار رہا تھا۔ "ہرچہ بادا باد۔ دیکھا جائے گا۔ شادی
شادی میں اب کرونگا ہی نہیں"۔

(۳)

بعد کے دو دن عظیم نے اپنے نئے گھوڑے کی تربیت پر صرف کئے۔
لیکن اسوقت بھی محمد اکبر کا جواب اور اس کے گھر کی تحقیر جو اس طرح محمد اکبر کے
ہاتھوں ہوئی تیر او نشتر کی طرح عظیم کے دل میں چبھ رہی تھی۔ لیکن سوائے
خاموشی کے چارہ کار ہی کیا تھا۔ اس کی تمامتر توجہات کا مرکز اب
"ستارہ" تھا۔ عظیم کی یہ انتہائی کوشش تھی کہ وہ اسے خوب اچھی طرح
مانوس کرلے۔ محبت اور اخلاص وہ شے ہے جو بدطینت سے بدطینت کو بھی
وہ چاہے حیوان ہو یا انسان اپنا گرویدہ بنالیتی ہے اور پھر گھوڑا جیسا
عاقل جانور۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہی دن میں "ستارہ" عظیم کی حسب
خواہش اس سے بے حد مانوس ہوگیا۔ تیسرے دن شام کے وقت عظیم نے
کچھ دیر کے لئے اسپر سواری کی چوتھے دن صبح کے وقت ایک گھنٹہ اور
شام کو دو گھنٹہ اسپر بیٹھا اب ستارہ اسقدر شائستہ اور فرمانبردار ہوگیا تھا
کہ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ وہی جنگلی اور خود سر گھوڑا ہے جو کچھ دن قبل

عظیم نے خرید اتھا۔

ایک دن عظیم نے "ستارہ" کو خوب صاف کیا اور اس پر بیٹھ کر روانہ ہوا یہ جس سڑک پر اسوقت چلا جا رہا تھا وہ پشاور کو جاتی تھی۔ عظیم کو خود خبر نہ تھی کہ وہ آخر اس سڑک پر کیوں جا رہا ہے۔ البتہ اس کے دماغ میں ایک پریشان کن اور تکلیف دہ خواہش یہ ضرور تھی کہ وہ اس محمد جمال کو دیکھے جو سلمٰی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ عظیم شام کے وقت پشاور پہنچا اور شب ایک سرائے میں گزاری۔ صبح اٹھ کر عظیم نے ایک پشاوری سوداگر سے جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا۔ محمد جمال کے متعلق دریافت کیا۔ سوداگر نے کہا کہ محمد جمال کنٹونمنٹ میں ایک عالیشان بنگلہ میں رہتا ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے اس کے مراسم صاحب لوگوں سے بھی ہیں۔ دو موٹریں اور متعدد ملازم ہیں۔ میں نے ایکبار ایک گھوڑا اس کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے اتنی قیمت کسی گھوڑے کی نہیں ملی جو گھوڑا جمال کو پسند آجائے اس کی وہ زیادہ سے زیادہ قیمت دینے میں بھی دریغ نہیں کرتا۔

"تو کیا وہ سواری بھی کرتا ہے؟"

سوداگر ہنسا۔ خدا کی قسم کبھی نہیں۔ اس موٹے آدمی کا وزن کوئی گھوڑا برداشت ہی نہیں کرسکتا۔

"پھر کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ گھوڑ دوڑ اس کا مشغلہ ہے اس کے پاس متعدد بہترین گھوڑے ہیں اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنی بیوی بچوں سے زیادہ اپنے گھوڑوں سے محبت کرتا ہے۔

"اچھا تو اس کی شادی ہوچکی ہے"

ہاں ہاں! اس کے چار لڑکیاں ہیں۔ لڑکا کوئی نہیں۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ کسی حسین لڑکی سے دوسری شادی کر رہا ہے۔" سوداگر نے پلک مارتے ہوئے کہا۔ عظیم نے جمال کے متعلق اب کافی معلومات حاصل کرلی تھیں۔ چنانچہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر عظیم کے بنگلہ کی تلاش میں چلا۔ اور بلا کسی زحمت اور دقت کے بنگلہ پر پہونچ گیا۔ پھاٹک پر ایک چوکیدار باقاعدہ وردی پہنے کھڑا تھا۔" یہ بنگلہ محمد جمال ہی کا ہے؟" عظیم نے چوکیدار سے دریافت کیا۔

چوکیدار نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تمہیں میرے آقا سے کیا کام ہے" چوکیدار کا لہجہ اس کے قلبی شکوک کا آئینہ بردار تھا۔ عظیم نے کہا کہ میں ایک گھوڑا فروخت ——— چوکیدار نے جو اسوقت "ستارہ" کو بغور دیکھ رہا تھا بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو میں ابھی انہیں بلاتا ہوں" اور یہ کہتے ہوئے وہ اندر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلا اور چوکیدار نے اشارہ سے عظیم کو بلایا۔ عظیم ستارہ کولے کر آگے بڑھا ہی تھا کہ محمد یوسف بھی اندر سے نکل آیا جمال ضرورت سے زیادہ موٹا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں اور موٹاپے نے ایک ٹھڈی کی بجائے کئی ٹھڈیاں بنادی تھیں اسوقت عظیم نے سلمٰی اور جمال کا موازنہ کیا تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔ خدا کی پناہ! یہ کیا غضب ہے سلمٰی کی شادی محمد جمال کے ساتھ! "تمہارا ہی نام محمد یوسف ہے؟" عظیم نے ایک حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا۔ محمد یوسف نے سر سے پیر تک دیکھ کر کہا۔ "ہاں اے بادیہ نشین" عظیم نے اپنی نظریں اسپر سے ہٹالیں۔ اور منتظر رہا کہ محمد یوسف دوبارہ آغاز گفتگو کرے۔

"تم یہ گھوڑا بیچنا چاہتے ہو؟" محمد جمال نے گھوڑے کو تنقیدانہ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ عظیم نے محسوس کیا کہ جمال کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھوڑے کی موزونی اعضا اور اس کے حسن پر فریفتہ ہیں۔ عظیم ابھی یہی دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو پشاوری سوداگر کی گفتگو یاد آگئی۔ "کہ محمد جمال اپنی بیوی بچوں سے زیادہ اپنے گھوڑوں سے محبت کرتا ہے"۔ "میرے پاس یہ گھوڑا ہے" عظیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن میں اس کو کسی قیمت پر بھی علیحدہ نہیں کرسکتا"۔

بیرسٹر نے ایک قلبی الجھن کے ساتھ عظیم کو غور سے دیکھا۔ "تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟" جمال نے دریافت کیا۔

عظیم نے اپنی آواز کو آہستہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم محمد اکبر کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو۔ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو اور گھوڑا تمہارا ہے!"

یہ سنکر محمد جمال کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مارے استعجاب کے کھلی کی کھلی رہ گئیں اس نے عجیب حیرت سے عظیم کو دیکھا پھر یک بیک اس کے خیال نے پلٹا کھایا۔ پہلے تو موٹے چہرے پر مسکراہٹ کی موٹی موٹی لکیریں نمودار ہوگئیں اور اس کے بعد پھر نا قابل برداشت طریقہ سے جمال نے ہنسنا

شروع کیا اور مارے قہقہوں کے مکان سر پر اٹھالیا اور پھر جب ضبط نہ کرسکا تو پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا "ارے احمق تو کہتا کیا ہے۔ جمال نے ہانپتے ہوئے کہا "واہ خدا کی قسم کیا لاجواب بات کہی ہے۔ ایک گودڑ پوش بادیہ نشین پٹھان کا لڑکا اور سلمیٰ کے ساتھ شادی کی خواہش اور چونکہ پیسہ پاس نہیں اس لئے یہ ڈھانچہ (ستارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس کے بدلے میں دینا چاہتا ہے کسقدر عجیب پیش کش ہے" اب ایکبار پھر جمال کے چہرہ کی رنگت بدلی۔ "بیوقوف!" جمال نے نہایت حقارت کے ساتھ کہا۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ بفرض محال اگر میں راضی بھی ہو جاؤں تو کیا محمد اکبر تجھ ایسے شخص کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی گوارا کرے گا؟ تم ایک غریب آوارہ گرد گھوڑوں کے سوداگر یا نکے ٹھگ ہو! تم کسی لڑکی کو کیا آرام پہونچا سکتے ہو۔ میں ان کے لئے ملازم رکھتا ہوں۔ انہیں نفیس نفیس زیورات دیتا ہوں اور ہر طریقہ کا آرام پہونچاتا ہوں۔ میری بیوی اعلیٰ درجہ کی موٹروں میں سیر و تفریح کو جاتی ہے۔ اور بیش قیمت کپڑے پہنتی ہے۔ سلمیٰ تو پردہ بھی نہ کرے گی۔ وہ انگریز افسر ونکی بیویوں سے ملے گی۔ تمہارے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ تم اپنے پہاڑی غاروں اور چٹیل میدانوں کو واپس جاؤ اور وحشیانہ خون آشامیوں میں اپنی زندگی گزار دو"

عظیم نے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا۔ لیکن اس کی ہتھلیاں جمال کا گلا دبانے کے لئے بیقرار ہو رہی تھیں۔ عظیم نے سوچا کہ چند سیکنڈ کا کام ہے کہ میں اپنا چاقو اس گوشت کے تودے میں پیوست کر دوں اور اس سے بہت کم وقت لگے گا کہ میں اپنے "ستارہ" پر بیٹھکر غائب ہو جاؤں۔ لیکن آخر یہ عظیم اپنے ان ارادوں پر غالب آیا اور اس خیال کو ترک کر دیا۔

محمد جمال نے پھر سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے کہا۔ آج شام کو میں محمد اکبر کے یہاں جا رہا ہوں اور وہاں میرے اور ان کے اعزہ جمع ہونگے اور رسم منگنی کی ادائیگی ہوگی۔ بہتر ہے کہ تم اب واپس جاؤ! اور اللہ تمہیں عقل عطا کرے۔

"بہتر ہے او موٹے" عظیم نے اسی لہجے میں جس میں محمد جمال گفتگو کر رہا تھا جواب دیا "میں جاتا تو ہوں لیکن جب تم اپنے مستقبل پر نظر ڈالو تو یہ یاد رکھنا کہ تم نے میرے گھر کی بے عزتی کی ہے اور میرے گھر کے کسی ایک فرد نے بھی کبھی آج تک بلا اپنی بے عزتی کا بدلہ لئے ہوئے نہیں چھوڑا۔ چاہے وہ کوئی ہو"

یہ کہکر اور جست کرکے عظیم اپنے گھوڑے کی زین پر پہونچا اور اس زور سے گھوڑے کو موڑا کہ جمال اس کی ٹاپوں سے بچنے کے لئے بدحواس ہو کر ایک طرف سمٹ گیا۔ اور عظیم جمال کی طرف اپنی مٹھی دکھاتا اور دانت پیستا ہوا پھاٹک سے باہر نکلا۔ اور گھوڑے کو تیز کرکے پہاڑی راستہ پر چھوڑ دیا اسوقت عظیم کا دل مارے غصہ کے تڑپ رہا تھا۔ صرف اپنی امیدونکی ناکامیابی ہی اس کے لئے باعث رنج والم نہ تھی۔ بلکہ اپنے گھر کی تحقیر اور تذلیل کا احساس بھی تھا جس کو وہ بلا بدلہ لئے چھوڑے جاتا تھا اگر عظیم کو مجبورًا اس شادی سے کے لئے تیار رہنا پڑا ہوتا جیسا کہ عمومًا طریقہ ہے تو اسکو ذرہ برابر بھی پروا نہ ہوتی لیکن یہ ان لوگوں میں تھا جو اپنے ارادے خود قائم کرتے ہیں۔ اور پھر ان ارادوں کو بہرصورت تکمیل تک پہونچانے میں کسی چیز کی بھی پروا نہیں کرتے۔ عظیم نے سلمیٰ کے ساتھ شادی کا ارادہ مستقل کر لیا تھا۔ اور اب صرف تقدیری امور ہی اس کو اپنے اس خیال سے باز رکھ سکتے تھے۔ محمد جمال کا خیال اور اس کے تذلیل آمیز جملے اس وقت عظیم کے زخم خوردہ دل پر نمک پاشی کر رہے تھے۔ سرحدی خون اس وقت اس کی رگوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اور جوشِ غضب کی وجہ سے آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ کہ سلمیٰ کا خیالی پیکر اپنی تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اس کے سامنے آموجود ہوا۔ اس وقت عظیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے سلمیٰ اس سے اپیل کر رہی ہے کہ مجھے جمال کے پنجہ سے بچاؤ۔ عظیم کیا تم مجھے اسقدر جلد بھول گئے —— کیا مجھ پر نازل ہونیوالی آفت کی تمہیں پروا نہیں.......

عظیم نے فورًا اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اس وقت شدت غضب سے اس کی آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ جوش غضب نے نیک و بد کی تمیز مٹا دی تھی۔ اور انتقام کے خوفناک دیوتا نے حق و باطل سے یکسر بے نیاز کرکے اپنے تمام شیطانی ارادوں کو اسپر مستولی کر دیا تھا۔ عظیم نے اپنے ہونٹوں کو جو شدت غضب کے باعث خشک ہو گئے تھے۔ زبان سے تر کیا اور گھوڑے کو بجائے اپنے پہاڑی گاؤں کی طرف لے جانے کے محمد اکبر کے گاؤں کی طرف موڑ دیا جس کے مشرقی کنارے پر ایک سرسبز و شاداب باغ کے درمیان محمد اکبر کا مکان تھا۔

(۴)

اگرچہ رات اندھیری نہ تھی لیکن آسمان پر سیاہ سیاہ بادلوں کے ٹکڑے چاند کو اپنے دامنوں میں چھپائے ہوئے تھے اس لئے جب کبھی چاند بادل سے باہر آجاتا تو چاندنی پھیل جاتی اور جب پھر بادل کے ٹکڑے آجاتے تو اندھیرا ہوجاتا۔ اسی حالت میں عظیم نے باہر ہی باہر لوگوں کی نظر بچاتے ہوئے گاؤں کا چکر کاٹا اور محمد اکبر کے باغ میں پہونچکر مکان سے دور مغربی گوشہ میں درختوں کی جھاڑیوں کی آڑ لے کر گھوڑے سے اترا ایک تاریک کنج میں تو گھوڑے کو باندھ دیا اور خود نہایت ہوشیاری کے ساتھ ہر طرف آہٹ لیتا ہوا محمد اکبر کے مکان کی پشت پر پہونچا اسوقت چاند ابر میں چھپا ہوا تھا اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اوپر کی منزل کی ایک کھڑکی جو پشت کی جانب تھی کھلی ہوئی تھی۔ اندر تیز روشنی کا ایک لیمپ روشن تھا۔ کچھ لوگ حقہ پی رہے تھے کچھ ہنس بول رہے تھے اور کچھ سنجیدگی اور متانت سے بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ان سب کی آوازیں مع حقہ کی گڑگڑاہٹ کے عظیم پشت پر سے سن رہا تھا اس کو یقین ہوگیا کہ رسم منگنی کی ادائیگی کے سلسلے میں یہ خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ عظیم ذرا اور آگے بڑھا تو وہ اس کھڑکی کے نیچے پہونچا۔ جس میں سبز پردے پڑے تھے اور جس میں کھڑے ہو کر پہلی بار روانگی کے وقت سلمیٰ نے سرخ رومال ہلاکر اس کو خیرباد کہا تھا۔ اسوقت عظیم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا یہ سلمیٰ کا کمرہ ہے! وہ اسوقت یقیناً یہیں ہوگی۔ لیکن کیا وہ تنہا ہوگی؟ کھڑکی نصف کھلی ہوئی تھی۔ اور سبز پردہ ہوا میں ادھر ادھر اڑ رہا تھا۔ عظیم اسوقت ہمہ تن اندر کی آہٹ لینے میں مشغول تھا لیکن بہت دیر تک جب کسی قسم کی کوئی بھی آہٹ نہ ملی۔ تو پہلے ہر چہار طرف نظر ڈالکر اپنا اطمینان کیا اور پھر پیروں سے چپلی اتار کر اور کھڑکی کی دہلیز پکڑ کر جو اوپر اچھلا تو بجلی کی ایسی تیزی اور خاموشی کے ساتھ وہ کھڑکی اور پردہ کے درمیان میں پہونچگیا۔ یہاں کچھ دیر ٹھہر کر اسنے پھر آہٹ لی تو اس کو بہت آہستہ آہستہ سانسوں کی آواز آتی معلوم ہوئی اسوقت کمرہ میں بالکل اندھیرا تھا۔ جب عظیم کی آنکھیں اس اندھیرے سے مانوس ہوئیں۔ تو عظیم نے دیکھا کہ اس کمرہ میں صرف ایک شخص ہے جو سو رہا ہے۔

اسوقت آسمان پر عین کھڑکی کے مقابل چاند اپنی پوری آب و تاب سے ساتھ چمک رہا تھا عظیم نے سبز پردہ کو ایک جانب ہٹایا تو کمرہ میں کافی روشنی پہونچ گئی۔ عظیم پردہ کو ہٹا کر جو دوبارہ اس سونے والے کے پاس آیا۔ تو اس کا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ یہ سلمیٰ تھی جو ایک کوچ پر لیٹی محو خواب تھی۔ چہرہ کسی اندرونی فکر اور پریشانی کے باعث زرد تھا۔ سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اور برہنہ کلائی پر سر رکھے سو رہی تھی۔

عظیم نے پہلے تو اپنی سانس کو روکا اور پھر آہستہ سے آواز دی "سلمیٰ"۔

سلمیٰ نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحہ کے لئے نہایت استعجاب سے عظیم کو دیکھا پھر اس کے ہونٹ کھلے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیخنے ہی والی ہے۔ لیکن ——

"میں ہوں تمہارا عظیم" عظیم نے جلدی سے کہا۔ اور یہ سنکر سلمیٰ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

تم۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ سلمیٰ نے سخت متحیر ہو کر دریافت کیا۔ تم یقینی پاگل معلوم ہوتے ہو۔ تمام گھر میرے اعزہ سے بھرا ہوا ہے۔ اگر اس وقت میرے منہ سے چیخ نکلجاتی تو سب لوگ یقینی دوڑ پڑتے اور پھر ظاہر ہے کہ تمہاری زندگی کے لالے پڑ جاتے۔

ہاں۔ عظیم نے جواب دیا۔ صرف تمہارے [illegible] کی دیر ہے۔

"تمہارا اس سے مطلب؟"

"تو کیا اس جمال سے تم شادی کرنے پر رضامند ہو۔"

"میں مجبور ہوں۔ میرے باپ کی خواہش یہی ہے"۔

"اور تمہاری کیا خواہش ہے"۔

"اس سے تمہیں غرض"

"سنو" عظیم نے کہا "جس بھدے مگر مالدار شخص سے تمہاری شادی ہو رہی ہے اس کو تم نے دیکھا بھی ہے"۔

"سلمیٰ نے اثبات میں سر ہلایا"۔

"تم اس کے ساتھ یقیناً ایک آرام زندگی گزارو گی۔ موٹروں پر سیر و تفریح کے لئے جاؤ گی۔ جواہرات اور قیمتی کپڑے تمہارے بدن پر ہونگے اور دسیوں خادمائیں اور ملازم تمہارے احکامات کے منتظر رہیں گے ...."

"تو آخر تم چاہتے کیا ہو تمہارا مطلب کیا ہے؟ میری قسمت کا لکھا

میرے سامنے آ رہا ہے - اللہ کی مرضی یہی معلوم ہوتی ہے"۔

"پیاری سلمٰی سنو۔ مجھ سے آج پوچھا گیا کہ میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس کو کیا دے سکتا ہوں اور اس کے لئے کیا کیا سامانِ آسائش بہم پہونچا سکتا ہوں"۔

"کیا تم سننا چاہتی ہو"

"سننے سے فائدہ - اس کے علاوہ میرے لئے اب اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

میں اپنی ہونیوالی بیوی کو سنگلاخ پہاڑیوں کی سخت اور تکلیف دہ زندگی پیش کرتا ہوں۔ بجائے ملازمین کے میری بیوی گھر کا کل کام خود کریگی اور سب کو آرام پہونچائے گی۔ رائفلوں کی آوازیں اس کی شب خوابی میں اکثر و بیشتر مخل ہوا کریں گی۔ اس کے بعض لمحے سخت انتظار میں گزریں گے اور پھر ایسی صورت میں جبکہ دشمنوں پر شبخون مارنے کے بعد گاؤں کے اور لوگ واپس آگئے ہوں اور ان میں سے بعض دفعہ سب لوگ واپس بھی نہیں آئیں گے۔ . . . . ایسی ہی زندگی میری ماں نے گزاری اور ایسی ہی تمہارے باپ کے ساتھ جانے سے قبل تمہاری تمہاری ماں نے - لیکن میرے بچے ایسے موٹے اور بھس نہ ہوں گے جیسے محمد جمال کے ہوں گے - وہ مرد ہوں گے - باہمت اور شجاع"۔

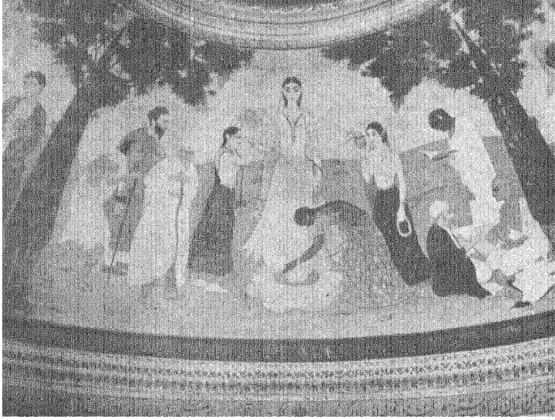
"ایسے ہی جیسے ان کا باپ" سلمٰی نے اسقدر آہستگی سے کہا کہ عظیم اس کو سمجھ نہ سکا"۔

"ایک ایسا راستہ بھی ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں" عظیم نے کہنا شروع کیا۔ اور اس راستہ میں صرف خاص خاص گھوڑے جیسا کہ میرا ہے مجھے اور ایک کسی اور کو قبل طلوعِ آفتاب نہایت آسانی اور اطمینان کے ساتھ میرے پہاڑی گاؤں میں پہونچا سکتے ہیں"

سلمٰی اٹھی اور خاموشی کے ساتھ عظیم کے سامنے کھڑی ہوگئی - ایک لمحہ کے لئے اس کے چہرہ کو غور سے دیکھا اور پھر بولی "آؤ پیارے عظیم آؤ مجھے اپنے گھوڑے تک لے چلو - تاکہ سورج نکلنے سے قبل ہم اپنے پہاڑی گاؤں میں پہونچ جائیں"

. . . .

(محمد اختر صفوی)



MURAL PAINTINGS.

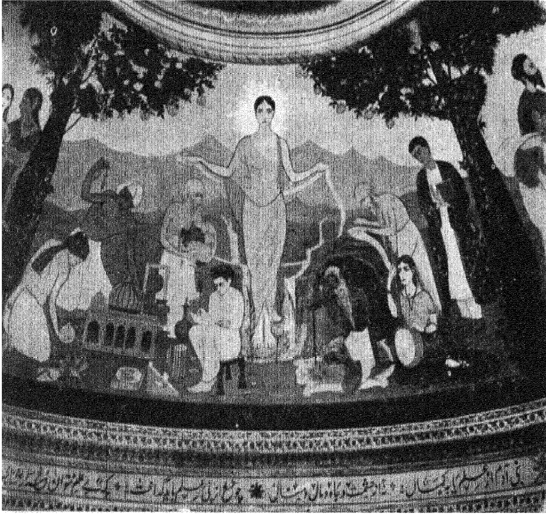
فیضی رحمان کا ایک بے مثل کارنامہ۔

نیو دہلی کی شاہی عمارتوں کی دیواروں کو
جن رنگین تصاویر سے اُنہوں نے منقش کیا
ہے۔ اس کے چند نمونے یہاں درج ہیں ۔



جنگ کی تصویر ۔





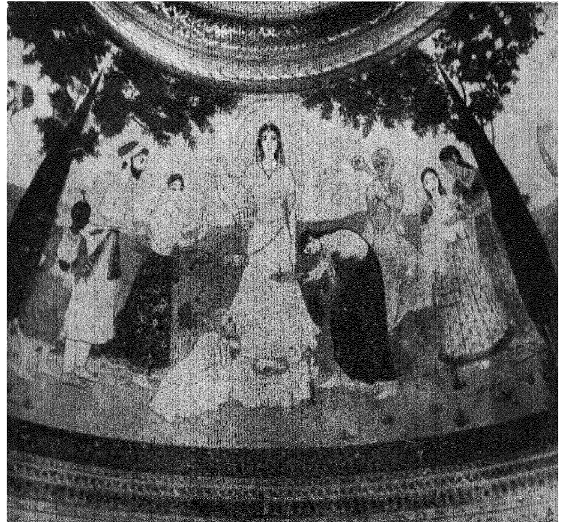
MURAL PAINTINGS

فیضی رحمان کی آرٹ کے چند نادر نمونے
جو دہلی کی شاہی عمارات پر نقش
کئے گئے ہیں ۔

جستجوئے علم ۔



محبت و پیار ۔



امن و سلامتی ۔

سامانِ حیات

(علامہ وصل بلگرامی مدظلہ العالی)

پھر مرے جذبات نے جینے کا ساماں کر دیا
پھر انہیں آمادۂ لطفِ فراواں کر دیا

پھر جنونِ دل نے محوِ رازِ عرفاں کر دیا
کافری کو وہ جلا بخشی کہ ایماں کر دیا

پھر کسی نے یوں اُٹھایا صحنِ گلشن میں رباب
باغ کے ہر ایک ذرّے کو غزل خواں کر دیا

پھر دلوں میں سرفروشی کی تمنا جاگ اُٹھی
پھر کسی سفاک نے بانہوں کو عریاں کر دیا

پھر لگاوٹ نے کسی کی زخمِ دل کے بھر دیئے
پھر تبسم نے کسی کے گل بداماں کر دیا

پھر بنایا دل کو اُس چشمِ کرم نے حق شناس
پھر دیارِ کفر پرور کو مسلماں کر دیا

پھر اُسی مشکل کو کہتی ہے جسے دُنیا حیات
میرے حق میں جلوۂ جاناں نے آساں کر دیا

پھر اُٹھایا خوے کرم سے ہاتھ اُس بدمست نے
عشق کو پھر قائلِ عمرِ گریزاں کر دیا

پھر رُخِ گلرنگ سے یوں حسن نے اُلٹی نقاب
مجھ پہ خود میرے ہی جلووں کو نمایاں کر دیا

پھر لبِ رنگین و چشمِ ناز کو جنبش ہوئی
حسن نے پھر ایک عالم میں چراغاں کر دیا

پھر کوئی انگڑائی لے کر مسکرایا باغ میں
چاک پھر ہر پھول نے اپنا گریباں کر دیا

اُس نے پھر جمعیّتِ خاطر کی دی مجھ کو نوید
پھر مرے شانوں پہ زلفوں کو پریشاں کر دیا

ہو گیا پھر فطرتِ آدم سے قائم حسنِ ظن
اُس نے پھر مجھ کو رفیقِ نوعِ انساں کر دیا

پھر دکھا کر حُسن نے جلوے مآلِ عشق کے
نشترِ غم کو مرے حق میں رگِ جاں کر دیا

پھر نویدِ جانفزا دی کھُل کے زلفِ یار نے
کافری نے تازہ پھر اک بار ایماں کر دیا

دردِ دل میں بھر کے پھر اُس کے تبسم نے مزہ
خار کو منجملۂ گلہائے خنداں کر دیا

پھر دیا ظالم نے پائے ناز پر اذنِ سجود
پھر سکونِ عزمِ پابوسی کو رقصاں کر دیا

دل میں پھر روشن ہوئے بجھتی امیدوں کے چراغ
پھر کسی ماتھے کی افشاں نے چراغاں کر دیا

پھر اُلٹ دی رُخ سے بازارِ محبت میں نقاب
حُسن نے پھر جنسِ برنائی کو ارزاں کر دیا

التفاتِ خاص سے دیکھا پھر اُس نے اِس طرف
ہم نے پھر کون و مکاں کو اُس پہ قرباں کر دیا

جَور پھر حد سے گزر کر بن گیا لطف و کرم
مشکلوں نے بڑھ کے پھر اپنے کو آساں کر دیا

آج پھر آیا وہ ہنستا۔ مُسکراتا جھومتا
آج پھر اُس نے گلستاں کو گلستاں کر دیا

عشق کی خاموشیوں کا پھر ہوا اِتنا اثر
حسن نے خود ہی محبت کو نمایاں کر دیا

پھر مری امید سے بڑھ کر کیا اُس نے سلوک
پھر مری مایوسیوں کو **وصل**! حیراں کر دیا

تصوّرِ یار

(از جناب محمود صاحب اسرائیلی)

(۱) ریاضِ چرخ سے قوسِ قزح کو توڑا ہے
بہارِ خلد سے حسنِ ازل نچوڑا ہے
چراغِ طور کو کچھ ٹمٹماتا چھوڑا ہے
جمالِ یار کے منظر دکھا رہا ہوں میں

(۲) کبھی ہے آئینۂ ماہتاب پیشِ نظر
کبھی ہے حسنِ رُخِ آفتاب پیشِ نظر
کبھی ہے گلکدۂ لاجواب پیشِ نظر
رخِ حبیب سے پردے اُٹھا رہا ہوں میں

(۳) میں پہلے مژہ سے نقش و نگار تو کرلوں
وفا کا رنگ بھروں پائیدار تو کرلوں
میں چشمِ شوق کو اس پر نثار تو کرلوں
شبیہِ یار تو دل میں جما رہا ہوں میں

(۴) وہ بزمِ دل میں ذرا دیر تو ٹھہر جاتے
خیال ہی کی طرح آتے اور گذر جاتے
وہ میری حسرتِ مُردہ تو زندہ کر جاتے
کہ پھر چراغِ محبت جلا رہا ہوں میں

(۵) فلک کے جَورِ جہاں کے عتاب دیکھ چکا
میں غم پرست قیامت کا خواب دیکھ چکا
وہاں کا رنگِ عذاب و ثواب دیکھ چکا
اب اُن کو چھیڑ کے فتنے جگا رہا ہوں میں

(۶) بہارِ خلد کی آتش کو سرد کرنا ہے
جمالِ حُور کے غازہ کو گرد کرنا ہے
اُنہی کو جملہ حسینوں میں فرد کرنا ہے
زمیں پہ چھوٹی سی جنت بنا رہا ہوں میں

قدیم یونان کا ایک دلچسپ ڈرامہ

انسان اور پتھر کی جنگ

انسان کی خود غرضی اور مجسمہ کی قربانی

(انسانی تخلیق کی کارفرمائی اور اُس کے خوفناک نتائج)

افراد

- پگمیلین .... ایتھنس کا مجسمہ ساز (فن کار)
- لیوسی پس .... ایک فوجی سپاہی
- کرائسس .... ایک رئیس اور علوم و فنون کا سرپرست
- اگیماس .... کرائسس کا غلام
- میموس .... پگمیلین کا غلام
- گلیشیا .... ایک پتھر کا مجسمہ جو بعد کو زندہ ہو گیا۔
- سائینسکا .... پگمیلین کی بیوی
- ڈیفنی .... کرائسس کی بیوی
- مائرین .... پگمیلین کی بہن

جائے وقوع - قدیم یونان -

سین

[دارالخلافہ میں پگمیلین کا اسٹوڈیو - کمرے میں ہر چہار طرف سنگین مجسموں کے بہترین نمونے رکھے ہوئے ہیں جن میں وینس کا قد آدم مجسمہ بھی شامل ہے - کمرے کے ایک حصے میں "گلیشیا" کا ایک بت ایستادہ ہے جس کو حاضرین کی نگاہوں سے پردہ کے ذریعہ پوشیدہ کر دیا گیا ہے ؛

میموس غلام ایک نامکمل مجسمہ کو درست کرنے میں مصروف ہے -

"اگیماس" دہنی طرف سے بھڑک دار لباس پہنے ہوئے داخل ہوتا ہے]

اگیماس - (مغرورانہ انداز سے) پگمیلین کا اسٹوڈیو یہی ہے ؟

میموس - جی ہاں - فرمائیے -

اگیماس - تم پگمیلین ہو ؟

میموس - جی میں اُن کا غلام ہوں -

اگیماس - ہوں - پگمیلین کے پاس غلام بھی ہیں -

ایک سنگتراش کے گرد غلام گردش کریں اور اُس کے اشاروں پر رقص - اُس کے کوڑوں کے سامنے اپنی پشت پیش کریں - اور اُس کی آواز پر سر تسلیم خم -

دنیا میں کیسا انقلاب آگیا - !!

میموس - کیا حکم ہے جناب !

اگیماس - آج پگمیلین کو کرائسس نے طلب کیا ہے -

ٹھیک ساڑھے تین بجے - اُسے اطلاع دیدینا !

میموس۔ کیا آپ ہی کرائسس ہیں ؟

اگیساس۔ میں ! نہیں میں کرائسس تو نہیں ہوں۔

میموس۔ ان کے بھائی ہیں۔

اگیساس۔ نہیں۔ دراصل میں اُن کا غلام ہوں۔

میموس۔ (خوش ہوکر) غلام!

اگیساس (فخریہ) میرا نام اگیساس ہے۔

میموس۔ (قہقہ لگاکر) اگیساس کی پیشانی پر بھی غلامی کا داغ ہے۔
وہ بھی اپنے آقا کے گرد گردش کرتا ہے۔
اور اس کے اشاروں پر رقص۔
اس کے کوڑوں کے سامنے اپنی پشت پیش کرتا ہے
اور اُس کی آواز پر سر تسلیم خم [خوب ہنستا ہے]

ل۔ بے وقوف۔ کرائسس کی غلامی حکومت کرنے سے
جو بہتر ہے۔ اُس کے کوڑوں کی ضربیں میری پشت پر
کی بدھیاں بنجاتی ہیں۔ اور اس کا غیظ و غضب چاندی
نے کے سکے۔ بتا اب کیا کہتا ہے؟
بو تا آپ کو یہی توفیق دے۔ مگر یہ کرائسس ہے کون؟
وہ کرائسس کو نہیں جانتا۔ کیا ایتھنس میں رہ کر بھاڑ جھونکا ہے
س۔ ایتھنس ہیں کرائسس جیسے ہزاروں چیتھڑے ہیں۔

اگیساس۔ کم عقل۔ کرائسس اس وقت ایتھنس کا چراغ ہے اور علوم و فنون کا سرپرست۔ غریبوں کا مددگار۔ اور دولت و امارت کا واحد اجارہ دار۔ جس کے دسترخوان کے بچے ہوئے ٹکڑوں پر پگمیلین جیسے ہزاروں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سمجھا!

[پگمیلین بائیں جانب سے داخل ہوتا ہے]

پگمیلین۔ تم کون ہو؟

اگیساس۔ (بیٹھے ہی بیٹھے) میں کرائسس کا خادم ہوں (فخریہ) اور میرا نام اگیساس ہے۔ سرکار نے تمہارے حال زار پر توجہ فرمائی ہے وہ تمہارے ہنر کی داد دیتے ہیں اور تم کو اپنی حضوری میں طلب کرتے ہیں۔ تمہاری تقدیر پلٹتی ہے۔ جاؤ اور سر کے بل جاؤ۔ کیونکہ ایسا قدردان رئیس قسمت ہی سے ملتا ہے۔ لیکن اس کے حضور میں ذرا عقل سے کام لینا۔ کیونکہ اس کی ایک آنکھ میں رحم ہے اور دوسری میں قہر۔

پگمیلین۔ تیرے الفاظ تیرے آقا کی کم ظرف طبیعت کا آئینہ ہیں۔ بدتمیز

[اگیساس اٹھ کھڑا ہوتا ہے]

میری طرف سے جاکر کہدے کہ تیری دولت و ثروت کو دور ہی سے سلام ہے۔ کیونکہ اس مقدس فن کا پرستار دولت سے مستغنی ہے اور بے نیاز۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ آرٹ ایک سرمایہ دار کی دسترس سے باہر ہے۔ اور اُس کی گردن چاندی کے طوق سے آزاد۔ دنیا کی حکومت کا تاج دراصل اسی کے سر پہ ہے۔ اس لئے دولت کا فرض ہے کہ وہ خود آکر حق غلامی ادا کرے

اگیساس۔ کیا یہ ایک سنگتراش بول رہا ہے؟

پگمیلین۔ (غصہ میں) ہاں جو غیظ و غضب سے بپھرا ہوا ہے۔

[اگیساس پیچھے ہٹتا ہے]

دور ہو جا میرے سامنے سے اور اپنے مالک سے یہی کہدے کمبخت!

[اگیساس دہنی جانب سے نکل جاتا ہے]

[میموس اس کے جانے تک کام میں مصروف ہے]

جاہل اور بدتمیز۔ (سائنکا بائیں جانب سے داخل ہوتی ہے)

سائنکا۔ خیر تو ہے پگمیلین!

پگمیلین۔ کرائسس نے اپنے غلام کو بھیجا تھا تاکہ تہی دست فن کار خود پسند دولتمند کا طوق غلامی پہن لے۔

سائنکا۔ ایک ادنےٰ غلام کی فطری زبان درازی کا گلہ بالکل فضول ہے اس خیال کو دماغ سے نکال ڈالو۔ آخر اپنی چھینی اٹھا کر اپنے کام میں کیوں نہیں مصروف ہوتے۔ تم کو معلوم ہے کہ آج کے لئے میں تم سے رخصت ہو رہی ہوں۔ اس لئے اس آدھ گھنٹہ کو جو میری روانگی میں باقی ہے۔ بہترین مصرف میں کیوں نہیں لاتے۔ دیکھو میں اس انداز سے کھڑی ہوتی ہوں۔ ٹھیک ہے نا!

پگمیلین۔ میرے ہاتھوں میں رعشہ ہے اور دل پر بوجھ۔
میں آرام چاہتا ہوں۔

سائنسکا - بہتر ہے آرام کرو - اور اتنی دیر اپنے شاہکار مجسمے کو دیکھو تاکہ سکونِ قلب میسر ہو —— لو

[پردہ ہٹاتی ہے - گلیشیا کا مجسمہ نظر آتا ہے -]

پگمیلین - ضرور - اس کے دیدار سے مجھے کیوں نہ سکون قلب حاصل ہو کیونکہ دراصل میرا شاہکار نقل ہے - دستِ قدرت کے شاہکار یعنی "سائنسکا" کی -

سائنسکا - افسوس کہ یہ مجسمہ تیرا شاہکار ہونے کے باوجود بھی اعتراضات کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا - تیرے سرپرست حسب دستور اسمیں بھی عیب ہی نکالتے ہیں -

پگمیلین - کیا ؟

سائنسکا - اُن کا خیال ہے کہ پگمیلین کے تمام مجسموں کے شانوں پر سر ایک ہی ہے

[بیچ میں آتے ہوئے]

اور وہ سائنسکا کا ہے -

پگمیلین - بس یہی نقص ہے - واہ

دیوتاؤں نے جس مسرت کا تنہا مالک میری خوش نصیب ذات کو قرار دیا ہے - میرا احسان ہے کہ میں اُس کا پرتو اپنے فن میں تحلیل کر کے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہوں - تاکہ وہ بھی اُس سے لطف اندوز ہو سکے - [اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر]

اگر تیرے چہرے سے ارفع و اعلیٰ مرقع مجھ کو نظر آئے گا تو میں اُس کو پیش کرونگا -

سائنسکا - (مضطرب ہو کر) معاف کیجئے! کسی دوسرے سر کی تلاش خواہ وہ حسن مجسم ہی کیوں نہ ہو مجھے گوارہ نہیں - کسی اجنبی ماڈل سے تم کو مطلب ہی کیا - جبکہ میں تمہاری خدمت کے لئے حاضر ہوں اور میرے خط و خال تمہارے فن کے لئے وقف - اس لئے جس طرح چاہو اُن کی عکاسی کرو - [مجسمہ کے دہنی جانب جا کر]

حالانکہ اس حسین بت کو اپنی شبیہ خیال کرنا میری عین حماقت ہے بھلا میری صورت میں وہ دلکشی کہاں جو اس نقلی مورت میں ہے

پگمیلین - [بیٹھے ہی ہوئے] واہ - ہو بہو تیری نقل ہے - سرِ مو فرق نہیں

سائنسکا - نہیں - اس کے چہرے کے خطوط کی دلکشی اور اس کے اُبھرے ہوئے نقوش کی نرمی - اس کی خمیدہ ابرو - مست شباب آنکھیں - اور مصفا پیشانی البتہ یادگار رکھی جا سکتی ہیں - میرے گذشتہ حسن و جمال کی جبکہ اب سے دس برس قبل میں ایتھنس کے ایک محفوظ گوشۂ چمن میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی - اور میرا پگمیلین مجھ کو دعوتِ عشق دے رہا تھا - یہ ابروؤں کا بل - تھر تھراتے ہوئے ہونٹ اور شرم و حجاب سے جھکا ہوا چہرہ اسی منظر کی یاد دلا رہا ہے آہ مجھ میں اور اس مجسمہ میں یہی فرق ہے کہ مجھ میں انقلاب آگیا اور یہ اس کی زد سے محفوظ ہے -

پگمیلین - وقت کی پرواز کا گلہ کرنا لاحاصل ہے - وہ چشم زدن میں تیری منزل سے گذر چکا اور اب اُس کا پلٹنا محال ہے -

کیا تو اس کے پروں کو کترنا چاہتی ہے ؟ یا اس امر سے ناراض ہے کہ وہ تیرے قریب سے گذرا اور ایسے حسین چہرے پر اپنے بوسوں کے نشانات کیوں چھوڑ گیا

[سائنسکا بیٹھ جاتی ہے]

[ماٹرین دہنی جانب سے دوڑتی ہوئی آتی ہے]

ماٹرین - پگمیلین - تجھے ایک خوشخبری سناؤں ؟

پگمیلین - ہاں سنا میری بہن -

ماٹرین - (لجاتے ہوئے) پہلے میموس کو ہٹا دے -

پگمیلین - [میموس کو اشارہ سے ہٹا دیتا ہے] اب تو کہے گی ؟

ماٹرین - "لیوسی پس"..........

سائنسکا - کہو -

ماٹرین - (پگمیلین سے) جو کبھی تیرا ہم مکتب تھا اور تجھ کو ایک دوست کی طرح سے چاہتا تھا - اب ایک حقیقی بھائی کی طرح سے چاہنے لگا ہے -

پگمیلین - یہ تو کوئی نئی بات نہیں -

شاید تیرا مدعا کچھ اور ہے -

ماٹرین - ہاں - (شرمیلے انداز سے) وہ تیری بہن کا خواستگار ہے

پگمیلین - (اچھل کر) خوشخبری !

مرحبا بہن میں تجھے مبارکباد دیتا ہوں - اس بات پر ادھر آ

تاکہ میں تجھے پیار کروں۔

[اس کا بوسہ لیتا ہے]

[وہ سائنسکا کے سامنے جھکتی ہے اور وہ بھی اس کا بوسہ لیتی ہے]

سائنسکا - ذرا تفصیل سے بیان کرو میرین! کہ یہ شرمیلا لجیلا اکھڑ سپاہی اقرار محبت کرنے پر کس طرح قادر ہو سکا۔

[لیوسی پس دہنی جانب سے نمودار ہوتا ہے]

ماٹرین - کیوں۔

لو وہ آگئے۔ [خود جا کر ساتھ لاتی ہے]

یہ آپ بیتی خود ہی بیان کریں گے۔

لیوسی پس - (جھینپتے ہوئے) حقیقت یہ ہے کہ میں اس فن سے ناواقف ہوں اور اس منزل سے ناآشنا میری تعریف یہی ہے کہ میں ایک اُجڈ سپاہی ہوں۔ اور بس۔ اگر میں ایک حسین دوشیزہ کے دل پر فتح پا سکا تو محض حسن اتفاق ہے۔ کیونکہ میں خوش قسمت ہوں۔ خوش تدبیر نہیں۔ میں کیا جانوں چہرے کو حسب ارادہ مغموم بنانا۔ بات بات پر آہ کرنا۔ قدم قدم پر اشعار پڑھنا۔ آنکھوں کو اشک آلود کرنا اور اپنے محبوب کو الفاظ کے جال میں اس طرح جکڑنا کہ وہ بے بس ہو جائے۔ شروع میں کوشش کی تھی۔ لیکن آواز گلوگیر ہو گئی۔ الفاظ ذہن سے محو ہو گئے۔ پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی اور لبوں پر مہر لگ گئی۔" میرین" نے میری بے بسی پر قہقہے لگائے۔ لیکن اُس کی صفائی قلب کی داد دیتا ہوں۔ وہ میرا مطلب سمجھ چکی تھی اس لئے خود ہی اس نے میری مشکل کشائی کر دی۔

ماٹرین - سچ کہتی ہوں پگمیلین۔ میں خود نہیں کہہ سکتی کہ اتنی کڑی منزل کس طرح طے ہو گئی۔ ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور میں ان کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی جب میں نے دیکھا کہ میرا بہادر سپاہی لیوسی پس ایک طفل مکتب کی طرح اسوقت شرم و حجاب کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے تو مجھ رحم آگیا۔ میرا بھی دل بھر آیا۔ اور جذبات اُمنڈ اُمنڈ کر آنکھوں کی راہ بہنے لگے۔ اس کے بعد میں خود فراموش ہو گئی۔ یہاں تک کہ جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ برف کی دیوار جو ہمارے درمیان حائل تھی پگھل چکی تھی اور ہم دونوں ——

لیوسی پس - دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے سے ہم آغوش تھے

[اسے گلے لگاتے ہوئے]

بتاؤ میرے دوست تم اس رشتہ سے ناراض تو نہیں ہو۔

[اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے]

پگمیلین - [ہاتھ کو دباتے ہوئے]

کمال کرتے ہو! میری خوشی کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ کاش میں مخفی طور سے اس مقام پر موجود ہوتا اور تم دونوں کے جذبات کی کشمکش کا تماشہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔ تاکہ میں اس معصوم محبت کے ان لاثانی مناظر کو پتھر پر نقش کر کے لازوال بنا سکتا۔

لیوسی پس - ہم دونوں اب بھی حاضر ہیں۔ ماٹرین! میری جان! آؤ ہم گذشتہ منظر کی تجدید کریں۔

پگمیلین! تم اپنی مٹی منگاؤ۔ ہم تم کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری نشست میں سرمو فرق نہ ہوگا۔

[دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں آتے ہیں]

سائنسکا - وہ جذبات تمہارے چہروں پر دوبارہ نمودار نہیں ہو سکتے۔ بتاؤ۔ ماٹرین کو دیکھتے ہی تمہارے گالوں پر جو معصومیت کی سرخی دوڑ گئی تھی اب وہ کہاں گئی۔

لیوسی پس - اُس کا رنگ ہلکا تھا۔ اس لئے ہم نے اُسے ہمیشہ کے لئے دھو ڈالا۔

[ماٹرین کا بوسہ لیتا ہے اور اس کو اپنے دہنی طرف بٹھا لیتا ہے]

پگمیلین - [مجسمہ کو بناتے ہوئے] اپنے شوہر کی نگرانی کرتی رہنا۔ ماٹرین کیونکہ تو اس قدر خوش قسمت نہیں ہے جسقدر کہ تیری بھاوج۔

[سائنسکا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو بائیں طرف بیٹھی ہے]

ماٹرین - [دہنی جانب بیٹھی ہوئی ہے اور لیوسی پس اُس کی پشت پر ہے]

یعنی ؟

سائنسکا - یہ ایک افسانہ ہے عجیب و غریب - اُس وقت کا جبکہ میں آرٹس کے مقدس مندر کی راہبہ تھی اور ایسی راہبہ جو مدت العمر دوشیزہ رہنے کا عہد کر چکی تھی -

لیوسی پس - تعجب ہے -

مائرین - جس کے محض خیال سے میری روح کانپتی ہے -

سائنسکا - مگر میری روح کو سرور تھا -

عہد کرنے سے قبل ہفتوں میں اس کی نوعیت پر غور کرتی رہی تھی میری راتیں بیداری میں کٹتی تھیں اور دن بے چینی میں نظروں کے سامنے بس یہی خیال تھا - اور اس خیال کے مختلف پہلو - ان پہلوؤں کے مختلف نتائج آخر کار میں کمربستہ ہوگئی اس عہد پر قائم رہنے کے لئے جس کے محض خیال سے مائرین کی روح کانپتی ہے

[لیوسی پس مائرین سے سرگوشی کرتا ہے]

مائرین - اس وقت کیا عمر تھی آپ کی ؟

سائنسکا - [قہقہہ لگا کر] میں دس سال کی تھی - [سب ہنستے ہیں]

خیر میں نے اپنی عمر کی گیارھویں منزل میں قدم رکھا لیکن میرا عہد بدستور قائم رہا - بارھویں تیرھویں اور چودھویں سال نے بھی مجھ میں کوئی انقلاب نہیں دیکھا - لیکن پندرھویں سال یکایک مجھ پر ایک روز انکشاف ہوا کہ شادی کا خیال ایک لازمی عذاب ہے - جس کا نازل ہونا ہم کنواریوں پر برحق ہے اور جس سے بچنے کی کوشش کرنا گناہ عظیم - سولھویں سال یہ خیال عقیدہ میں تبدیل ہوگیا - اور سترھویں سال یہ عقیدہ راسخ ہوگیا -

پگمیلین - اس پر ستم یہ کہ اُسی دوران میں پگمیلین سے ملاقات بھی ہو چکی تھی -

مائرین - اور تم نے اس کو اپنے شکوک کا رازدار بھی بنالیا تھا -

سائنسکا - ہاں - انہوں نے میرے خیالات کی تائید کی - اور ہم دونوں نے اس مسئلہ کو اپنی معلمہ آرٹس کے سامنے پیش کیا - ہم نے اس کے اعتراضات کا معقول جواب دیا جن کا ذکر اس وقت غیر ضروری ہے

بہرحال بند مدت بحث ہوئی اور ہمارا مقصد حاصل ہوگیا - آرٹس جس کا دل برف کی ایک مجسم قاش تھا میری سسکیوں کی گرمی سے پگھل گئی - آخر کار اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھ کو خطاب کیا ــــــ جا اے حسین دوشیزہ - پگمیلین کے ساتھ تجھے شادی کرنا مبارک ہو - لیکن میرے یہ الفاظ یاد رکھ -

[اُٹھ کھڑی ہوتی ہے]

کہ تم دونوں میں سے کوئی فریق بھی - تو یا وہ - اگر جادۂ عفت و عصمت سے ہٹکر ازدواجی قانون کو توڑنے کا مجرم ہوگا تو وہ فریق جس کی اس حرکت ناشائستہ سے دلآزاری ہوگی اُس کو اختیار کلی حاصل ہوگا کہ وہ دوسرے فریق کے حق میں اندھے ہو جانے کی بددعا دے -

دیوتاؤں کی قدرت سے اُس کی زبان میں تاثیر پیدا ہو جائیگی فریق ثانی کی آنکھوں کا نور فی الفور غائب ہو جائے گا - اور وہ اسی حالت میں رہے گا جب تک کہ فریق اول اُس کو علانیہ معاف نہ کر دے -

لیوسی پس - شکر ہے کہ یہ طاقت تم ہی تک محدود ہے - اگر عام ہوتی تو آج دُنیا کے نصف مرد اور نصف عورتیں اندھیری رات کی طرح اندھے ہوتے - باقیماندہ لوگ جن کی آنکھیں صحیح سلامت رہتیں - صرف ایک دوسرے ہی کو دیکھا کرتے -

[ہیموس بائیں جانب سے داخل ہوتا ہے اور پگمیلین کے ہاتھ میں ایک پرچہ دیتا ہے - جس کے پڑھنے میں وہ مشغول ہو جاتا ہے - اسی اثنا میں ہیموس واپس جاتا ہے]

مائرین - سائنسکا میں جانتی ہوں کہ گو تیری زبان مختار ہے - لیکن دل مجبور ہے -

مجھے یقین ہے کہ تو اُس کی بیوفائی کا جواب بے دردی سے نہ دے گی اور میرے بھائی کو آنکھوں جیسی نعمت سے محروم نہ کرے گی -

سائنسکا - میں پگمیلین کی وفا پر مرتی ہوں - جس روز اس کی یہ خصوصیت جاتی رہے گی اُسی دن میرا عشق بھی مردہ ہو جائے گا

ماٹرین ۔لیکن اندھا بنا دینا کس قدر ظلم ہے۔

سائنسکا ۔اور بیوفائی کا مرتکب ہونا کس قدر ظلم ہے ۔میں پگمیلین کے نقش قدم پر چلتی ہوں۔جب تک وہ معصوم رہے گا میں اس کو دیوتا سمجھ کر سجدہ کرتی رہوں گی۔اور جس وقت اس کا دامن معصیت سے آلودہ ہو جائے گا میں اُس پر لعنت کروں گی۔
میں انتہا پسند ہوں۔مجسم محبت یا مجسم نفرت۔درمیانی جذبات سے میرا سینہ خالی ہے۔

ماٹرین ۔(لیوسی پس سے) کہو تم کیا کہتے ہو؟

لیوسی پس ۔میں خوش ہوں کہ تم آرٹس کی راہبہ نہیں ہو۔بس چلو۔

[ماٹرین اور لیوسی پس دہنی جانب سے باہر جاتے ہیں]

پگمیلین ۔میں نے اس کا غرور توڑ دیا۔اس لئے میرا مربی مجبور ہو کر خود ہی زحمت قدم رنجہ فرما رہا تھا۔بیچارہ مجبور رہے میری عزت اور اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے۔

سائنسکا ۔اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے۔کیسے؟
بھلا اتنے بڑے رئیس کو تجارت سے کیا مطلب!

پگمیلین ۔مطلب کیوں نہیں۔
فنون لطیفہ کی سرپرستی بھی ایک قسم کی تجارت ہی ہے جس میں اس کو ہزاروں درہم مل جاتے ہیں۔

سائنسکا ۔کس طرح۔

پگمیلین ۔یوں تو وہ جاہل مطلق ہے اور محض کندۂ ناتراش۔لیکن روپے کی تھیلیاں دماغ سے زیادہ وزنی ہوتی ہیں۔وہ بڑا دولتمند ہے اس لئے جس جگہ اس کے قدم جاتے ہیں۔وہیں چھوٹے دولتمند بھی ناک رگڑتے ہیں۔مفلس فن کار اُس کی نگاہِ کرم کے امیدوار رہتے ہیں۔اور اپنے قیمتی شاہکار برائے نام قیمت پر فروخت کرنے کے متمنی تاکہ دنیا کے سامنے اپنے کمالِ فن کی نمائش کر سکیں اور اس کی جھوٹی سرپرستی کو اپنی شہرت کا پیش خیمہ بنا سکیں۔
غرضکہ اس کے مذاقِ فن کی تقلید آج کل فیشن ہے۔جس سے وہ پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔اور قیمت طے کرتے وقت اس بات کو مدنظر بھی رکھتا ہے۔
اسی لئے وہ نادر مجسموں کو بھی وزن اور حجم کے حساب سے خریدتا ہے
یہ ہے حقیقت اس شخص کی جو اس فن لطیف کی سرپرستی کا دعویدار ہے۔

سائنسکا ۔افسوس ایسے سفلہ پرور شخص کے ہاتھوں ہمارے اس مقدس فن کی مٹی برباد ہو رہی ہے۔

پگمیلین ۔(طنزاً) دولت ہمارے فن سے زیادہ مقدس ہے۔آخر میں بھی حصولِ زر ہی کے لئے محنت کرتا ہوں۔

سائنسکا ۔میری جان تو شہرتِ دوام کے لئے محنت کرتا ہے۔

پگمیلین ۔مگر شہرت بھی دولت پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔افسوس کس قدر ذلیل خیال ہے۔لیکن میں مزدوری اور غلامی کے علاوہ کر ہی کیا سکتا ہوں۔

سائنسکا ۔آہ ایسے پست ہمت الفاظ اُس کے منہ سے اچھے نہیں معلوم ہوتے جو اپنے اعجازِ فن سے پتھر میں جان ڈال دیتا ہو۔

پگمیلین ۔جان! گویا یہ مٹی کی مورت زندہ ہے۔

سائنسکا ۔بے شک۔بس بولنے کی کسر ہے۔

پگمیلین ۔(طنزاً) بس بولنے کی کسر ہے۔اسی لئے وہ تجھ سے گفتگو کرتی ہے۔نقل و حرکت کی دیر ہے۔اسی لئے وہ چلتی پھرتی نظر آتی ہے صرف روح کی کسر ہے۔اسی لئے وہ زندہ ہے۔
نہیں میری جان۔وہ دراصل سرد اور بے جان پتھر ہی ہے جس کو تراش خراش کر ایک مجسمہ کی شکل دیدی گئی ہے۔

[مجسمہ کو دیکھتے ہوئے]

جیتی جاگتی مورت کی ایک ساکت و صامت نقل ہے۔تخلیق کا سہرا دیوتاؤں کے سر اور تخریب کا داغ میری پیشانی پر۔

[پردے گرا کر پیچھے آجاتا ہے]

سائنسکا ۔خاموش پگمیلین! شکر کر دیوتاؤں کا جنہوں نے تیرے ہاتھوں میں تخلیق کا معجزہ دیا اور دوسروں کی بہ نسبت تجھ کو زیادہ نوازا ناشکری کر کے ان کے غیظ و غضب کا مستحق نہ بن۔اچھا میں رخصت ہوتی ہوں۔

[دہنی طرف جا کر اپنے چہرے پر نقاب ڈالتی ہے]

پگمیلین - آہ رخصت اسقدر جلد اور فراق اسقدر طویل -
سائنسکا - ایک دن آنکھ بند کرتے گذر جائے گا -
پگمیلین - البتہ ان کے لئے جو آفتاب کے طلوع و غروب کے فاصلہ کو
ایک دن کہتے ہیں - اس کے لئے نہیں جو تیری چشم سحر ساز کے
نور کو دن خیال کرے - اور تیری فرقت کو رات -
سائنسکا - اسے سوکر کاٹ دے - پگمیلین! لیکن ٹھہر - تو ہجر و فراق کی
کٹھن گھڑیاں تنہا کیوں بسر کرے - ذرا اس طرف دیکھ لے
میں اپنی واپسی تک - اپنی جگہ اس مجسمہ کو چھوڑے جاتی ہوں
[گلیشیا کی طرف اشارہ کرکے پردوں کو ہٹا دیتی ہے]
یہ میری نیابت کرے گی - میں اس کو تجھے سونپتی ہوں - مگر
خبردار اس کی دلدہی اسی طرح کرنا جس طرح کہ میری - اسکے
خاموش اور گوش برآواز سامعہ میں اپنے متلاطم جذبات کی ترجمانی
کرنا - اس کے شرم و حجاب سے جھکی ہوئی آنکھوں کے سامنے ہجر
فراق سے تپتے ہوئے کلیجے کو چیر کر رکھنا اس کے سنگین دل کو اپنی
شیریں زبانی سے موم کرنے کی کوشش کرنا تاکہ تیری زبان خانۂ
دہن میں بیکار رہ کر اپنی فصاحت و بلاغت کے جوہر کو فراموش
نہ کر جائے - اور اس طرح میری عدم موجودگی میں بھی اس پر
جلا ہوتی رہے - [اس کے قریب جاکر]
میرے مایۂ حیات! میں تجھ کو بخوشی اجازت دیتی ہوں کہ اگر
تو سرمستی عاشقی میں جذبات کی فراوانی سے مجبور ہو جائے تو اسی کو
سائنسکا سمجھ لے - یہ تیرے کلام کو سکون قلب سے سنے گی -
[پگمیلین بے صبری کا اظہار کرتا ہے]
واہ یہ تیری ناانصافی ہے اور ظلم - گو یہ میرا نقش ثانی ہے لیکن مجھ سے
بدرجہا حسین بے حد سرد مزاج اور بالکل بے زبان تو قوت گویائی
رکھتا ہے - پھر تکلف کی وجہ کیا - جبکہ میں تجھ کو اجازت بھی دے چکی
ہوں - حالانکہ میں اس پر ابھی سے رشک کرنے لگی ہوں -
[مجسمہ کو دیکھتے ہوئے]
اس پر!
[پردے گرا کر مجسمے کو پوشیدہ کر دیتی ہے]

لو میرے سامنے سے دور ہو گئی -
نیکن پتھر کا ساکت و سامت مجسمہ ہے آخر کار - اس لئے تم
دونوں کو تنہا چھوڑنے میں مجھے کوئی اندیشہ نہیں -
اچھا رخصت پگمیلین -
واپسی تک
[اس کا بوسہ لیتی ہے اور دہنی جانب سے چلی جاتی ہے]
پگمیلین - (جوش میں) "پتھر کا ساکت و سامت مجسمہ ہے آخر کار"
سائنسکا کو کیا معلوم کہ اس نے میرے زخموں پر نمک پاشی کی ہے
واقعی میرے ہاتھوں میں وہ اثر ہے کہ جو دوسروں کو میسر نہیں
مجھے بے جان پتھر کا ایک ٹکڑا دیدو اور بس -
پھر دیکھو میرا جادو - میں جس سانچے میں جی چاہے اُسے ڈھال دوں
ایک سڈول مرد بنا دوں - حسین عورت کی شکل دیدوں یا
ایک معصوم بچہ کی تخلیق کر دوں - ایک ہی پر موقوف نہیں -
چاہوں تو وحدت میں کثرت کا جلوہ دکھا دوں - یہاں تک
تو میں تخلیق کے میدان میں دیوتاؤں کے شانہ بشانہ چل رہا ہوں
نہیں بلکہ میں ان سے اس صناعی میں گوئے سبقت لے گیا ہوں -
کیونکہ میں ان کی طرح ایک کھوبڑ کاریگر نہیں ہوں - جتنے مرد
آج تک میں نے بنائے ہیں سب متناسب الاعضا ہیں - اور
مرد نہ حسن میں ان کا ہر ایک فرد اپنی آپ نظیر - میں خمیدہ
پشت مردوں کی تخلیق کرتا ہی نہیں - میں تو دیوتا بناتا ہوں
مردوں میں اور دیویاں پیدا کرتا ہوں عورتوں میں جہانتک
کہ ظاہر اشکل و صورت کا تعلق ہے - اور یہی میری حدِ پرواز
ہے - کیونکہ یہیں تک میری قدرت میرا ساتھ دیتی ہے اس سے
آگے دیوتاؤں کی سرحد ہے - جس میں داخل ہونا میرے حدِ امکان سے
باہر - آہ میری بندشیں ٹوٹتی بھی نہیں - دیوتاؤں کی اس
ستم ظریفی سے میں بیزاری کا اظہار کرتا ہوں کہ مجھ کو بڑا بنا کر
بھی چھوٹا ہی رکھا -
گلیشیا - (پردہ کے پیچھے سے) پگمیلین!
پگمیلین - (خاموش ہو کر) ہائیں کس نے پکارا؟

گلیشیا۔ پگمیلین!

[پگمیلین بائیں طرف دیکھتا ہے۔ پھر دہنی طرف نظر دوڑاتا ہے۔ پھر وسط میں جاتا ہے۔ اور وہاں پردے کو ہٹانے پر اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جبکہ وہ گلیشیا کی مورت کو زندہ پاتا ہے۔ وہ مجسمہ کے بائیں طرف دو زانو بیٹھ کر سجدہ میں گر جاتا ہے]

پگمیلین۔ ارے یہ تو زندہ ہے۔

گلیشیا۔ پگمیلین!

پگمیلین۔ یہ بولتی بھی ہے۔
میری دعا مستجاب ہوئی۔
ارے میری گلیشیا سانس لے رہی ہے۔

گلیشیا۔ میں کہاں ہوں؟ مجھ سے بات کرو پگمیلین!
مجھے اپنا ہاتھ دو۔ دونوں ہاتھ لاؤ۔
او فوہ کسقدر نرم ہیں اور کتنے گرم۔

[زینہ پر سے نیچے اُترتی ہے۔ پگمیلین اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ وسط میں لاتا ہے]

میں کہاں سے آ رہی ہوں؟

پگمیلین۔ اسی ستون پر سے

گلیشیا۔ اُس ستون پر سے۔ ہاں مجھے یاد آیا۔
ایک وقت تھا کہ وہ میرے جسم کا ایک حصہ تھا۔

پگمیلین۔ مگر وہ وقت اب ہمیشہ کے لئے گذر چکا۔
اب تو ایک جیتی جاگتی مورت ہے اور تمام نسوانی خصوصیات کی حامل۔

گلیشیا۔ میں کہاں ہوں اس وقت؟

پگمیلین۔ تو اس دُنیا میں پیدا ہوئی ہے معجزہ سے۔

گلیشیا۔ کیا یہی دنیا ہے؟

پگمیلین۔ ہاں یہی۔

گلیشیا۔ یہی کمرہ۔

پگمیلین۔ یہ کمرہ تمام عمارت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اور یہ عمارت ایک بڑے باغ کے وسط میں بنی ہوئی ہے۔ اور ایسے باغ ایتھنس میں ہزاروں ہیں۔

گلیشیا۔ تو ایتھنس ہی دنیا ہے۔

پگمیلین۔ ہاں ایتھنس کے باشندوں کی نظروں میں ضرور ——

گلیشیا۔ اور کیا میں بھی ایتھنس کی باشندہ ہوں۔

پگمیلین۔ ہاں پیدائش کے لحاظ سے ضرور۔ لیکن نسلی اعتبار سے نہیں۔

گلیشیا۔ مگر میں کس طرح پیدا ہوئی؟

پگمیلین۔ میں تجھ کو بتاتا ہوں —— تجھ کو ایک غار میں سے کھود کر نکالا گیا۔ مٹی کی شکل میں میں نے اُس سے تیرا ایک پیکر تیار کیا۔ اور میرے کاریگروں نے اُس کو جلا دے کر سنگ مرمر کی طرح بنایا اور جب میری باری آئی تو میں نے تیرے مجسمے پر اپنی صناعی کا کمال صرف کر دیا۔ اور تجھ کو یہ روپ دیا جس میں تو اس وقت موجود ہے۔ مگر بے روح دیوتاؤں نے اس کام کی تکمیل فرمائی جس کی کہ میں نے ابتدا کی تھی۔ اور تجھ کو وہ زندگی بخشی جو میرے قبضۂ اختیار سے باہر تھی۔

گلیشیا۔ کیا یہی زندگی ہے؟

پگمیلین۔ ہاں یہی۔

گلیشیا۔ اور اب سے کچھ دیر قبل میں سرد بے جان پتھر تھی۔ مجھے اس وقت یاد آ رہا ہے کہ میں اپنی سنگینی کو کسی غیر معلوم طریقہ سے محسوس کرنے لگی تھی اور یہیں سے میرے ذہنی شعور کی دھندلی سی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد مجھے احساس ہونے لگا اپنی سرد حقیقت کا اور ایک غیر متحرک ٹھنڈے جسم کا۔ اس کے علاوہ میں اپنی حقیقت سے قطعی بے خبر تھی۔ اس کے بعد میرے حسیات آہستہ آہستہ انگڑائی لینے لگے۔ یہاں تک کہ تمام خارجی اشیا کا ہلکا سا خاکہ میرے سامنے نظر آنے لگا۔ تاریک اور غیر مکمل خطوط مگر تھے ضرور۔ مجھ کو تیرے کمرے کی دیواریں ہر چہار طرف سے حلقہ کئے ہوئے تھیں اور میں تن تنہا تھی۔ وہ ستون کہ جس پر میں نصب تھی میرے سامنے کا وہ پردہ جس سے کہ میں پوشیدہ تھی مجھے یاد ہے پھر ایک

آواز جس نے "گلیشیا" کہہ کر پکارا - اور اس لفظ پر جس نے میرے
میرے سنگین مجسمہ کو سر سے پاؤں تک لرزاں کر دیا -
مجھ پر یکبارگی سارے دھندلے نقوش روشن ہو گئے اور
تمام حقیقت مجسم آشکار - وہ آوازیں جو مجھے سنائی دیتی تھیں
بالکل بے ربط اور بے معنی اب خود بخود منسلک ہونے لگیں ایسی
زبان میں جس کا مفہوم میں سمجھ سکتی تھی - پھر میں نے اپنے تمام پیکر
میں ایک حرارت سی محسوس کی - ایسی حرارت جس نے میری
سنگینی کو پگھلا کر نرمی میں تبدیل کر دیا - میرے سخت اور سرد
جسم میں زندگی کی برقی رَو دوڑ گئی - میرے اعضا میں لچک
پیدا ہو گئی - اور ان کے تاروں میں حرکت - حتیٰ کہ میں زندہ
ہو گئی - میرا تمام جسم حیاتِ تازہ کی شگفتگیوں سے معمور ہو گیا -
میرا دل اپنے خالق کی یاد میں دھڑکنے لگا - اور حسرتوں امیدوں
اور آرزوؤں کی جولانگاہ بن گیا - سودائے عشق آرزوئے
وصال - حسرتِ دیدار - اور جذبۂ تشکر و امتنان سب سمٹ سمٹا کر
ایک نام میں سما گئی اور وہ نام "پگمیلین" کا ہے -

[گھٹنوں کے بل کھڑی ہو جاتی ہے]

پگمیلین - اے عورت! تو جو حسن مجسم کی تکمیل ہے -
میرے پاس الفاظ ہی نہیں کہ اس وقت اپنی مسرت کا اظہار
کر سکوں -

گلیشیا - تو نے کیا کہا "عورت!"
کیا میں عورت ہوں؟

پگمیلین - ہاں تو عورت ہے!

گلیشیا - تو بھی عورت ہے؟

پگمیلین - نہیں میں مرد ہوں -

گلیشیا - اور مرد کیا شے ہے؟

پگمیلین - مرد ـــــ وہ جس کی تخلیق میں جسامت اور توانائی کا
عنصر غالب ہوتا ہے - جس کی منشائے تخلیق عورت کی خدمت اور
اُس کی حفاظت ہے تمام ان خطرات سے جو قوت و جرأت سے
باز رکھی جا سکتی ہیں - اُس کا فرض محنت و مشقت ہے عورت کو
مسرت و اطمینان دینے کے لئے اور گریہ و زاری عورت کے پیٹ
میں گدگدی پیدا کرنے کے لئے اور جنگ و جدال عورت کے دشمنوں کو
ہلاک کرنے کے لئے - اور موت - اس پر سے قربان ہونے کے لئے تاکہ
عورت زندہ رہ سکے - اور بس -

[اُس کو بٹھا کر خود اُس کے بائیں طرف بیٹھ جاتا ہے]

گلیشیا - (توقف کے بعد) میں خوش ہوں کہ میں عورت ہوں -

پگمیلین - مجھے بھی اس بات کی خوشی ہے -

گلیشیا - کیونکہ میں ان تمام خطرات سے محفوظ ہوں جن کا تجھ کو سامنا
کرنا پڑے گا -

پگمیلین - اس طرح تیری خدمت کرنے کا فخر حاصل کر سکوں گا -

گلیشیا - میرے لئے تو کس کس سے جنگ کرے گا؟

پگمیلین - ہر اس مرد سے جو میری گلیشیا کے لئے موجب تکلیف ہو خواہ
الفاظ سے یا عمل سے -

[اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ہے]

گلیشیا - کیا! اس دنیا میں تیرے علاوہ دوسرے مرد بھی ہیں؟

پگمیلین - ہاں کیوں نہیں -

گلیشیا - اور میرے سوا دوسری عورتیں بھی -

پگمیلین - (اپنا ہاتھ اس کی کمر سے کھینچتے ہوئے) ہاں ہیں -
اگرچہ میں اس حقیقت کو تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا تھا -
ہاں دوسری عورتیں بھی ہیں -

گلیشیا - کیا ان سب کے لئے مردوں کی خدمت کرنا - جنگ و جدال
کرنا اور گریہ زاری کرنا فرض ہے -

پگمیلین - ہاں یہ ایک مرد کا فرض منصبی ہے کہ وہ بہ وقتِ ضرورت
ان سب کے لئے جنگ کرے - لیکن دراصل انہیں کی خدمت
کرتا ہے - جن سے اُسے کچھ محبت ہوتی ہے -

[اپنا ہاتھ پھر اُس کی کمر کے گرد لے آتا ہے]

گلیشیا - تیری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے -
کیوں؟

پگمیلین - ہاں میں تجھ سے محبت کرتا ہوں - [اس کو گلے لگا لیتا ہے]

گلیشیا - کیسی محبت؟

پگملین - میں تجھ سے ایسی محبت کرتا ہوں - (کچھ سوچتا ہے اور یکبارگی سرک کر بیٹھ جاتا ہے) جیسی ایک بت ساز کو اپنے بنائے ہوئے بت سے ہوتی ہے -

[علیحدہ] میرا یہ جواب حقیقت پر مبنی نہیں -

گلیشیا - لیکن میری محبت کی کیفیت کچھ اور ہی ہے - تیری محبت سے بالکل مختلف - میں تو بت ساز نہیں ہوں اور نہ میں نے کبھی مجسمے تراشے ہیں تاہم اتنا میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ مجھ کو تجھ سے محبت ہے - بتا یہ کس قسم کی محبت ہے؟

پگملین - مجھے اپنی محبت کی نشانیاں بتا - اس کے بعد میں تیرے سوال کا جواب دے سکونگا -

گلیشیا - اس کی نشانیاں! اچھا سُن -

اس امر کا احساس کہ تو ہی میرا خالق ہے اور میں تیری مخلوق مجھ کو کوئی اختیار ہی نہیں تیری مرضی کے خلاف میری امیدوں تمناؤں اور آرزوؤں کا وجود ہی نہیں - اگر اُن کا مرکز سوائے تیرے کوئی دوسری ذات ہو -

[قدموں پر جھک جاتی ہے]

اور یہ کہ میں زندہ ہوں - کیونکہ تجھے میری ضرورت ہے - میں تو تیری ہی ہوں کیونکہ میں اور تو در اصل ایک ہی ہیں -

[اُس سے لپٹ جاتی ہے اور جب وہ اس کے جوش سے گھبرا جاتا ہے تو اُس سے علیحدہ ہو جاتی ہے - لیکن قدموں پر سے سر نہیں ہٹاتی]

بتا یہ کس قسم کی محبت ہے؟

پگملین - یہ اس قسم کی محبت ہے کہ جو خصوصیت سے میرے لئے مصیبتوں کا ایک عظیم پیش خیمہ ثابت ہوگی -

گلیشیا - کیوں؟ میرے پگملین -

پگملین - ایسی محبت جیسی کہ تیری ہے - کسی مرد کو قبول کرنا نا زیبا ہے سوائے اس کے کہ اس کی ابتدا اس کی بیوی کی طرف سے ہو -

گلیشیا - اگر یہی شرط ہے تو میں تیری بیوی بننے کے لئے تیار ہوں -

[پھر لپٹ جاتی ہے]

پگملین - [اس کو علیحدہ ہٹاتے ہوئے]

ناممکن ہے - کیونکہ میں شادی شدہ ہوں - اور دیوتا صرف ایک ہی بیوی کی اجازت دیتے ہیں -

گلیشیا - پھر بتا کہ دیوتاؤں نے مجھے کس لئے پیدا کیا؟

پگملین - میں کیا بتاؤں؟ [اٹھ کھڑا ہوتا ہے - گلیشیا بدستور جھکی ہوئی ہے]

سوائے اس کے کہ مجھے سزا دینی مقصود تھی - کیونکہ میں نے بلا سوچے سمجھے دعا مانگی تھی - کہ تو زندہ ہو جائے اور وہ بدقسمتی سے قبول بھی کر لی گئی - مگر اب اس کے خوفناک نتائج میری آنکھوں کے سامنے ہیں -

گلیشیا - [اُٹھ کر اُس کے بائیں طرف آ جاتی ہے] اس کے باوجود بھی تجھے مجھ سے محبت ہے؟

پگملین - کس کی مجال ہے کہ تجھے دیکھے اور محبت کرنے سے باز رہ سکے

گلیشیا - کیا میں اتنی خوبصورت ہوں؟

پگملین - اس میں شک نہیں کہ تو بہت حسین ہے -

گلیشیا - کاش میں خود کو دیکھ سکتی - جو ناممکن معلوم ہوتا ہے -

پگملین - اس حد تک تو نہیں - لے یہ آئینہ! اس میں تیرے جمال کا عکس دکھائی دے گا -

دیکھ - [آئینہ دیتا ہے]

گلیشیا - اوفوہ - میں کسقدر حسین ہوں! مجھے خوشی ہوئی کہ ہم دونوں کا مذاق طبیعت ایک ہی ہے - کیونکہ اے میرے آرام — میں تو خیال بھی نہیں کر سکتی تھی کہ دنیا میں تجھ سے زیادہ حسین شے کا وجود بھی ہو سکتا ہے - جب تک کہ میں نے خود کو نہیں دیکھا تھا جان من یقین کر!

دل چاہتا ہے کہ آئینہ ہاتھ میں لئے اپنے روئے زیبا کا عکس دیکھا ہی کروں -

عورت اس قدر حسین شے ہے!

پگمیلین - ہاں!

گلیشیا - میں خود کو مبارکباد دیتی ہوں - اپنی خوش نصیبی پر کہ دیوتاؤں نے دنیا کا تمام حسن وجمال میری ہی قسمت میں لکھا تھا - لیکن تو تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہے - کیونکہ تو ہر وقت میرے حسین چہرے کی زیارت کر سکتا ہے -

پگمیلین - خاموش گلیشیا! تو اپنی معصومیت میں وہ کہہ جاتی ہے - جو نہ کہنا چاہئے - [آئینہ اس کے ہاتھ سے لے لیتا ہے]

گلیشیا - ہاں - کیا خود کو حسین وجمیل خیال کرنا نامناسب ہے -

پگمیلین - یوں تو دنیا کی ہر عورت خود کو پیکر حسن وجمال خیال کرتی ہے لیکن اس کا احساس دل کی گہرائیوں میں رہتا ہے - زبان پر نہیں لایا جاتا -

گلیشیا - اچھا بتا کیا تیری بیوی میری ہی طرح حسین ہے -

پگمیلین - نہیں - گو کہ میں نے تجھے بناتے وقت اس کے حسین چہرے ہی کو اپنے پیش نظر رکھا تھا - لیکن نقل اصل سے سبقت لے گئی ——

گلیشیا - [نا امید ہو کر] آہ میری بدقسمتی کہ میں نقش اول نہیں ہوں - بلکہ میرا حسن کسی دوسری ذات سے مستعار لیا گیا ہے -

پگمیلین - ہاں —— ایک طرح سے تو ضرور نقش ثانی کہی جا سکتی ہے - جہانتک کہ پتھر کا تعلق ہے -
لیکن زندگی کی حالت میں تو ایسا نمونہ ہے کہ جس کی اصل ممکن ہے اور نہ نقل -

گلیشیا - خیر میں مطمئن ہوں کہ میں اس سے زیادہ حسین ہوں - [بیٹھ جاتی ہے]
کیا میں اُس سے زیادہ نیک بھی ہوں؟

پگمیلین - (کھڑا ہو جاتا ہے) مجھے نہیں معلوم -

گلیشیا - کیا اس میں عیب بھی ہیں؟

ہیں - مگر اسی قسم کے ہیں - جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میں اور وہ طبیعت اور مزاج میں ہم رنگ ہیں -

پگمیلین - لیکن میری نظروں میں اس کے یہ عیب بھی حسین ہیں -

گلیشیا - [توقف کے بعد] مجھے بھی کچھ حسین عیب بتا میری جان - تاکہ میں ان کو سیکھ لوں -

پگمیلین - جلدی نہ کر - رفتہ رفتہ تجھ کو خود بخود آجائیں گے - اس کی ابتدا آج ہی سے شروع ہوگئی ہے - کیونکہ اس طرح پہلو بہ پہلو بیٹھ کر محبت کی چھیڑ چھاڑ کر کے ہم اسوقت بھی ایک گناہ کبیرہ کے مرتکب ہو رہے ہیں -

گلیشیا - کیا گناہ بھی اس قدر حسین ہے اور اس کا ذائقہ اسقدر لذیذ اگر ہمارا باہم مل بیٹھنا اور ایک دوسرے سے گفتگو کرنا ہی گناہ ہے تو میری تمنا ہے کہ اس کا ارتکاب تمام عمر کرتی رہوں - لیکن اے میرے محبوب مجھے بتا دے کہ یہ گناہ عظیم جو مجھ سے اس وقت سرزد ہو رہا ہے - کیا اسی قسم کا ہے - جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں اور تو طبیعت اور مزاج میں ہم رنگ ہیں -

پگمیلین - ہاں حقیقت کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے -

گلیشیا - اور کیا اس عیب نے مجھ کو تیری نظروں میں اور بھی حسین بنا دیا ہے؟

پگمیلین - کون سا فاکی پتلا ایسا ہے کہ "نہیں" کہہ سکے -

گلیشیا - [گردن سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے] تیرے اس جواب سے میں مطمئن ہوگئی پگمیلین! کیونکہ اب میں اور تیری بیوی تجھ پر برابر کا حق رکھتے ہیں - کیا وہ بھی تجھ سے محبت کرتی ہے؟

پگمیلین - ہاں بہت -

گلیشیا - خوب - تب تو میں بھی اس سے محبت کرونگی -

پگمیلین - اور کس لئے؟

گلیشیا - [سوال پر متعجب ہو کر] کیونکہ ہم دونوں ہم مذاق ہیں اور ہمرنگ - ہم دونوں اپنے پیارے پگمیلین کو پیار کرتے ہیں اور پگمیلین ہم دونوں سے برابر کی محبت کرتا ہے - اس لئے میں تیری بیوی کو بھی پسند کرتی ہوں - میں یقین کرتی ہوں کہ ہم ایک دل ہو کر رہیں گے -

پگمیلین - [علیحدہ] مجھے یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہے -

گلیشیا - کیا وہ اندر ہے؟

پگمیلین - نہیں - اندر تو نہیں ہے -

گلیشیا - لیکن واپس آئے گی -

پگمیلین۔ [اُٹھتے ہوئے] ہاں وہ ضرور واپس آئے گی۔

گلیشیا۔ [اُٹھتی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ پگمیلین کی گردن میں حائل کر دیتی ہے]
وہ واپسی پر یہ دیکھ کر کسقدر مسرور ہوگی۔ کہ میں تیرے پہلو میں بیٹھی ہوئی اس کے فرائض انجام دے رہی ہوں۔

پگمیلین۔ [طنزاً] ہاں کیوں نہیں! وہ بے حد مسرور ہوگی۔

گلیشیا۔ واہ تمہارا لہجہ کیوں بدل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تم مذاق کر رہے ہو۔ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ زبان پر کچھ ہو اور دل میں کچھ اور؟

پگمیلین۔ ہاں! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

گلیشیا۔ مجھے بڑا تعجب معلوم ہوتا ہے۔ بڑی ہوشیاری کی بات ہے۔

پگمیلین۔ ہاں مفید بھی بہت ہے۔

گلیشیا۔ ہاں۔ یہ فن مجھے بھی سکھادو۔

پگمیلین۔ یہ فن تو خود بخود سیکھ جائے گی۔
حقیقت یہ ہے کہ میری بیوی تم کو یہاں دیکھ کر مسرور نہ ہوگی۔

گلیشیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بھی اسے یہاں دیکھ کر مسرور نہ ہونگی ۔۔ مجھے اس کے متعلق کچھ اور بتاؤ۔

پگمیلین۔ کیا بتاؤں؟

گلیشیا۔ وہ کیا کہکر گئی تھی۔ جاتے وقت

پگمیلین۔ ہونہہ۔ وہ کیا کہہ کر گئی تھی۔
ٹھیک ہے۔ وہ تجھے میری زوجیت میں دے کر گئی تھی۔ اپنا خاموش نمائندہ بنا کر (فرطِ محبت سے)
وہ اپنی عدم موجودگی میں میری تنہائی سے دلگیر تھی۔ اس لئے مجھے مشورہ دے گئی تھی کہ اگر میرے دل میں جذبات محبت پیدا ہوں۔ تو میں ان کا اعادہ تجھ سے کروں۔ بالکل اسیطرح جیسے کہ میں اس سے کرتا۔ (اس کو گلے لگالیتا ہے)

گلیشیا۔ ہاں ٹھیک ہے۔

پگمیلین۔ (اس کو ہٹاتے ہوئے، لیکن اس وقت تو پتھر کی ایک بے حس و حرکت مورت تھی اور اب گوشت و پوست کا جیتا جاگتا مجسمہ ۔۔
اس لئے حالات کے ساتھ احکامات بھی بدلنا ضروری ہیں۔

گلیشیا۔ دنیا بھی عجیب معمہ ہے!
ایک عورت اپنے شوہر کی پرستار ہے۔ لیکن میرے لئے اس کی پرستش گناہ سمجھتی ہے۔ وہ اپنی عدم موجودگی میں اس کی تنہائی سے دلگیر ہوتی ہے۔ لیکن میری دلبستگی کی کوششوں کو جرم خیال کرتی ہے وہ اس کو حکم دیتی ہے کہ اپنے جذبات محبت کا اعادہ پتھر کے مجسمہ سے کرتا رہے۔ لیکن جب وہ مجسمہ زندہ ہوجائے تو ۔۔ گونگا بن جائے یہ اجتماعِ ضدین سمجھنا میری عقل سے باہر ہے۔

پگمیلین۔ (علیحدہ) مجھے جرأت و استقلال سے اس قصہ کو ابھی ختم کرنا چاہئے۔
[باآواز] گلیشیا! ادھر آ ۔ میری بیوی کی واپسی تک میری بہن تجھ کو اپنے مکان میں پناہ دے گی۔ جو یہاں سے قریب ہی ہے

گلیشیا۔ [متعجب اور خوفزدہ ہوکر] میں تجھ سے بمنت کہتی ہوں کہ مجھے اپنے قدموں سے جُدا نہ کر۔ پگمیلین مجھے یہیں رہنے دے۔

پگمیلین۔ ناممکن ہے۔ گلیشیا اُٹھ! ہم پھر ملیں گے۔

گلیشیا۔ [صبر کرکے] میری کیا مجال کہ میں تیرے حکم کی مخالفت کرسکوں لیکن اتنا تو بتادے کہ قسمت ہمیں پھر بھی ملائے گی؟
اور یہ عرصۂ فراق طویل تو نہ ہوگا۔

پگمیلین۔ نہیں بہت مختصر۔

گلیشیا۔ اور تیری بیوی اپنی واپسی کے بعد۔ مجھے تیری خدمت میں رہنے کی اجازت دے گی۔

پگمیلین۔ میں اس کا وعدہ نہیں کرسکتا۔
[علیحدہ] میں حقیقت کو کیوں چھپاؤں
[باآواز] افسوس ہے کہ آئندہ ملاقات کی کوئی امید نہیں۔

گلیشیا۔ [بے اختیار ہوکر] پگمیلین۔ آہ میں کیا سُن رہی ہوں؟
ارے ظالم تیرے الفاظ کسقدر وحشت انگیز ہیں۔

پگمیلین۔ ہاں حقیقت تلخ ہوتی ہے۔ میرا تجھ سے محبت کرنا ناممکن ہے
اس لئے یہاں سے تیری دوری ہی بہتر ہے۔
[بیٹھ جاتا ہے]

گلیشیا۔ اپنے اُن الفاظ کو یاد کر پگمیلین۔ اے میرے محبوب کیا اسی لئے میں عدم سے وجود میں آئی ہوں۔ دیوتاؤں کے لئے مجھ پر رحم کر رحم۔ دیکھ میرے جسم کا ذرہ ذرہ تیرا احسانمند ہے۔ کیونکہ تو ہی میرا خالق ہے۔ اور دیوتاؤں نے مجھ کو تیرے ہی لئے زندگی بخشی ہے میں تیری ہی ملکیت ہوں۔ صرف تیری اور تیری ہی رہونگی۔ میری روح کی گہرائیوں میں یہی خیالات موجزن ہیں۔ اب تو مجھ سے ایسی ذات کا تذکرہ کرتا ہے کہ جو تیری محبت پر واحد حق رکھتی ہے۔ اور یہ کہ تیری محبت بھی اُسی کے لئے محفوظ ہے۔ آہ مجھے ان باتوں کا کیا علم۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ دیوتاؤں نے مجھ کو صرف تیری ہی خدمت کے لئے بھیجا ہے۔

[جھک جاتی ہے]

تو مجھ سے اپنی بیوی کے حقوق کا تذکرہ کرتا ہے اور اُن قسموں کا کہ تو اسی کا والہ و شیدا رہے گا۔ افسوس مجھے ان باتوں کا کیا علم میں تو یہی جانتی ہوں کہ اس آسمانی دیوتا نے جس نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ میرا [illegible] ایک ہی مقصد حیات قرار دیا ہے کہ میں تیری ہستی میں وصل ہو جاؤں اور تجھ کو اپنی ہستی میں وصل کر لوں

[اپنے ہاتھ اس کی گردن میں حمائل کر لیتی ہے]

[اسی دوران میں پگمیلین حالت تذبذب میں پڑا رہتا ہے۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد وہ اس کو اپنی گود میں اٹھا لیتا ہے۔ اور بھینچ بھینچ کر پیار کرتا ہے]

دوسرا ایکٹ

[پہلے ایکٹ کے مثل۔ پگمیلین ایک نامکمل مجسمہ کو درست کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے]

پگمیلین۔ کل میری پیاری سائنتھ کا اپنے روئے زیبا سے اس خانۂ تاریک کو منور کرے گی۔ اے کاش کہ وہ یہاں سے گئی نہ ہوتی افسوس کہ اس کی غیبت میں دیوتاؤں کی ستم ظریفی نے معجزہ کی شکل اختیار کی جس نے میرے پائے ثبات کو ڈگمگا دیا۔ مگر اس کے باوجود میری خیانت صرف خیال ہی تک محدود رہی۔ ایک رقیق القلب بیوی شاید ایسی صورت میں چشم پوشی کر جائے۔ لیکن پگمیلین خود کو کس طرح معاف کر سکتا ہے۔ کہ اُسی کی نیت میں فتور آئے۔ اور اس کے خیالات میں فساد۔

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا ——— خواہ عشق کا دیوتا کیوپڈ اپنے تمام ترکش کو خالی کر ڈالے اور فلک الافلاک کے دوسرے دیوتا اپنی سطوت و جبروت سمیت میرے ثبات قدم کو متزلزل کرنے میں انتہائی زور صرف کر ڈالیں۔

[ماٹرین غیظ و غضب میں بھری ہوئی دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]

ماٹرین۔ پگمیلین!

پگمیلین۔ ماٹرین!

ماٹرین۔ [اس سے اظہار نفرت کرتے ہوئے] خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا! تو نے مجھے اور اپنی بیوی دونوں کو فریب دیا ہے۔ بتا یہ کون عورت ہے جسے تو نے کل رات میرے گھر میں پناہ لینے کو بھیجا تھا

پگمیلین۔ ہم دونوں کو ملزم ٹھہرانے میں جلدی نہ کر۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پارسائی اور بے گناہی میں تیری مثال ہے۔

ماٹرین۔ کمبخت! اقبال جرم کیوں نہیں کر لیتا۔ اُس حقیقت پر پردہ ڈالنے سے کیا حاصل جس کا وہ فخریہ اعلان کر رہی ہے۔

ماٹرین۔ اُسے طوطے کی طرح رٹا ہوا ایک فقرہ یاد ہے۔ جسے وہ انتہائی بے شرمی سے ہر ایک کے سامنے دُہرا دیتی ہے کہ میں پگمیلین پر مرتی ہوں۔ اور جان دیتی ہوں۔ اور جب یہ سنتے سنتے میرا خون جوش کھاتا ہے تو میں اس سے تیری بدنصیب اور مظلوم بیوی کا تذکرہ کرتی ہوں۔ مگر اس پر مطلق اثر نہیں ہوتا بس کہے جاتی ہے کہ میں پگمیلین پر مرتی ہوں اور جان دیتی ہوں اور یہ کہ میرا تن من سب اسی کا ہے۔

آخر یہ ننگ خاندان ہے کون؟ کہتا کیوں نہیں۔

پگمیلین۔ ماٹرین میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ دیوتاؤں نے چند کلمات نازیبا کی بنا پر جو میری زبان سے بے ساختہ نکل گئے تھے۔ مجھ پر ایک عذاب عظیم نازل کیا۔ اور مجھ کو سزا دینے کے لئے میرے

بت گلیشیا" کو زندہ کر دیا ہے۔

مائرین۔ [حالت تذبذب میں] مجھ کو یقین نہیں آتا۔

پگمیلین۔ حرف بحرف سچ کہہ رہا ہوں۔

[مائرین پردوں کے پیچھے جا کر مجسمہ کی تلاش کرتی ہے۔ لیکن
وہاں خالی ستون دیکھتی ہے]

ارے سچ! مجسمہ غائب ہے!

[گلیشیا دہنی طرف کے دروازے سے داخل ہوتی ہے]

پگمیلین۔ دیکھ! جس مجسمہ کی تو تلاش کر رہی ہے وہ یہاں کھڑا ہے

[مائرین گلیشیا کو حیرت و استعجاب سے دیکھتی ہے اور آہستہ
آہستہ اس کی طرف بڑھتی ہے]

گلیشیا۔ [دوڑ کر اس سے لپٹ جاتی ہے] میرے پیارے پگمیلین! میں نے
تجھے ڈھونڈھ لیا۔

آہ تیری جدائی کے بعد سے مجھ پر عجیب و غریب واردات
گذر چکی ہیں۔

پگمیلین۔ کیوں؟ آخر کیا ہوا۔

گلیشیا۔ خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

[مائرین سے مخاطب ہو کر] میں جو تیرے گھر میں گئی ——

مائرین۔ پھر۔

گلیشیا۔ وہاں تن تنہا بیٹھ کر روتی رہی بس روتی رہی۔ سسکیاں
لے لے کر۔ اپنے پگمیلین کی جدائی میں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ
خوفناک طریقہ سے آہستہ آہستہ وہ نور وہ درخشاں نور۔ وہ
دیوتاؤں کا فرستادہ نور میں نے دیکھا کہ ڈوب رہا ہے۔
سمٹ رہا ہے اور دنیا کے پیچھے جا کر چھپ رہا ہے۔ یہانتک
کہ ہر چہار طرف تاریکی کا دور دورہ ہو گیا۔

اُس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں سرد ہو رہی ہوں اور
اس طرح منجمد جیسی کہ پہلے تھی۔ اُس حالت میں جس وقت تک
کہ میرے پگمیلین نے مجھے زندگی نہیں بخشی تھی۔ میں لرزہ براندام
ہو گئی اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں
پھر پتھر میں تبدیل ہو رہی ہوں۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی
اور دیوتاؤں سے گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگی کہ ایسا نہ ہو ——
"دیوتاؤ مجھ پر رحم کرو" — "مجھے اسی حالت میں رہنے دو" ——
"میرے پگمیلین کی خاطر مجھے اور جینے دو"۔ میں نے چیخ چیخ کر کہا اور
میرے محبوب سے مجھے اتنی جلد کیوں جدا کرتے ہو۔ بس ایک بار
اور مجھے اس حسین چہرے کی زیارت کر لینے دو۔ صرف ایکبار۔
لیکن نہیں۔ شاید میری یہ دعا ان کے کانوں تک نہیں پہونچی کیونکہ
اگر ان تک پہونچ جاتی تو ضرور مستجاب ہوتی۔ اس کے علاوہ انہوں نے
تیرے حسن و جمال کا مشاہدہ ہی کب کیا ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ تجھ سے
جدا ہونا کتنا بڑا قہر ہے اور تیرا وصال کتنی بڑی نعمت۔

میں تیرے بستر پر گر گئی [مائرین سے] اور میرے پپوٹے بھاری ہو کر
بند ہو گئے۔ میرے تمام حواسوں نے ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑ دیا
اس کے بعد مجھے کچھ نہیں معلوم یہانتک کہ ایک عجیب تاریک وقفہ کے
بعد میں نے خود کو اپنے منحوس ستون پر نصب پایا۔ ایک بت کی
صورت میں بالکل بے حس و حرکت اس کے بعد میں نے متبرک
دیوتاؤں کو بارگاہ آسمانی سے نیچے اترتے دیکھا۔ اس کمرہ میں
یہانتک کہ وہ چاروں طرف چھا گئے۔ وہ پگمیلین کے سرہانے تشریف
لائے اور اُس کے روئے زیبا کی زیارت کرنے لگے۔ اس کو غور سے
دیکھتے جاتے تھے اور اس کے حسین رخساروں کو چومتے جاتے تھے
اس کے بعد مجھے زندگی بخشتے ہوئے فرمانے لگے کہ

"ہم تجھ کو ایسی مسرت سے محروم نہ کریں گے"۔

"گلیشیا تو اپنے معشوق کی خاطر زندہ رہے گی"۔

بس اتنی ہی دیر میں وہ آسمانی نور جو میرے سامنے سے غائب ہو گیا
تھا واپس آ گیا۔

وہی مائرین کا کمرہ تھا۔ اور وہی اس کا بستر۔ وہی سورج افق
آسمان پر آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ خوبصورت اور حسین چڑیاں
لہلہاتے ہوئے درختوں پر اسی طرح گا رہی تھیں۔ جس طرح پہلے گا چکی
تھیں۔ میں نے دوبارہ زندگی پائی۔ تاکہ اپنے معشوق کو جی بھر کر
دیکھ سکوں۔

مائرین۔ تو نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ہم پر ہر روز ایسی موت طاری ہوتی ہے

یہانتک کہ ہم اور تو اور تمام لوگ جو اس دنیا پر رہتے ہیں۔ اس طرح سولیں گے کہ پھر بیدار نہوں گے۔

گلیشیا۔[خوفزدہ ہوکر ماٹرین کا ہاتھ تھام لیتی ہے] کہ پھر کبھی بیدار نہ ہوں گے!

پگمیلین۔اس خاص وقت کا آنا برحق ہے جلد یا بدیر۔لیکن وہ معین گھڑی ٹل نہیں سکتی جبکہ ہم سب ساکنانِ ارض اسی سوئی کی طرف واپس کردیئے جائیں گے۔جہاں سے کھود کر تجھ کو نکالا گیا ہے

گلیشیا۔آہ۔حیاتِ تازہ کے تمام وعدوں کا سنہری جال کس طرح ٹوٹ رہا ہے اور زندگی کی خیالی آرزوؤں کی تصویر کس طرح مٹتی جارہی ہے پگمیلین سے اظہارِ عشق ایک ناقابلِ عفو گناہ جس سے احتراز واجب پگمیلین کا اظہارِ عشق ایک ناقابلِ تلافی جرم جس کا اخفا واجب خواب پتھر کی طرح سرد۔ اور ہوش وحواس کی نیند ہماری فطری کیفیت اور زندگی اس حالت سے پیدا شدہ چلتا پھرتا خواب افسوس۔امیدوں کی دلفریب شکلیں ایک ایک کرکے فنا ہوئی جاتی ہیں۔

ماٹرین۔دنیا میں محبت کرنے کے لئے دوسرے مردوں کی کمی نہیں سوائے پگمیلین کے جس کی محبت کرنے والی ابھی زندہ ہے۔

گلیشیا۔کیا کسی دوسرے کو اس سے محبت کرنے کا حق نہیں ہے۔

ماٹرین۔کیوں نہیں! میں کرتی ہوں۔ وہ میرا بھائی ہے

گلیشیا۔کیا تو اُس کی مخلوق ہے؟

ماٹرین۔نہیں! لیکن ——

گلیشیا۔واہ۔باوجود اس کے کہ وہ تیرا خالق نہیں ہے تو اس سے محبت کرتی ہے۔پھر مجھے کیوں باز رکھتی ہے جس کا تمام وجود اسی کا احسانمند ہے۔ [اس کی طرف مڑتی ہے]

پگمیلین۔خیر۔تو مجھ سے محبت کرسکتی ہے۔باپ سمجھ کر۔

ماٹرین۔ہاں۔تجھ کو زندگی بخشنے والا تیرا باپ ہی ہوسکتا ہے۔

گلیشیا۔خیر تیری مرضی۔میرے لئے یہی خیال غنیمت ہے کہ میں تجھ سے محبت کرسکتی ہوں۔کیا تو بھی میری محبت کا جواب دے گا؟

پگمیلین۔ہاں میں بھی تجھ سے محبت کروں گا۔مگر بیٹی سمجھ کر۔

اس کا خیال رہے۔

گلیشیا۔اب میرے دل کو تسکین ہوگئی۔[اس کے ہاتھ کا بوسہ لیتی ہے]

ماٹرین۔(علیحدہ) شکر ہے۔اب سائنسکا بھی مطمئن ہوجائے گی۔ [جاتی ہے]

گلیشیا۔[پگمیلین سے جو اُس کے دہنی طرف سے گذر رہا ہے] مجھے تنہا چھوڑ کر تو کہاں چلا؟

پگمیلین۔ابھی آتا ہوں۔

گلیشیا۔میں تیرے ہمراہ رہوں گی۔ میری گذشتہ حالت کی سرد یادگاروں کے درمیان مجھے تنہا نہ چھوڑ۔ اُن کو دیکھ کر خوف معلوم ہوتا ہے۔ [مجسموں کی طرف اشارہ کرکے]

پگمیلین۔ [باہر کی طرف دیکھتے ہوئے] دیکھ! لیوسی پس آرہا ہے۔ وہ میری واپسی تک تیرا دل بہلائے گا۔ میں جلد آؤنگا۔

گلیشیا۔لیوسی پس! یہ کون ہے؟

پگمیلین۔ایک بہادر سپاہی۔

گلیشیا۔یعنی۔

پگمیلین۔وہ شخص جو اپنے ملک کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کی خدمت پر مامور کیا جاتا ہے۔

گلیشیا۔(خوفزدہ ہوکر) ایک تنخواہ دار خونی!

پگمیلین۔خونی! واہ۔ یہ تیری کوتاہ دماغی اور جہالت کا ثبوت ہے۔دہقانوں اور وحشیوں کی نظروں میں تیرے اس لچر خیال کی وقعت ہوسکتی ہے۔ لیکن ایک مہذب اور متمدن ملک اپنے سپاہیوں پر فخر کرتا ہے۔ ایتھنس کے اندر جو تہذیب میں شہرۂ آفاق ہے۔فوجی پیشہ شرافت اور حکومت کی بہترین نشانی ہے۔

گلیشیا۔وہ خون کرتا ہے اور خون کرنے کا معاوضہ پاتا ہے۔

پگمیلین۔بے شک۔ لیکن وہ اپنے اہلِ وطن کی سلامتی میں خون کرتا ہے۔

گلیشیا۔خواہ اس کے اہلِ وطن حق پر ہوں یا ناحق پر۔

پگمیلین۔ اس کی ذمہ داری اس کی گردن پر نہیں۔ اس کے لئے یہی عذر کافی ہے۔ کہ وہ دشمن ہیں اور ان کا قتل واجب۔ وہ حکام بالا دست کے احکام کو بجا لاتا ہے اور اپنے فرض منصبی سے سبکدوش ہوتا ہے۔

گلیشیا۔ ظلم کی انتہا ہے۔ مجھے تعجب ہے پگمیلین! کہ تیرے منہ سے ایسی خوفناک باتیں کس طرح نکلتی ہیں۔ تونے مجھ سے موت کا تذکرہ کیا۔ کہ جو تمام ساکنان ارض کو چشم زدن میں فنا کر دے گی۔ اب تو مجھ سے ایسے شخص کا تذکرہ کر رہا ہے کہ جس کا فرض خون کرنا ہے۔ زندگی کی وہ نعمت کہ جو تونے کمال مہربانی سے مجھ کو بخشی۔ اس کو دوسرے آدمیوں سے زبردستی چھین لینا کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ تو اس کی طرفداری بھی کر رہا ہے۔

پگمیلین۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان مسئلوں کو حل کر سکوں۔ دیکھ وہ آپہونچا۔ اس سے گفتگو کر اس کے خوفناک پیشے کے باوجود تو اسے نیک اور رحمدل پائیگی۔

گلیشیا۔ [بے حد خوفزدہ ہو کر] نہیں پگمیلین! مجھے اس کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ۔ وہ قاتل اور خونی ہے۔

پگمیلین۔ بے وقوف! آخر کیوں خوف کھاتی ہے۔ وہ تجھے نگل تو نہ لے گا۔ وہ جتنا بہادر ہے اتنا ہی نیک اور بے ضرر بھی ہے۔ اور میں ہمیشہ کے لئے رخصت بھی نہیں ہوتا۔ میں ابھی واپس آؤنگا

[دہنی جانب سے جاتا ہے]

گلیشیا۔ بہتر ہے۔ میں تیری مرضی پر شاکر ہوں۔ لیکن ایک قاتل کی ہمنشینی کے خیال سے میں کانپ رہی ہوں۔

[لیوسی پس ہاتھوں میں ایک مردہ ہرن کا بچہ اٹھائے داخل ہوتا ہے]

لیوسی پس۔ واہ کیا بے خطا نشانہ تھا۔ ایسا کہ تمام عمر میں دوبارہ ناممکن ہے۔

[ہرن کے بچے کو دہنی طرف ڈالدیتا ہے]

گلیشیا۔ خونی درندے۔ خبردار جو میرے پاس آیا۔

[اس کے سامنے سے ہٹتے ہوئے]

لیوسی پس۔ ارے یہ کون ہے؟ خاتون! مجھ سے کیوں ڈرتی ہے۔ میں تجھے کوئی نقصان نہ پہونچاؤنگا

گلیشیا۔ مجھ پر رحم کر! میں نے تیرے وطن کا کیا بگاڑا ہے۔

جناب میں آپ کی دشمن نہیں ہوں!

لیوسی پس۔ میں قسم کھا کر اس کی گواہی دے سکتا ہوں! کاش کہ میرے وطن کے ایسے ہی حسین دشمن ہوتے۔ تو آج اسکی فوج میں سپاہیوں کی کمی نہ ہوتی۔

گلیشیا۔ [آگے بڑھتے ہوئے] بدنصیب! جلد توبہ کرلے۔ ورنہ یہ سخت پتھر تیرے جسم پر دوبارہ قابض ہو جائے گا۔

[مجسموں کی طرف اشارہ کرکے]

لیوسی پس۔ نہ معلوم کیا کہہ رہی ہے ——

گلیشیا۔ جناب! میں آپ کو یاد دلاتی ہوں کہ جس سنگ تراش نے آپکے جسم کو بنایا تھا۔ اس نے دیوتاؤں سے آپ کو زندہ کرنے کی دعا مانگتے وقت یہ نہ خیال کیا کہ وہ اس دنیا پر ایک بلا نازل کر رہا ہے — دیکھ! تیرے ظالم ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں! مجھ سے الگ ہٹ کر کھڑا ہو اور مجھے چھونے کی جرأت نہ کر۔

لیوسی پس۔ [علیحدہ] دیوانی لڑکی!

آخر مجھ سے کیوں ڈرتی ہے۔ میں تجھ سے آزار پہونچانے کی کب ہمت کر سکتا ہوں؟ میرے رنگین ہاتھوں کا سبب یہ ہے [ہرن کے بچے کو اٹھاتے ہوئے]

گلیشیا۔ یہ کیا ہے؟

لیوسی پس۔ ننھا غزال۔ [اس کو گلیشیا کے قدموں کے پاس ڈالدیتا ہے]

گلیشیا۔ (جھک کر) یہ خاموش کیوں ہے؟

لیوسی پس۔ کیونکہ میں نے اسے زخمی کر دیا ہے۔

گلیشیا۔ ظالم!

لیوسی پس۔ مجھے اس کا خود افسوس ہے۔ لیکن یہ محض اتفاق تھا۔ میں ایک درخت کے سایہ میں لیٹا ہوا۔ وقت گذارنے کے لئے گنگنا رہا تھا کہ میں نے اس کو دو رمیدان میں کلیلیں کرتے ہوئے دیکھا میری کمان

ہاتھ کے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔ کہ میں نے دفعتہً تیر جوڑ کر اس پر
شست باندھی۔ مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میرا نشانہ اتنے
فاصلہ کے باوجود بھی ٹھیک بیٹھے گا۔
لیکن اس کی قسمت کا چکر کہ اس آسانی سے شکار ہو گئی۔
[اس پر جھکتے ہوئے]
دیکھو! بیچاری تڑپ رہی ہے۔ لو مر گئی۔

گلیشیا۔ ارے ظالم خونی درندے! یہ تونے کیا کر دیا!
[ہرن کے بچے کو اپنی گود میں اٹھاتی ہے۔]
ارے تونے اس کا کام تمام کر دیا۔
اے حسین مخلوق! میں تجھے نہیں پہچانتی کہ تو کون ہے۔ تیری شکل و
صورت میرے لئے اجنبی ہے۔ لیکن اتنا جانتی ہوں کہ تو جاندار تھی
اور اس درندے نے تجھے زندگی سے زبردستی محروم کر دیا۔
[ہرن کے بچے کے جسم پر رومال پھیرتی ہے اور اس کو اٹھا کر
لیوسی پس کو دے دیتی ہے]
یہاں سے دور ہو جا!
پیشتر اس کے کہ تجھ پر کوئی بلا نازل ہو۔

لیوسی پس۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس بنا پر خوف کھا رہا ہوں۔ کیونکہ
یہ ماٹرین کی ملکیت تھی جس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ اسے یہ معلوم کر کے
بے حد افسوس ہوگا کہ یہ مر گئی۔
اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ تو اس راز کو اس سے پوشیدہ رکھے گی
اسوقت تک کہ میں اس کی جگہ دوسری نہ لے آؤں۔
[لیوسی پس ہرن کے بچے کے ساتھ جاتا ہے]

گلیشیا۔ دور ہو جا میرے سامنے سے۔ میں خونی کے راز پوشیدہ نہیں رکھ سکتی
[ماٹرین داخل ہوتی ہے]

ماٹرین۔ (مضطرب ہو کر) کیوں گلیشیا! تو کیوں کانپ رہی ہے۔

گلیشیا۔ ماٹرین! تو اپنے قلب کو مضبوط کر کے میری بات کو سننے کے لئے
تیار ہو جا!
وہ آدمی جس سے تو محبت کرتی ہے۔ خونی ہے!

ماٹرین۔ [اطمینان کا سانس لے کر] بیوقوف لڑکی! مجھے معلوم ہے
پگمیلین جاتے وقت مجھ سے تذکرہ کر چکا ہے کہ تو ہمارے ملک کے سب سے
بہادر سپاہی کو اس نام سے یاد کرتی ہے۔
وہ خونی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک سپاہی ہے۔

گلیشیا۔ اور خونی کسے کہتے ہیں۔

ماٹرین۔ اسے جو صرف بےبسوں۔ کمزوروں اور نہتوں سے جنگ کرتا ہے
اور جس کا کام دوسروں پر اچانک حملہ آور ہو کر قتل کرنا ہے۔
میرا بہادر لیوسی پس خونی نہیں ہے۔

گلیشیا۔ تیرا بہادر لیوسی پس اپنی بہادری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ وہ تیرے
بیان کے مطابق محض خونی ہی ہے۔ کیونکہ میں نے مقتول کو اس کی
گود میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔
اس مظلوم کے خون میں اُن کے دونوں ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔
اُس جگہ اُس کا سرد اور بے جان جسم پڑا ہوا تھا۔ اور اس کی
خوبصورت سیاہ پتلیوں پر موت کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اُس نے
صرف ایک ہی بار حرکت کی۔ اُس نے اپنا سر اس کی طرف گھمایا
اور کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ ایک لفظ بھی
اپنی زبان سے کہتی اُس کی گردن ڈھلک گئی اور وہ مردہ ہو کر گر گئی

ماٹرین۔ دیوانی ہو گئی ہے کیا۔ تجھ سے کس نے کہا؟

گلیشیا۔ خود اس نے اپنی زبان سے اقبال کیا۔ اور اپنے فعل پر بہت
دیر تک فخر کرتا رہا۔ اُس نے کہا کہ اس نے محض مذاق ہی میں
اپنی کمان کو اٹھا کر تیر جوڑا اور اس طرح نشانہ لگایا کہ اس کے
دل کو توڑتا ہوا نکل گیا۔

ماٹرین۔ لیوسی پس نے ایسا کیا؟ ...... ناممکن ہے۔
تو خواب دیکھی ہے کیا؟

گلیشیا۔ اپنی جان کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ سچ ہے۔ دیکھ یہ رومال موجود ہے
جو ابتک اس کے خون میں رنگا ہوا ہے۔

ماٹرین۔ (خوفزدہ ہو کر) اس نے کس کو قتل کر ڈالا۔

گلیشیا۔ مجھے یہ نہیں معلوم۔
اس کی شکل وصورت میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ دیکھ وہ پھر
آ رہا ہے۔ مجھے اس ظالم خونی درندہ سے پناہ دے۔

[بائیں طرف جاتی ہے]

[لیوسی پس دہنی جانب سے داخل ہوتا ہے]

مائرین - لیوسی پس! کیا یہ خوفناک واقعہ صحیح ہے ؟

لیوسی پس [گلیشیا سے علیحدہ] تجھ کو میرا راز افشا کرکے کیا ملا !
بھولی لڑکی! تونے اُس کو کسقدر رنج پہنچایا ہے !
[مائرین سے] ہاں صحیح ہے !
لیکن گلیشیا کا فرض تھا کہ خاموش رہتی - اور اس حادثہ کی اطلاع
دے کر تجھ کو پریشانی میں مبتلا نہ کرتی -

مائرین - [اس کے اطمینان پر متعجب ہوکر] معلوم ہوتا ہے کہ تیرے دماغ پر
کوئی خبیث روح مسلط ہوگئی ہے ورنہ یہ ناممکن تھا کہ تیرے
ہاتھوں سے ایسی حرکت سرزد ہوتی -

لیوسی پس - بے شک میں ہی خطاکار ہوں !
میں نے اس کو اپنی نظر کے سامنے رقص کرتے ہوئے دیکھا کہ دفعتہً
میرا ہاتھ قریب رکھی ہوئی کمان پر پڑا - اور تقریبًا سو گز کے
فاصلے سے میں نے شست باندھ کر اپنے تیر کو اس کے جگر میں اتار دیا
ایسے صحیح نشانہ باز دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں !

مائرین - (کانپ کر) بہتر ہوتا کہ بالکل ہی ناپید ہوتے -
آہ قسی القلب انسان - [رونے لگتی ہے]

لیوسی پس - میرا پیمانۂ صبر لبریز نہ کرو !
میں تو مبارکباد کا مستحق ہوں - کیونکہ میں نے تیراندازی کا معجزہ
دکھایا ہے - اگر ایک جان ضائع ہوگئی تو کونسا نقصان ہوگیا - دنیا
میں ایک معمولی ہستی کوئی وقعت نہیں رکھتی - اور ایک کم یا
زیادہ ہوجانے سے مخلوق کی تعداد میں کوئی فرق نہیں ہوتا -
ابھی بہت باقی ہیں -
[گلیشیا کی طرف دیکھتا ہے جو خائف ہوکر چیخ مارتی ہے اور بائیں
طرف جاکر پناہ گزیں ہوتی ہے]
ذرا خیال تو کرو کہ میں قتل عمد کے جرم سے بری الذمہ ہوں - کیونکہ
اس قدر فاصلے سے نشانہ صحیح بیٹھنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا لیکن
میرا نشانہ میرے خیال سے زیادہ صحیح ثابت ہوا اور وہ بیچاری ہیں
ڈھیر ہوگئی -

مائرین - (متحیر ہوکر) افسوس! تیری بے حسی اور سنگدلی ثبوت ہے
تیری دیوانگی کا - آہ میں کیا کروں - جا اپنے نجس وجود کو کسی محفوظ
جگہ میں پناہ دے -

لیوسی پس - لیکن ——

مائرین - بس خاموش - میں ایک لفظ بھی نہ سنونگی - اور نہ آج سے
تیرا منہ دیکھنا پسند کرونگی - دور ہوجا میرے سامنے سے !
[لیوسی پس گلیشیا کی طرف مڑتا ہے]

گلیشیا - جناب فورًا تشریف لے جائیے - ورنہ مچاتی ہوں شور -

لیوسی پس - واہ دونوں عقل سے خارج معلوم ہوتے ہیں عورتوں کی
منطق ہی دنیا سے نرالی ہے - جس کا سمجھنا مردوں کی عقل سے باہر ہے
بہتر ہے - میں انتخفس کو روانہ ہوتا ہوں - جب تمہاری عقل درست
ہوجائے اور میری ضرورت محسوس ہو تو طلب کرلینا ——
—— اس وقت تک رخصت !
[غصہ میں دہنی جانب سے جاتا ہے]

مائرین - اے کاش کہ یہ ڈراؤنا خواب ثابت ہو - اور بیداری پر حقیقت
عریاں نظر آئے - تاکہ میں اپنا کھویا ہوا آرام دوبارہ حاصل کرسکوں

گلیشیا - [خیال آنے پر اچھلتے ہوئے] خواب !
[مائرین کے پاس آکر]
ہاں ہم دونوں خواب ہی دیکھ رہے ہیں جس کا مضمون بھی ایک
ہی ہے - لیکن یہ کس طرح معلوم ہو کہ خواب کیا ہے اور حقیقت کیا؟

مائرین - کچھ باتیں اس قسم کی ہیں کہ جنکی حقیقت بہت خوفناک ہوتی ہے
—— چنانچہ ان میں سے ایک یہ بھی ہے -
[پگمیلین ہرن کا بچہ اُٹھائے ہوئے داخل ہوتا ہے]

پگمیلین - کیوں مائرین - آج لیوسی پس کو کیا ہوگیا —— میں نے دیکھا
کہ مکان سے نکلتے وقت اس کے چہرے پر غیظ وغضب کے آثار
تھے - اور گھوڑے پر بیٹھتے وقت اس کے اعصاب کانپ رہے
تھے - کیا ماجرا ہے ؟

مائرین - کیا بتاؤں - غضب ہوگیا -

وہ دیوانہ ہوگیا اور اسی عالم میں اُسنے ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔
کہ جس کے بیان سے دل تھرّاتا ہے۔ تونے بھی اس کی زبان سے
کچھ سنا؟

پگمیلین۔ ہاں۔ جب میں نے اُسکی ناراضگی کا سبب دریافت کیا تو اُسنے
میرے سامنے اس کو ڈالدیا۔ [ہرن کے بچے کو دکھاکر]

گلیشیا۔ (بےحد خوفزدہ ہوکر) ہاں یہی ہے وہ مظلوم۔ اس کو میرے
سامنے سے ہٹاؤ۔ اس کو دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

مائرین۔ کیوں۔ یہ کیا ہے؟

گلیشیا۔ وہ یہی جس کا خون اس نے اس بےدردی سے کیا ہے۔ اور
دیوتاؤں کی بخشی ہوئی زندگی سے اس غریب کو زبردستی محروم کیا
اس کو میرے سامنے سے ہٹالو۔ میں موت کی ڈراونی شکل کو کس
طرح دیکھ سکتی ہوں؟

مائرین۔ کیا لیوسی پس نے فقط اسی کو قتل کیا تھا؟

گلیشیا۔ (متعجب ہوکر) ہاں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔

مائرین۔ لڑکی تو دیوانی ہوگئی ہے۔ پگمیلین! یہ مجھ سے برابر یہی کہے جاتی
ہے کہ لیوسی پس نے کسی کو قتل کرڈالا۔

پگمیلین۔ (غصہ ہوکر) یہ چھوکری ہم سب کو دیوانہ بنادے گی۔
لاؤ میرا گھوڑا تیار کراؤ۔ میں خود اسے منا کر لاؤنگا۔

[مائرین بائیں جانب جاتی ہے]

گلیشیا۔ مجھ سے قصور ہوا۔ سچ مجھے اس بات کا علم نہ تھا!
کیا تو مجھ سے ناراض ہوگیا۔

پگمیلین۔ ہاں۔
میں تجھ سے بےحد ناراض ہوں۔ اپنے علانیہ عشق کے اظہار سے
تونے مجھے خوب رسوا کیا۔ اور اب لیوسی پس کو اس کے محبوب سے
جدا کرادیا۔ تیری بیوقوفی ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔

[میموس داہنی جانب سے داخل ہوتا ہے]

میموس۔ جناب! کراٹسس اور انکی بیگم باہر تشریف رکھتے ہیں۔

پگمیلین۔ میں اس وقت نہیں مل سکتا (ٹھہر کر) اچھا ٹھیرو۔ اندر
بلالاؤ۔ [میموس جاتا ہے]

[گلیشیا سے] جا تو وہاں بیٹھ کر میرا انتظار کر۔

[گلیشیا جاتی ہے]

[پگمیلین ایک نامکمل مجسمہ کو بنانے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ ڈیفنی
دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]

ڈیفنی۔ پگمیلین کہاں ہے؟

پگمیلین۔ (کام کرتے ہوئے) پگمیلین یہاں ہے۔

ڈیفنی۔ ہم چند روز قبل تمہارے مکان پر آئے تھے۔ لیکن تم موجود نہ تھے۔
چونکہ اندر داخل ہوگئے تھے اس لئے ہم نے تمہارے اسٹوڈیو کی دل
بھر کر سیر کی۔ اور اس سلسلہ میں ہم نے تمہارے پتھر کو بھی دیکھ لیا۔
جسے تم پردوں کے پیچھے بڑی احتیاط سے چھپا کر رکھتے ہو۔

پگمیلین۔ (انکی طرف مڑکر) آپ نے بڑی ناشائستہ حرکت کی۔

ڈیفنی۔ جناب آپ مجھ کو پہچانتے ہیں کہ میں کون ہوں۔

پگمیلین۔ ہاں جانتا ہوں۔ تم کراٹسس کی بیوی ہو۔ آپ کے ساتھ
آپ کے شوہر بھی آئے ہیں؟

ڈیفنی۔ ہاں وہ باہر تشریف رکھتے ہیں۔ میں ان کی نقیب بن کر آئی ہوں
تاکہ تمہیں ان کے شایانِ شان استقبال کے لئے تیار کردوں۔
ان کے حضور میں ادب سے گفتگو کرنا تاکہ وہ تمہارا بت خریدنے پر
رضامند ہوجائیں۔ کیونکہ ان کی ایک ہی نگاہِ کرم پر تمہاری قسمت
پلٹ جائے گی۔

پگمیلین۔ (میموس سے) تم ان سے اندر آنے کو کہو۔

[کراٹسس دہنی جانب سے داخل ہوتا ہے]

کرائیسس۔ کیا یہ سنگتراش راضی ہوگیا۔

[میموس باہر جاتا ہے]

ڈیفنی۔ ہاں۔
اس وقت مزاج درست معلوم ہوتا ہے۔ بس روپیہ نکال کر اس کے
ہاتھ پر رکھ دو۔ میں نے اس بت کے متعلق سُنا ہے کہ بےنظیر اور
لاجواب شے ہے۔ لیکن اس کے منہ پر اُس پتھر کی وقعت گھٹانے
میں کمی نہ کرنا اور اُس میں ہزار عیب نکال کر خریدنا۔

کرائیسس۔ (پگمیلین سے) تمہارا وہ مجسمہ کہاں ہے جسے ہم نے گذشتہ ہفتہ

دیکھا تھا۔

پگمیلین ۔ (گھبرا کر) جناب وہ ابھی نامکمل ہے اور اس کے علاوہ بدصورت بھی۔ مجھے اُس کو پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

کرائیسس ۔ ہاں یہی میرا بھی خیال ہے۔ اُس کا رنگ و روغن پھیکا ہے اور چمک بالکل غائب۔ دھوپ چھاؤں کا کوئی فرق ہی نہیں۔ مطلع تمام تاریک نظر آتا ہے۔ اس کی سطح پر کچھ بدنما داغ بھی ہیں جس نے اس کی وقعت کو اور بھی گھٹا دیا ہے۔ اس کے علاوہ تصویر کے چہرے پر جذبات کا نام و نشان ہی نہیں۔ بالکل اندھی۔ گونگی۔ اور بہری معلوم ہوتی ہے۔

ڈیفنی ۔ (اس سے علیحدہ) ذرا سوچ کر بات کرو۔ تم روغنی تصویر کے متعلق بات کر رہے ہو یا سنگین مجسمہ کی نسبت۔

کرائیسس ۔ واہ ۔ تم کیا جانو ـــــ دونوں کا اصول ایک ہی ہے اچھا کیا دام لگاؤ گی۔ ذرا اس کے وزن کا تخمینہ تو کرو ۔

[ڈیفنی سے علیحدہ]

ڈیفنی ۔ (علیحدہ) ایک ٹن کے لگ بھگ ہوگا ۔

کرائیسس ۔ (بآواز) اچھا ہزار درہم لوگے؟ بولو ۔

پگمیلین ۔ نہیں جناب ۔ آپ نے بہت دام لگا دیئے ۔ تصویر بالکل اندھی۔ گونگی اور بہری ہے ۔ اور نہ اس پر دھوپ ہے نہ چھاؤں

کرائیسس ۔ ہاں ۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عیب ہیں ۔ لیکن کوئی حرج نہیں ۔ ہم مٹی کا ایک کھلونا خرید رہے ہیں ۔ جو ہمارے کمرے میں چراغ رکھنے کے ڈیوٹ کا کام دے گا ۔

پگمیلین ۔ معاف کیجئے جناب ۔ آپ کے لئے وہ بیکار سی شے ہے ۔ لیکن میں اُس کو کسی قیمت پر بھی جدا نہ کروں گا۔

کرائیسس ۔ میں جس پتھر کے ایک ہزار درہم لگا رہا ہوں ۔ اس کے بازار میں کوئی پانسو بھی نہ دے گا ۔

ڈیفنی ۔ میاں ذرا ہوش کی دوا کرو ۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ہم نے ایک اپولو خریدا تھا ۔ جس کا قد تمہارے پتھر سے دگنا تھا ۔ اور ہم نے اس کے صرف پندرہ سو درہم دیئے تھے ۔

پگمیلین ۔ لیکن خطا معاف ایک صناع اپنے مجسموں کے حسن کا اندازہ انکے وزن اور حجم کے لحاظ سے نہیں کرتا ۔

کرائیسس ۔ وہ نہ کرے مگر ہم تو کرتے ہیں ۔

ڈیفنی ۔ میاں گستاخ صاحبزادے! کرائیسس کو ناراض کرنے کی ہمت نہ کرو۔

[دہنی جانب سے جاتی ہے]

کرائیسس ۔ اور ہماری بیگم کی بات کا لحاظ کر [جاتے ہوئے]

پگمیلین ۔ جناب آپ کا غصہ میرے سر اور آنکھوں پر ۔ لیکن میں آخری بار عرض کرتا ہوں کہ وہ مجسمہ برائے فروخت نہیں ۔

[بائیں جانب سے جاتا ہے]

کرائیسس ۔ جناب میں بھی آخری بار عرض کرتا ہوں کہ میں خالی ہاتھ واپس نہ جاؤں گا ۔ فنون لطیفہ کا سرپرست آرٹ کا محکوم نہیں بن سکتا میں تجھے ابھی دکھا دونگا کہ میں کیا کر سکتا ہوں ۔

کہاں ہے وہ مجسمہ؟

[ستون پر جا کر پردوں کو ہٹا کر دیکھتا ہے]

ارے غائب ہوگیا!

[وہ مجسمہ کو چاروں طرف دیکھتا ہے ۔ یکایک اس کی نظر گلیشیا پر پڑتی ہے جو بائیں طرف سے آ رہی ہے ۔ وہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر حیرت سے دیکھتا ہے]

ہائیں یہ کون ہے؟

گلیشیا ۔ ذرا ہوش کی دوا کرو ۔

کرائیسس ۔ نہیں معاف کرنا ۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں ـــ اوفوہ! بڑی غلطی ہوئی ۔

(علیحدہ) ظالم ہو بہو وہی ہے ۔

[بآواز] میں تم کو پہچانتا ہوں ۔ میں نے تم کو کہیں دیکھا ہے ۔

[سر کھجا کر]

گلیشیا ۔ شاید پتھر کی شکل میں ۔ بہت ممکن ہے ۔

کرائیسس ۔ (خود پر قابو پا کر) ہاں میں سمجھ گیا ـــــ ہو نہ ہو یہ پگمیلین کی ماڈل ہے ۔ بیشک وہی ہے ۔ لیکن بڑی دیدہ دلیر معلوم ہوتی ہے ۔ آنکھوں کا پانی ڈھل چکا ہے ۔ اس پیشہ کی تمام عورتیں اسی قماش کی ہوتی ہیں ۔ لیکن بلا کی حسین ہے جسم کی

رعنائی اور گدازی بھی قیامت کی ہے۔

(بآواز) ذرا ادھر تشریف لائیے خاتون!

گلیشیا۔ [اس کو بہت حیرت سے دیکھ رہی ہے] مجھے بتاؤ تم کیا ہو؟

کرائیس۔ میں کیا ہوں؟

گلیشیا۔ میں یہ دریافت کرتی ہوں کہ کیا تم مرد ہو؟

کرائیس۔ ہاں۔ کہتے تو یہی ہیں۔

گلیشیا۔ تو غلط کہتے ہیں۔ تم ابھی تک مغالطہ میں مبتلا ہو۔

کرائیس۔ واقعہ ہے۔

گلیشیا۔ مرد ہمیشہ طویل القامت سیدھا اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بہادری ٹپکتی ہے۔ اس کے چہرے پر حسن کا نور برستا ہے۔ اور آواز میں کشش اور نرمی ہوتی ہے۔
میں نے ایک ایسا مرد دیکھا ہے۔

کرائیس۔ واقعی!

گلیشیا۔ (اس کو بغور دیکھتے ہوئے) ہاں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مرد نہیں ہو۔

کرائیس۔ کیا میں عورت نظر آتا ہوں؟

گلیشیا۔ عورت؟ نہیں۔
ایک عورت نرم نازک گوری اور بے انتہا حسین ہوتی ہے۔
میں عورت ہوں۔ تم میرے مثل نہیں۔

کرائیس۔ دیوتاؤں کی مرضی نہیں کہ میں تمہارے مثل بنوں اور اپنے حسن کو گھنٹوں کے حساب سے فروخت کروں۔

گلیشیا۔ میں اس کے باوجود بھی تمہیں پسند کرتی ہوں۔ کیونکہ تمہیں دیکھکر مجھے ہنسی آتی ہے۔
گول گول جسم پر لال لال رنگت اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔
بڑا سا دہانہ اور جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ۔ ٹھنگنا سا قد اور پھولی ہوئی توند ـــــ نے تمہیں بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔

کرائیس۔ (علیحدہ) بڑی شوخ اور طرار معلوم ہوتی ہے۔

گلیشیا۔ ہاں میں سمجھ گئی۔
پگمیلین بہت کہنہ مشق اور ہوشیار کاریگر ہے۔ لیکن وہ آدمی جس نے تمہیں تراشا ہے۔ شاید بالکل ہی بتدی تھا۔

کرائیس۔ (حیران ہو کر) اتنی کم عمری کے باوجود اسقدر دلیر ہو؟

گلیشیا۔ دلیر نہیں ہوں ــ معصوم ہوں۔ میرے متعلق پگمیلین کا بھی یہی خیال ہے۔

کرائیس۔ درست ہے۔ لیکن میں کل کا بچہ نہیں ہوں۔
[بائیں جانب بیٹھتا ہے]

گلیشیا۔ لیکن میں تو ہوں۔
[وہ اس سے اپنے قریب بیٹھنے کی فرمائش کرتا ہے۔ وہ اس کے دہنی جانب بیٹھتی ہے اور اس طرف بہت حیرت سے دیکھتی رہتی ہے جس کا سبب اس کی سمجھ میں نہیں آتا]
تمہارے بیٹھنے کا انداز کتنا بھونڈا ہے!

کرائیس۔ مجھے اس بات کا علم نہیں کہ میری صورت کی طرح میری نشست بھی نرالی ہے۔ میں تو یہی جانتا ہوں کہ سب کے بیٹھنے کا انداز ایک ہی ہے۔

گلیشیا۔ میرا پگمیلین کبھی اس طرح نہیں بیٹھتا۔

کرائیس۔ کیا وہ کسی خاص ادا سے بیٹھتا ہے۔

گلیشیا۔ ہاں۔ اس کا ہاتھ ہمیشہ میری کمر کے گرد رہتا ہے۔

کرائیس۔ بڑے ذات شریف معلوم ہوتے ہیں۔ آرٹ کے تمام طریقوں سے واقف ہیں۔

گلیشیا۔ تم اس طرح نہیں بیٹھتے۔ شاید تمہیں ان باتوں کا علم نہیں۔

کرائیس۔ کیوں نہیں۔ میں بھی ان اندازوں سے بخوبی واقف ہوں۔

گلیشیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم اس طرح نہیں بیٹھتے۔

کرائیس۔ (علیحدہ) میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔
[اس کی کمر کے گرد اپنا ہاتھ لے آتا ہے]
بہرحال مردوں کا فرض ہے کہ عورتوں کی دلدہی کرے کیا واقعی تم معصوم ہو؟

گلیشیا۔ ہاں واقعی۔ میں تم کو بتا چکی ہوں کہ میں کل ہی پیدا ہوئی ہوں۔

کرائیس۔ تمہاری ماں کون ہے۔

گلیشیا۔ ماں۔ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟
میں تو کسی کو نہیں جانتی۔ مجھے اتنا ہی علم ہے کہ میں پگمیلین کی رو

ہوں۔
کیا لوگوں کے مائیں بھی ہوتی ہیں؟
کرائیس۔ ہاں۔ ابتک تو دنیا کا یہی اصول ہے۔
گلیشیا۔ لیکن پگمیلین میں دوسرے لوگوں سے زیادہ قدرت ہے۔ اس لئے اُس نے اس اصول کو توڑ دیا ہے۔
کرائیس۔ ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے کہ اس کے ہاتھوں میں اعجاز ہے جسپر مجھے بھی یقین ہو چلا ہے [علیحدہ]
[ڈیفنی دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]
ڈیفنی۔ ارے۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟
[کرائیس ڈیفنی کو دیکھتے ہی گلیشیا سے دور سرک جاتا ہے]
کرائیس۔ ــــــ بیگم!
ڈیفنی۔ کیا میں اپنی آنکھوں پر اعتبار کروں؟
[گلیشیا کھڑی ہو جاتی ہے]
یہ کون عورت ہے؟
کسقدر مشابہت ہے۔ ہو بہو وہی ــــ
کرائیس۔ کس سے مشابہت ہے؟
ڈیفنی۔ اُسی مجسمہ سے جسے ہم خریدنا چاہتے تھے۔ وہی چہرہ ہے اور وہی لباس۔ بال برابر بھی فرق نہیں ہے۔ بس اس کو اُٹھاؤ اور اُس کو بٹھاؤ۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پگمیلین نے کسی غیبی طاقت کے ماتحت اس مجسمہ میں جان ڈالدی ہے۔ دونوں کے خط و خال میں بلا کی مشابہت ہے۔
کرائیس۔ (علیحدہ) بیگم کے خیال کی نزاکت کی داد دیتا ہوں۔ بہتر ہو کہ میں بھی اس کی تائید کروں اور اُس کے خیال کو تقویت دوں۔ گو میرا یہ طرز عمل بے صد لچر اور مہمل ہو گا۔ لیکن اس صورت حال کا یہی بہترین علاج ہے۔
(باواز) واہ بیگم تمہاری نازک خیالی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ تمہارا خیال لفظ بہ لفظ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ واقعی اس لڑکی میں اور اُس مجسمہ میں سرِمو فرق نہیں ہے۔ دیوتاؤں کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ انہوں نے ایک کرشمہ دکھایا ہو۔ اور اس مردہ پتھر میں جان ڈالدی ہو۔
ڈیفنی۔ چلو ہٹو۔ کیا تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو؟ یا مجھے بالکل ہی دیوانہ سمجھتے ہو؟
گلیشیا۔ یہ واقعہ بالکل صحیح ہے کہ میں سرد اور بے حس و حرکت پتھر کا مجسمہ تھی جذبات اور ہوش و حواس سے بالکل معرّا۔ یہانتک کہ پگمیلین نے اپنی ریاضت اور عبادت کی گرمی سے میرے جسم میں زندگی کی دہکتی ہوئی چنگاری پیدا کر دی اور مجھ کو وہی بنا دیا جو اسوقت میں نظر آ رہی ہوں۔
کرائیس۔ (گلیشیا سے علیحدہ) شاباش لڑکی۔ تو بڑی حاضر جواب اور وقت شناس ہے۔ لیکن اپنے بیان پر قائم رہنا۔ بدل نہ جانا
ڈیفنی۔ اوباش لڑکی!
تو نہیں جانتی کہ میں اُس کی بیوی ہوں۔
گلیشیا۔ اُس کی بیوی (کرائیس سے) میرے پاس سے چلے جاؤ۔ میں تمہاری بیوی کے سامنے تم سے محبت نہیں کر سکتی۔
[وہاں سے جاتی ہے]
ڈیفنی۔ کیسی بے شرم اور گستاخ لڑکی ہے۔
کرائیس۔ یہ گستاخی معصومیت کی ہے۔ اُس کے اخلاق کو اپنے اخلاق کی کسوٹی پر مت جانچو۔ کیونکہ وہ کل پیدا ہوئی ہے اور تمہاری پیدائش کو ایک عرصہ گذر چکا ہے۔
[میموس دہنی جانب سے داخل ہوتا ہے]
میموس۔ حضور پگمیلین حاضر ہے۔
کرائیس۔ (علیحدہ) یہ تو بُرا ہوا۔ وہ بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گا۔
ڈیفنی۔ (میموس سے) بتا یہ کون عورت ہے؟
کرائیس۔ میں بتا چکا ہوں کہ وہ ــــــ
ڈیفنی۔ بس خاموش! مجھے تمہارا اعتبار نہیں۔ میں خود اُسکی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔
گلیشیا۔ اس سے کیوں پوچھتی ہے جبکہ میں خود بتا چکی ہوں ــ
ڈیفنی۔ اپنی زبان بند کر ــ [میموس سے]

یہ کون عورت ہے؟

اگر تو ایک لفظ بھی غلط کہے گا تو میں تیری کھال کھچوا دونگی۔

میموس ۔حضور غلام کی کیا مجال کہ غلط کہے۔ یہ عورت وہی بت ہے جس میں جان پڑ گئی ہے۔

کرائیس ۔ (میموس سے علیحدہ) میں تمہارا بے حد ممنون ہوں۔

[اس کو کچھ انعام دیتا ہے اور اس سے ہاتھ ملاتا ہے]

[میموس دہنی جانب سے جاتا ہے]

[مائرین بائیں جانب سے داخل ہوتی ہے]

مائرین ۔کیا معاملہ ہے؟ کوئی خاص بات؟

ڈیفنی ۔ ہاں—— یہ عورت ——

مائرین ۔ وہی بت ہے جس میں جان پڑ گئی ہے۔

کرائیس ۔ میں تمہارا بے حد ممنون ہوں ۔

[اس سے ہاتھ ملاتا ہے]

[پگمیلین دہنی جانب سے داخل ہوتا ہے]

پگمیلین ۔ کہئے جناب کیا ہو رہا ہے۔

کرائیس ۔ وہ مجسمہ ——

ڈیفنی ۔ خبردار۔

کرائیس ۔ مجھے کہنے دو۔

وہ مجسمہ جو کہ میں نے خریدا تھا ——

ڈیفنی ۔ مجھے کہنے دو۔

مجھے سب نے دیوانہ بنا لیا ہے۔

کرائیس یہ لڑکی۔ مائرین اور تمہارا غلام سب کا متفقہ بیان ہے کہ۔

پگمیلین ۔گلیشیا کا مجسمہ زندہ ہو گیا ہے۔ بیشک یہی بات ہے۔

کرائیس ۔ یہی بات ہے۔

میں سب کا بے حد ممنون ہوں اور ان کی اس عنایت کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں۔

[پگمیلین ہاتھ ملا کر ڈیفنی کے پاس جاتا ہے]

[سائنسکا دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]

سائنسکا ۔پگمیلین۔ میری جان۔

پگمیلین ۔ میری پیاری، سائنسکا۔

سائنسکا ۔ تیری فرقت نے چین نہ لینے دیا۔ اور میں وقت سے پہلے واپس آ گئی۔ [علیحدہ] یہ کون لوگ ہیں؟

[آواز] جناب مجھے معاف کیجئے۔

میں نے خیال کیا کہ میرا شوہر تنہا ہے۔

ڈیفنی ۔ (طنزاً) بے شک۔

میں نے بھی اپنے شوہر کو تنہا ہی خیال کیا تھا مشکل یہ ہے کہ ہم عورتیں اپنے شوہروں پر جلد ایمان لے آتی ہیں۔

سائنسکا ۔ [پگمیلین سے علیحدہ] یہ لوگ کون ہیں؟

پگمیلین ۔ آپ کرائیس ہیں۔ اور آپ ان کی بیگم۔ڈیفنی۔ یہ لوگ اس لئے آئے ہیں کہ ——

ڈیفنی ۔نہیں ہم دونوں مختلف اغراض کے ماتحت آئے ہیں۔

[گلیشیا سے] کرائیس اس لڑکی کی خاطر آئے ہیں اور میں ان کے پیچھے آئی ہوں۔

کرائیس ۔ واقعات کی ترتیب اگر اسی طرح ہے۔ تو اس راز کو کیوں چھپا گئیں کہ پگمیلین تمہارے پیچھے آئے ہیں۔

سائنسکا ۔[گلیشیا کی طرف اشارہ کر کے جو بائیں طرف بیٹھی ہے]

یہ خاتون کون ہے؟ کیا میری آنکھیں مجھے فریب دے رہی ہیں؟

ڈیفنی ۔ بالکل نہیں ۔حقیقت ہی حقیقت نظر آ رہی ہے۔

سائنسکا ۔[ستون کی طرف رخ کر کے] اور مجسمہ بھی غائب ہے۔

پگمیلین ۔ سائنسکا! دیوتاؤں نے اپنی قدرت سے گلیشیا کو زندہ کر دیا۔

سائنسکا ۔ دیوتاؤں میں بڑی قدرت ہے ۔ کیا واقعی یہ وہی مجسمہ ہے جس کو میرے پگمیلین نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے؟

[گلیشیا کے قریب جا کر اس کو بے حد اشتیاق سے دیکھتی ہے]

پگمیلین ۔ ہاں وہی ہے۔

سائنسکا ۔ٹھہرو۔ مجھے تو دیکھنے دو۔

[گلیشیا کے دہنی جانب جھکتی ہے]

ہاں ہاں یہ وہی حسین چہرہ ہے۔ اور وہی گداز جسم۔ جو اسی دلفریب لباس میں اسی طرح ملبوس ہے۔

گلیشیا۔ کیا تو نے مجھے پہچان لیا۔

سائنسکا۔ لو سنو۔ وہ بولتی بھی ہے۔

میری گلیشیا کی آواز کسقدر میٹھی ہے۔ کہتی ہے کہ "پہچان لیا؟"

واہ میں نے گھنٹوں ایک ہی نشست سے بیٹھ کر تجھے نشو و نما پاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں بھی تیری ہی بے حس و حرکت اس کے کام میں ہمہ تن مشغول اور اس کی صناعی میں بالکل محو۔ البتہ جب وقت فرطِ عقیدت سے بے چین ہو جاتی تھی تو کبھی کبھی اپنا پہلو بدل کر اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ اور ان مبارک انگلیوں کو بے اختیار جا کر چوم لیتی تھی۔ جن کی کمال تخلیق کا نتیجہ تو مجسم موجود ہے۔

آ ـــــــ تاکہ میں تجھے بہن کی طرح پیار کروں اور اپنے سینہ سے لگاؤں۔　　[بوسہ لیتی ہے]

دیکھو وہ بوسہ بھی لے سکتی ہے۔

ڈیلفنی۔ ہاں وہ اس ہنر میں بڑی مشاق معلوم ہوتی ہے۔

سائنسکا۔ کیوں پگمیلین۔ ایسی حالت میں جبکہ دیوتاؤں نے تیرے کمال کا خود اعتراف کیا ہے۔ تیرے چہرے پر خوشی اور مسرت کے آثار کیوں نہیں نمودار ہوتے۔

کرائیسس۔ (پگمیلین سے) دیکھو گھبرا کر اصل واقعہ نہ کہدینا۔ بس اسی بیان پر ڈٹے رہو۔　　[گلیشیا کی طرف اشارہ کر کے]

ابھی بچہ ہے۔ لیکن غلط روی اور دروغ گوئی میں طاق ہے۔

افسوس ہے کہ تمہاری دروغگوئی کا باعث یہ ہوئی۔ لیکن مصلحت یہی ہے کہ اب اس جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھو۔　　[دہنی جانب سے جاتا ہے]

سائنسکا۔ (ناراض ہو کر) ہاں اب مجھے معلوم ہوا۔ میں قبل از وقت واپس آ گئی۔

ڈیلفنی۔ نہیں مجھے خوف ہے کہ تم بعد از وقت واپس آئی ہو۔

سائنسکا! آئندہ سے اسے کبھی تنہا نہ چھوڑو یا چھوڑو تو بالکل ہی چھوڑ دو۔　　[دہنی جانب سے جاتی ہے]

سائنسکا۔ (متحیر ہو کر) آہ کیا ہو گیا۔

(پگمیلین سے) کیا تو نے ان تمام باتوں کو پس پشت ڈالدیا۔ جو میں وقتِ رخصت تجھ سے کہہ گئی تھی۔

گلیشیا۔ خاتون اس پر ناراض نہ ہو۔ اور اس کو ملزم ٹھہرانے میں جلدی نہ کرو۔ اس نے تیرے تمام احکامات کی حرف بحرف تعمیل کی ہے تو نے حکم دیا تھا کہ مجھ سے اسی طرح محبت کرے جس طرح تجھ سے کرتا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ ہم دونوں اسی طرح ایک دوسرے کی آغوش میں بیٹھے ہوئے عشق و محبت کی داستان دہرایا کئے ہیں۔

[پگمیلین کے قریب آ کر]

گویا تو وہاں خود بیٹھی ہوئی دیکھ رہی تھی کہ تیرے احکامات کی پابندی کس طرح ہوتی ہے۔

سائنسکا۔ پگمیلین۔ کچھ سنا!

پگمیلین۔ (گلیشیا سے) دور ہو جا میرے سامنے سے۔ تجھے کیا معلوم کہ تیری بے لگام زبان کیا قیامت برپا کر رہی ہے۔

گلیشیا۔ اس کو ملزم ٹھہرانے میں جلدی نہ کر۔ کیونکہ وہ صرف تیری ہی موجودگی میں مجھ سے بدزبانی کر رہا ہے۔ ورنہ تنہائی میں وہ مجھ سے بے حد الطاف و محبت سے پیش آتا ہے۔ دراصل اس کی دو آوازیں ہیں اور دو چہرے۔ ایک دنیا کے لئے اور دوسرا میرے اور خود کے لئے۔

[سائنسکا غیظ و غضب میں بھری ہوئی پگمیلین کے پاس جاتی ہے گلیشیا خوفزدہ ہو کر درمیان سے ہٹ آتی ہے]

سائنسکا۔ تیری بیوی۔ تیری آنکھیں جیت چکی۔ یہ تو جوے کی بازی تھی۔ تو اپنی چال چل چکا اور محبت کا میدان تیرے ہاتھ سے جاتا رہا۔

پگمیلین۔ سائنسکا ٹھہر۔

آہ وہ کیسی منحوس گھڑی تھی جبکہ میں نے دیوتاؤں کی ہمسری کا دعوے کیا تھا اور خود کے لئے قوتِ تخلیق کی دعا مانگی تھی۔

دیوتاؤں نے میری خودی غرور اور تکبر کا چیلنج قبول کر لیا۔ اب وہی میرے حَکَم ہیں اور میری قسمت کا فیصلہ انہیں کے ہاتھ ہے۔

میں انہیں کا گنہگار بھی ہوں۔ تیرا مجرم نہیں ہوں۔ اس لئے مجھ پر رحم کر۔

سائنسکا۔ محبت کے تاجر! نفع تو اٹھائے اور نقصان دوسرا برداشت کرے

دیکھ! میں تجھ سے زیادہ بدقسمت ہوں۔ لیکن اس کے باوجود تجھ سے زیادہ جری۔ میں مصیبتوں کے ہجوم میں یکہ و تنہا ہوں۔ لیکن تیرا شریک غم تیرے سنگین معشوق کی شکل میں موجود ہے۔

آہ۔ [انتہائی غیظ و غضب میں]

اے میری مقدس محلہ آرٹمس کی روح!

پیشتر اس کے کہ میری فطری کمزوری میرے جذبۂ انتقام پر غالب آجائے اور اس بے وفا کا عشق میرے وقتی جوش و خروش کو سرد کر دے۔ میں تجھ سے فریاد کرتی ہوں۔ کہ اگر اس کی نیت میں فتور آیا ہو۔ یا اس کا قدم جادۂ عفت و عصمت سے ڈگمگایا ہو تو از روئے انصاف اس کو واجب سزا دے۔

[پگمیلین ایک چیخ مار کر اپنی آنکھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے]

گلیشیا۔ سائنکا! اس پر رحم کر۔

[سائنکا کے پاس آکر گھٹنے ٹیک کر کھڑی ہو جاتی ہے]

سائنکا۔ اے عورت۔ میرا دل رحم سے خالی ہے۔ کیونکہ جس دعا نے تیرے جسم کی سنگینی کو پگھلا کر نرم کیا ہے۔ اسی نے میرے جسم کی نرمی کو سخت کر کے پتھر میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے سے اپنی قسمتوں کا تبادلہ کر لیا ہے۔ آج سے تو اس کی شریک حیات ہے اور میں ایک بےحس و حرکت سنگین مجسمہ۔

[گلیشیا کو دھکا دے کر علیحدہ کرتی ہے وہ بے ہوش ہو کر اس کے قدموں پر گر جاتی ہے۔ پردہ فوراً گر جاتا ہے۔]

ایکٹ تیسرا

سین حسب سابق

[ڈیفنی دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]

ڈیفنی۔ واقعی پگمیلین کے ہاتھوں میں پتھر کو زندہ کرنے کی خوفناک طاقت موجود ہے۔ لیکن یہ امر دریافت طلب ہے کہ اس طاقت کا کس حد تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔

[مائرین بائیں جانب سے روتی ہوئی داخل ہوتی ہے]

مائرین! کہو خیر تو ہے؟

مائرین۔ آہ ہم کل تک کسقدر خوش تھے اور کتنے مطمئن۔ لیکن ان بارہ منحوس گھڑیوں میں ہمارے اوپر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے پگمیلین موت کی طرح اندھا ہو گیا۔ سائنکا آج ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہی ہے۔ اور میرا لیوسی پس مجھ سے قطع تعلق کر چکا ہے۔ یقیناً میں رنج و الم کے اس بار سے دیوانی ہو جاؤنگی۔

ڈیفنی۔ اور یہ سب گلیشیا کی کرتوت ہیں۔

مائرین۔ (روتے ہوئے) ہاں سب!

ڈیفنی۔ کیا اس کو ان حرکتوں سے باز رکھنا ناممکن ہے؟ کسی کمرے میں مردار کو قید کر دو۔ کسی کے ہاتھ فروخت کر ڈالو۔ یا اس کو توڑ ڈالو کیا اب وہ پتھر کی طرح ٹوٹ بھی نہیں سکتی۔

مائرین۔ نہیں اس کے ٹکڑے تو نہیں ہو سکتے البتہ قیمہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈیفنی۔ آہ میں اگر پگمیلین کی بیوی ہوتی تو اس زہریلی ناگن کا سر کچل دیتی۔ یا اس کی خوبصورتی میں ایسا داغ لگاتی کہ دونوں کا یکجا ہونا ناممکن ہو جاتا۔

مائرین۔ اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ کیونکہ میرا بھائی اپنی بصارت سے ہاتھ دھو چکا ہے۔

ڈیفنی۔ تب بھی کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ کیونکہ انسان پانچ حواسوں کا مالک ہے اگر ان میں سے ایک ضائع ہو جاتا ہے تو وہ قوت جو اس کے استعمال میں آتی تھی۔ بقیہ چار حواسوں میں حصہ رسد تقسیم ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھو کہ اس کے ترکش میں پانچ تیر تھے۔ جن میں سے ایک کام میں آگیا اور چار ابھی باقی ہیں۔ میری بہن! اس دشمن کو نہتا کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ جس کے پانچ ہتھیاروں میں سے صرف ایک ہی ضبط کر لیا گیا ہو۔

مائرین۔ بہرحال اس کی بیوی کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔

ڈیفنی۔ ہاں اس کی خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں۔

مائرین۔ خوش قسمتی؟

ڈیفنی۔ ہاں خوش قسمتی! کیونکہ پگمیلین نے جسقدر اس کا دل دکھایا تھا۔

بلاء ناگہانی سے محفوظ رہنے کے لئے میں نے مستقل ارادہ کر لیا ہے
کہ ان تمام شوخ چشم پتھروں میں سے ہر ایک کو فروخت کر ڈالوں
اور اُس وقت تک کہ میں یہ انتظام نہ کر لوں تم مکان میں داخل
نہیں ہو سکتے۔ بس میں کہہ چکی۔

کرائیس۔ آخر میں نے کونسا قصور کیا ہے؟

ڈیفنی۔ یوں کہئے جناب کہ آپ نے کونسا قصور نہیں کیا ہے؟

کرائیس۔ اس کے شمار کرنے میں بہت وقت صرف ہوگا۔

ڈیفنی۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے تمہیں اس سنگین بلا کے ساتھ اس
طرح بیٹھے دیکھا ہے۔ کہ تمہارا ہاتھ اس کی کمر کے گرد حلقہ کئے
ہوئے تھا۔ اس کی وجہ بتائیے جناب!

کرائیس۔ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ میں فنونِ لطیفہ کا مربی ہوں
اور خصوصیت سے سنگین مجسموں کا دلدادہ۔

ڈیفنی۔ واہ۔ میں بھی فنونِ لطیفہ کی اُتنی ہی شائق ہوں اور سنگین مجسموں کی
اُسی قدر دلدادہ جتنے کہ تم۔ لیکن اس کے باوجود تم نے مجھے کبھی نہ دیکھا
ہوگا کہ میں ایک حسین اپولو کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھی ہوں۔
نہ ہوا یہ بُت اسوقت میرے سامنے۔ ورنہ تمہارا شوق اُس کے
جسم کے ٹکڑوں سے پورا کرتی۔

کرائیس۔ اُس غریب کو الزام نہ دو۔ وہ ابھی بہت کمسن ہے۔
اور بے حد معصوم۔ وہ بیچاری تم سے رحم کی درخواست کرتی ہے

ڈیفنی۔ سچ کہتے ہو۔

کرائیس۔ ہاں بالکل سچ۔
میں اگر اپنی ڈیفنی کو اس حالت میں دیکھوں کہ وہ اپولو کی کمر
میں ہاتھ ڈالے بیٹھی ہوئی ہے۔ تو بقسم کہتا ہوں کہ کوئی باز
پرس نہ کروں۔ [اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے]

ڈیفنی۔ (نرم ہو کر) سچ کہتے ہو؟

کرائیس۔ سچ بالکل سچ۔

ڈیفنی۔ اچھا جاؤ۔ میں تم معاف کرتا ہوں۔ [اُس سے لپٹ جاتی ہے]
انصاف تو یہ ہے کہ واقعات بہت ہی نازک صورت اختیار
کر چکے تھے۔

کرائیس۔ (علیحدہ) میری بدقسمتی نے گلیشیا کی شکل اختیار کی تھی۔

ڈیفنی۔ اچھا چلو۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ میں اپنے تمام بت آج ہی فروخت
کر ڈالونگی۔ کیونکہ پتھر زندہ ہو جانے کے بعد بہت آفت برپا کرتے
ہیں۔

کرائیس۔ بُرا نہ مانو تو میں کچھ عرض کروں۔ دنیا کے تمام ذی روح
اجسام مٹی اور پتھر ہی سے تخلیق کئے گئے ہیں۔

ڈیفنی۔ لیکن وہ اتنے خطرناک نہیں ہوتے کیونکہ ان کی تخلیق دیوتاؤں کے
مبارک ہاتھوں سے ہوئی ہے۔ انسانوں اور شیطانوں کے
اعمال اس کے برعکس نتائج پیدا کرتے ہیں۔

کرائیس۔ چلو اس تمام جھگڑے کو ہم پگمیلین کے سر دے ماریں۔

ڈیفنی۔ [کرائیس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر] ہاں چلو۔

[مائرین عالمِ اضطراب میں دہنی جانب سے داخل ہوتی ہے]

مائرین۔ پگمیلین کو سائنسکا کے ارادہ کا علم ہو گیا ہے۔ یہ خبر اس کے
ہوش و حواس پر بجلی کی طرح گری ہے۔ وہ دیوتاؤں کے
ہیبت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ اگر سائنسکا اس وقت
چلی گئی تو وہ اپنی جان دیدے گا۔ آہ میں کیا کروں ——

[گلیشیا بائیں جانب سے داخل ہوتی ہے]

گلیشیا۔ مائرین! پگمیلین کہاں ہے؟

مائرین۔ منحوس لڑکی!
تیری بے لگام زبان نے جو کچھ قیامت برپا کی ہے۔ کیا اس پر
ابتک تیرا دل ٹھنڈا نہیں ہوا۔ جو اب تو اُس ستم خوردہ کی مصیبت کا
تماشہ دیکھنے آئی ہے۔ خیر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔

گلیشیا۔ میں تیرا مطلب نہیں سمجھی۔

مائرین۔ تو اب سمجھ لے کہ سائنسکا کی جدائی میں پگمیلین کا زندہ رہنا
محال ہے۔ کمبخت اُس کا خون تیری ہی گردن پر ہوگا۔

گلیشیا۔ آہ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ پگمیلین مرجائے اور میں کمبخت
اس کی موت کا باعث بنوں۔ ہائے کیا کروں۔

مائرین۔ میں کیا جانوں ——
ہاں ایک ترکیب ہے۔ بس آخری۔ میں اس سے جا کر کہتی ہوں

کہ تیری بیوی تجھ سے جدا ہونا نہیں چاہتی۔ اور وہ تیری ملاقات کی منتظر ہے۔ جسپر وہ تجھ کو آواز دے گا۔ بس تو اس سے اسی طرح بات کرنا جیسے تو اس کی بیوی سائنکا ہی ہے۔

گلیشیا۔ ہاں ہاں میں سمجھ گئی۔

مائرین۔ اچھا میں جاتی ہوں۔
دیوتا تیری مشکل آسان کریں۔

[مائرین دہنی جانب سے چلی جاتی ہے]

گلیشیا۔ میرے دیوتا مشکل ضرور آسان کریں گے۔ کیونکہ وہ بڑے مہربان ہیں۔ اے آسمانی دیوتا۔ اس نازک موقع پر مجھ کو تیرا ہی آسرا ہے اور میں تجھ ہی سے مدد کی طلبگار ہوں۔ کہ میری آواز گفتار اور رفتار وہی صورت اختیار کر لے کہ جس سے مجھ میں اور سائنکا میں فرق مٹ جائے۔
مجھ کو وہی لہجہ بخشدے کہ جو میرے پیدا ہونے سے قبل سائنکا کا تھا مجھ کو ہمت و جسارت عطا کر کہ میں پگمیلین سے اُسی بے تکلفی سے گفتگو کروں کہ جس طرح اُس کی بیوی سائنکا کرتی۔ تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ خوش قسمت سائنکا کے لئے مجھ کمبخت کے لئے نہیں۔ ہاں وہ زندہ و سلامت رہے۔ کیونکہ میں ہی ان تمام مصیبتوں کا سرچشمہ ہوں۔
[گلیشیا کی لاعلمی میں پگمیلین مائرین کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوتا ہے] کہ جو اس کو ہر چہار طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ میں اس کا عوض اسی صورت میں ادا کر سکتی ہوں کہ اس مصیبت کے پہاڑ کو خود اپنے شانوں پر اُٹھا لوں۔ آہ قبول کر لے میرے پاک دیوتا اپنی ذلیل بندی کی پہلی اور آخری دعا کو میں پگمیلین کے دل کی طلبگار ہوں۔ تو جانتا ہے کہ میں اُس کی زندگی کی طالب ہوں۔

[مائرین اُس کو لے جاکر بائیں طرف بٹھاتی ہے اور پھر دہنی طرف سے باہر نکل جاتی ہے۔ پگمیلین فرط مسرت سے چیخ اُٹھتا ہے۔ گلیشیا اُس کی طرف لپکتی ہے اور خود کو اس کے پیروں پر گرا دیتی ہے]

پگمیلین!

پگمیلین۔ میں نے تیری تمام دعا سنی۔ میرے پاس الفاظ ہی نہیں کہ اپنی مسرت کا اظہار کر سکوں۔ ہاں میری جان۔ تو مجھے بھینچ کر اپنے سینہ سے لپٹا لے تاکہ میرا احساس قوی تر ہو جائے۔ کہ میں نے تیرے ملکوتی حسن اور دیوتاؤں کی فرستادہ محبت کو ٹھکرا کر کتنی بڑی ناشکرگذاری کا ثبوت دیا ہے۔

گلیشیا۔ [اس مغالطہ میں مبتلا ہو کر کہ پگمیلین کا مطلب اسی کی ذات سے ہے]
پگمیلین! میری جان! میری روح!
ذرا پھر وہی الفاظ کہدے۔ ہاں ذرا ان کو دُہرا دے۔ میرے دل کو اطمینان بخشنے کے لئے پھر کہدے کہ تو نے مجھے ان تمام قصوروں سے معاف کیا کہ جو مجھ سے لاعلمی میں سرزد ہو گئے تھے

پگمیلین۔ میں تجھے معاف کروں۔ واہ میری معصوم سائنکا!

[گلیشیا کے حواسوں پر بجلی گرتی ہے]

میں خود تیرا مجرم ہوں۔ لیکن میں تجھ سے صرف اس لئے معافی نہ مانگ سکا کہ مجھ میں تیرے سامنے لب کشائی کی ہمت نہ ہوئی اس کے علاوہ تیری معلمہ آرٹمس کی شرط کی رو سے تو حق بجانب تھی۔ کہ میری لغزشوں پر مقررہ سزا دے۔ اور اب میں دیوتاؤں کی فرستادہ مصیبتوں کو صبر و سکون سے برداشت کرنا بھی سیکھ گیا ہوں

گلیشیا۔ [کوشش کرنے کے بعد] لیکن یہ عورت۔ گلیشیا۔

پگمیلین۔ کیا؟

گلیشیا۔ کیا اُس کی محبت تیرے دل میں مردہ ہو گئی۔

پگمیلین۔ کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

گلیشیا۔ کیا تو نے کبھی اُس سے محبت کی ہی نہیں۔

پگمیلین۔ کبھی نہیں۔ ہاں البتہ۔ اُس مافوق الفطرت واقعہ پر کہ جس نے میرے کمالِ فن پر مہر صداقت ثبت کر دی تھی اور اور میرے شاہکار کو حیات کی دلاویزیوں سے معمور کر دیا تھا۔ میرے ہوش حواس پر حیرت و استعجاب کا ایک پردہ چھا گیا اور میں اُس کے ملکوتی حسن و جمال کے سامنے شکست کھا گیا۔ کیونکہ میں نے اپنی راتیں اُس کی پرستش میں صرف کی تھیں۔ اسوقتہ

جبکہ وہ صرف ایک سنگین مجسمہ تھی۔ اس لئے کہ اس کے چہرے کے خط و خال میں مجھے سائنسکا کا جلوہ نظر آتا تھا۔ لیکن جس وقت کہ وہ زندہ ہو کر میری محبت کی طلبگار ہوئی۔ میرا جذبۂ عشق تمام و کمال مردہ ہو گیا۔

گلیشیا۔ [بے حد ضبط کے بعد] مرحبا۔ گویا اب تم اُس سے محبت نہیں کرتے اور اب تمہاری نظروں میں وہ بے جان پتھر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی؟

[جواب کے انتظار میں امید و بیم کی حالت]

پگمیلین۔ میرے سامنے اُس منحوس کا تذکرہ نہ کر۔ سائنسکا کیونکہ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میری نظروں میں سڑک پر پڑے ہوئے بے ہنگم اور ناتراشیدہ پتھروں کی زیادہ وقعت ہے اور اس حسین و جمیل مجسمہ کی کہ جس میں نسوانی تناسب اور کشش کی انتہا ہو گئی ہے کوئی وقعت نہیں۔

گلیشیا۔ (انتہائی ضبط کے ساتھ) مجھے یہ سُن کر بے حد خوشی ہوئی۔ تیرا قصور معاف کیا گیا۔

[اس کے ماتھے کا بوسہ لیتی ہے اور اُٹھ کر روتی ہوئی دہنی جانب آتی ہے]

پگمیلین۔ (بیٹھے ہی ہوئے) تو نے مجھے معاف کر دیا۔ اور باوجود اس کے کہ آرٹس کے قانون کی رو سے میری آنکھوں کا وہ نور جو تیری ناراضگی کے باعث غائب ہو گیا تھا۔ فی الفور واپس آ جانا چاہئے۔ لیکن میں دست بدعا ہوں کہ میری آنکھیں بند ہی رہیں۔ تاکہ وہ اس سبز قدم مجسمہ پر نہ ٹھہر جائیں کہ جو میری بربادی کا باعث بنا۔

گلیشیا۔ ہاں پگمیلین ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔

یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم گلیشیا کو ابھی دیکھ لو تو ممکن ہے کہ تمہارے دل میں محبت کی دبی ہوئی چنگاری پھر بھڑک اُٹھے۔

پگمیلین۔ کبھی ہرگز نہیں۔

گلیشیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر رنج و الم کا اسقدر بار ہے کہ الفاظ اُس کی کیفیت بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

پگمیلین۔ اگر یہ اصلیت ہے تو میں بہت خوش ہوں۔

گلیشیا۔ (آگے بڑھ کر التجا کے لہجہ میں) کیا تیرے دل میں اُس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

[سائنسکا دہنی جانب سے اس طرح داخل ہوتی ہے کہ ان دونوں کو اس کی موجودگی کا علم نہیں ہوتا۔ وہ دروازے میں کھڑے ہو کر ان دونوں کی گفتگو کو کان لگا کر سنتی ہے]

پگمیلین۔ بالکل نہیں۔

وہ مصیبتیں کہ جو اُس نے تجھ پر۔ مجھ پر اور مائرین پر نازل کی ہیں بس اُن کا خیال کر کے ہم حق بجانب ہیں۔ کہ اُس منحوس گھڑی کو کوسیں جبکہ وہ پتھر سے انسان بنی تھی۔ کاشکہ اُس کا نشان اس صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ کیونکہ وہ اس دنیا میں رہنے کے قابل نہیں۔

گلیشیا۔ (انتہائی مایوسی میں) ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ اس مبارک دنیا میں رہنے کے قابل نہیں۔ بہتر ہے اب تم اس کی صورت نہ دیکھو گے۔

[سائنسکا کا ہاتھ پکڑ کر اُس کو پگمیلین کے پاس لے جاتی ہے]

مبارک ہو تیری بیوی۔ تیرے سامنے کھڑی ہے۔

[سائنسکا پگمیلین کے دہنی جانب گھٹنے ٹیک کر کھڑی ہو جاتی ہے گلیشیا اُلٹے قدموں دہنی طرف واپس جاتی ہے۔ سائنسکا اُسی عالم میں گلیشیا کی طرف مڑتی ہے اور اُس سے بات کرنے کو منہ کھولتی ہے مگر گلیشیا اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہے۔ اور خود زار و قطار روتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد سائنسکا پگمیلین سے لپٹ جاتی ہے۔ جس پر اس کی آنکھوں کا نور فوراً واپس آ جاتا ہے]

پگمیلین۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) سائنسکا دیکھ! صبح کا نور اب کس کی ملکیت ہے۔ تیرے حسین چہرے کی دوبارہ زیارت کر رہا ہوں

[مائرین اور لیوسی پس دہنی جانب سے داخل ہوتے ہیں]

لیوسی پس۔ پگمیلین! مبارک ہو تیری آنکھوں کا نور۔ تیرے خفتہ نصیب۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیدار ہو گئے۔

پگمیلین۔ اور تیرے نصیب! کیا مائرین نے تجھے خود طلب کیا۔

لیوسی پس۔ نہیں میں خود ہی واپس آ گیا۔ پشیمان ہیں بلکہ مغموم اور رنجیدہ

کیونکہ میرا دل پتھر ہے اور ہاتھ خونی۔
میرا خیال تھا کہ وہ مجھے مجرم بنا کر عدالت تک لے جائیگی۔ لیکن
وقت نے خود اس کے مزاج میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا
وہی لڑکی کہ جو چند گھنٹے قبل مجھ کو سنگدل خونی سمجھ کر بد دعائیں
دے رہی تھی۔ اب اس نے نہ صرف میرا سنگین جرم معاف کر دیا۔
بلکہ فرط جوش و مسرت سے مجھے بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ اور میرے
شکار کو آگ میں جھلستے دیکھ کر للچائی ہوئی نظروں سے دریافت
بھی کیا کہ وہ کب تک پک جائے گا۔ ننھی سی آدم خور! ——
[گلیشیا بائیں جانب سے داخل ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اسٹیج کے
وسط میں آتی ہے اور پگمیلین کی پشت پر جا کر اس کے دامن کو
بے اختیار ہو کر چومتی ہے]

مائرین۔ [تھوڑے توقف کے بعد] پگمیلین!
دیکھ گلیشیا تیرے قریب ہے۔

پگمیلین۔ [سائنسکا کی طرف سے نظریں ہٹا کر اپنے چہرے کو موڑتا ہے۔
اور گلیشیا کی طرف دیکھ کر کہتا ہے]
تجھے عورت کہوں یا پتھر۔ بس دور ہو جا میرے سامنے سے۔
[وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیتی ہے]
میرے خرمن محبت کے لئے تو ایک بجلی بن کر گری۔ جس نے نہ صرف
مجھ ہی کو برباد کیا۔ بلکہ ہر اس شخص کو مبتلاء درد کیا کہ جو تیرے
دائرۂ اثر میں آگیا۔

سائنسکا۔ نہیں نہیں پگمیلین۔ ان الفاظ کو واپس لو۔ تمہیں تمام حقیقت کی
اطلاع نہیں۔

گلیشیا۔ (واپس جاتے ہوئے) نہیں اب مجھے جانے ہی دو۔ اس کی
زبان سے نکلی ہوئی بد دعا میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اب
اس کے بعد زندگی میرے لئے موت سے زیادہ سخت ہوگئی ہے
[وہ ستون کے زینہ پر قدم رکھتی ہے]

آہ رخصت پگمیلین! رخصت۔
کیونکہ میں اس دنیا میں زندہ رہنے کے قابل نہیں۔
ہاں تمہاری اس مبارک دنیا میں میرا منحوس وجود بیکار ہے
مبارک ہوں تم کو تمہاری مسرتیں۔
رخصت۔ پگمیلین۔ رخصت! رخصت!
[پردے اس کو چھپا لیتے ہیں]

سائنسکا۔ تو نے اس پر اتنا ہی ظلم کیا ہے جتنا کہ میں نے تجھ پر کیا تھا۔ وہ
آواز کہ جس نے تجھے معاف کیا تھا۔ دراصل میری نہ تھی۔
بلکہ اسی کی تھی۔
کیونکہ میں اس وقت تک جذبۂ رحم سے قطعی ناآشنا تھی۔ یہانتک
کہ اس نے مجھے ایک زریں سبق دیا۔
اس کے حلق سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے اور
دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ جہاں انہوں نے غیر ارادی طور پر
ایک لرزاں گونج پیدا کر دی۔ میری زبان پر بے ساختہ طور سے
وہی الفاظ جاری ہوگئے۔ جنہوں نے تجھ کو دوبارہ بصارت بخشی
اس لئے تیرے شکریہ کی وہ مستحق ہے نہ کہ میں۔

پگمیلین۔ (متحیر ہو کر) سائنسکا! کیا تو سچ کہہ رہی ہے۔

سائنسکا۔ حرف بہ حرف۔

گلیشیا۔ (پردوں کے پیچھے سے) رخصت پگمیلین رخصت! رخصت!!
رخصت!!!
[پگمیلین ستون کی طرف بے اختیار ہو کر لپکتا ہے اور پردوں کو
چیر کر اندر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں دیکھتا ہے کہ گلیشیا بدستور سابق پتھر کا
ساکت و صامت مجسمہ بنی کھڑی ہوئی ہے۔ لیوتسی پس اور مائرین
کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مائرین اپنا منہ لیوتسی پس کے سینہ سے
لگا کر چھپا لیتی ہے۔ سائنسکا دفور غم سے اپنی جگہ سے گر جاتی ہے پگمیلین
پچھاڑ کھا کر مجسمہ کے دہنی جانب گر جاتا ہے۔ پردے آہستہ آہستہ گرنے لگتے ہیں]

(ڈراپ)

(ابوطاہر۔ بی۔ ایس۔ سی۔ بی ٹی۔ لکھنؤ)

غزل

(سحبان الہند حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی)

نظر حسرت کی ہے اور وسعتِ شام بیاباں ہے
بتا اے نیرِ محشر تو کس پردے میں پنہاں ہے

جنونِ خانہ برانداز میرا کیسے بہلے گا
نہ وہ دامن کے ٹکڑے ہیں نہ وہ تارِ گریباں ہے

مری پابندیاں جذبِ محبت کی ہیں آزادی
قفس میں میں ہوں اور آغوشِ دیدہ میں گلستاں ہے

کنارہ بحرِ غم کا ہے جسے سب زیست کہتے ہیں
مرا دل نام ہے جس کا وہ امیدوں کا طوفاں ہے

نظر آیا وہ گیسو خواب میں ہے میرے شانوں پر
کھلی جب آنکھ دیکھا ہاتھ میں اپنا گریباں ہے

یہی ہے اتحادِ باہمی دریا کا سرمایہ
کبھی طوفاں میں موجیں ہیں کبھی موجوں میں طوفاں ہے

دم آیا ہے لبوں پر دیکھ لے اے جان کے دشمن
کہ میری زندگی بھی مجھ سے فرقت میں گریزاں ہے

فریبِ دید ہے بالکل لباسِ ظاہری اُس کا
حقیقت میں وگرنہ وہ تو پردے میں بھی عریاں ہے

نمودِ عشق کی صورت ہے پردے میں نہیں رہتی
مرا ہر داغ دل میں کم سے کم خورشید تاباں ہے

تجھے پردے میں بھی حسنِ نظر نے صاف پہچانا
تبسم تیرا غنچہ اور گلشن روئے خنداں ہے

خدا رکھے امیدوں کو کہ ان کا دم غنیمت ہے
وگرنہ وقتِ آخر اور میرا کون پرساں ہے

جھکائے سر کو بیٹھا ہوں کہ وحشت میں کہاں جاؤں
تصور کی عنایت سے گریباں میں بیاباں ہے

بتاؤں کیا اِسے؟ یہ پوچھتا ہے مجھ سے دل میرا
کہ آئینے میں کیوں عکسِ جمالِ روئے جاناں ہے

کھٹک دل کی بنی ہے نغمہ میرے سازِ ہستی کا
جسے پیکاں میں سمجھا تھا وہی تارِ رگِ جاں ہے

یہ جو کچھ حوصلہ ہے منحصر ہے ظرف پر کیفی
کرم ساقی کا ہو تو میری مستی درسِ عرفاں ہے

ایک سٹیج ڈرامہ

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

تگڈم

(از جناب سید طالب علی صاحب عابد ایم اے۔ الٰہ آباد)

موسم........ برسات **وقت**....... ایک ہفتہ

سین

داخلی۔ مکان۔ تھانہ۔ چترگھر۔ ملاقات۔ اور سونے کے کمرے۔ نہانے کا کمرہ۔ سیمنٹ کے ٹب۔ .... **خارجی**۔ باغ۔ شہر۔ سڑک۔ موٹر۔ جھولا۔ سرنگ۔ بڑے درخت

افراد افسانہ

خاص مرد

۱۔ **سروپ**۔ کالج کا گبرو جوان۔ پہلوان حسین بھکیت شریف بنوٹیا۔
۲۔ **سلامت**۔ سروپ کا ساتھی وفا کا پتلہ
۳۔ **کھلاون**۔ بگڑا شریف چالیا۔ موالی بے دھرم۔ لچا بے شرم۔ شرابی۔

خاص عورتیں

۱۔ **رتن**۔ رام لال کی حسین لڑکی۔ سروپ کی پریمنی
۲۔ **چندا** کھلاون کی سگسنی شریر سندری نردوش
۳۔ **رادھا** کھلاون کی دھرم پتنی۔ دیوی۔

عام مرد

۱۔ **شیولودھ**۔ چترکار سروپ اور سلامت کا ساتھی
۲۔ **رام لال**۔ موٹا بوڑھا۔ بیوقوف رتن کا پتا
۳۔ **سداہسٹ**۔ گنڈوں کے جتھے کا سردار

عام عورتیں

۱۔ **کامنی**۔ بال ودھوا سندری۔ سلامت کی پریمنی۔ کھلاون کا شکار
۲۔ **سداما**۔ رام لال کی بیوی ہکلی
۳۔ **موتی**۔ رتن کی سندر الھڑ گنوار داسی۔

متفرق

جوکھو اور کھکن } جتھے والے۔ شرابی موالی لٹھ باز۔ بھجالئے۔ داروغہ جی۔ توند ملئے۔ زیٹئے۔ ایک مولوی صاحب۔ بہت سے بہت سے گنڈے۔ گہار والے لٹھیت۔ بہت سے شرابی۔ نوکرانیاں۔ ایک بازاری عورت اور بہت سی معمولی عورتیں۔

سروپ اور رتن لگنیا جوڑے ہوئے جھول رہے ہیں۔ آم کی ڈال میں ریشم کی ڈور پڑی ہوئی ہے۔ ساون کی رات ہے۔ کبھی ڈھلی ہوئی چاندنی ہو جاتی ہے۔ کبھی بادل کے مہین ٹکڑے چندرماں پر آجاتے ہیں۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ بطوں کا ایک جوڑا تیر رہا ہے۔ مور کا ایک جوڑا مگن ہو کر پر پھیلائے ناچ رہا ہے۔

سروپ اور رتن پریم رس میں کھوئے ہوئے گا رہے ہیں:۔ ؎

پریم ہی تن ہے پریم ہی من ہے۔ پریم ہی ہے سنسار
پریم ہی بالم پریم ہی بالم پریم ہی ہے منجھ دھار
پریم ہی دھن ہے پریم چلن ہے پریم ہی ہے بیوہار
پریم ہی ڈالی پریم ہی مالی پریم ہی ہے گلزار
پریم ہی راج ہے پریم ہی تاج ہے پریم ہی ہے سردار

بھیگ لینے میں ادھر بھیگی مہین ساری سے رتن کا بدن اور بدن کی

بناوٹ سب معلوم ہوتی ہے۔ آنکھ ملتی ہے تو ایک طرف کا مُنا اور
دوسری طرف ٹنّی بڑھ جاتی ہے۔ دونوں جھولے سے اتر کر ایک
سفید بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ چاندنی کھلتی ہے۔

سروپ۔ کتنی سندر ہو رتن!۔ رتن چُپ رہتی ہے۔

سروپ۔ کب تک لجاؤگی پیاری۔ بولو (دونوں ہاتھ پکڑ لیتے)

رتن۔ (مسکرا کر) دیکھئے۔ ہاتھ چھوڑ دیجئے۔ نہیں تو ——

سروپ۔ (ہاتھ چھوڑ کر) نہیں تو کیا ہوگا۔ شوق کے ہاتھ رُک نہیں سکتے۔ ہاتھ ٹوٹیں کہا کرے کوئی۔

رتن۔ تو آپ اپنے کالج کب سدھاریں گے۔

سروپ۔ کل سویرے۔

رتن۔ (رُک رُک کر) سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روئے
بدھنا یہ رین ایسی کرو کہ کبھو نہ بھور نا ہوئے
(ایک ایک شبد الگ الگ کر کے کہتی ہے)

سروپ۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ (ذرا اور پاس آکر) میں آپ کو پران سے چاہتا ہوں رتن۔

رتن۔ اور میں؟

سروپ۔ وہی تو پوچھتا ہوں؟

رتن۔ جو کہئے کہہ دوں؟

سروپ۔ کہہ دیجئے میں آپ پر مرتا ہوں۔

رتن۔ میں آپ پر مرتا ہوں۔

سروپ۔ مرتا نہیں مرتی ہوں۔

رتن۔ مرتا نہیں مرتی ہوں۔

سروپ۔ جو کچھ میں کہوں اسے نہ دُہرائیے۔ اپنے من کی کہئے۔

رتن۔ (رتن رُک رُک کر) ؎

کر بچھڑائے جات ہو نربل جان کے موئے
ہردے میں سے جائیو تو مرد بکھانوں توئے

سروپ۔ آج تو آپ کبیر داس ہو رہی ہیں (اور پاس ہو جاتا ہے)

رتن۔ چلئے چلئے میں آپ کے من کی بات جان گئی۔

سروپ۔ کیا جان گئیں رتن۔

رتن۔ یہی کہ آپ اُس کو مجھ سے بھی ادھک چاہتے ہیں۔

سروپ۔ (گھبرا کر) کس کو؟

رتن۔ اپنے پاٹ شالے کو۔

سروپ۔ (ہنس کر) مار ڈالا ظالم۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے

رتن۔ (چھیڑ کر) لو اب میں جاتی ہوں۔ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے۔

سروپ بے بس ہو کر کھینچ کر گود میں بٹھا لیتا ہے۔ دونوں پریم آنند میں کھو جاتے ہیں —— رتن دھیرے دھیرے الگ ہوتی ہے۔

سروپ۔ (دوزانو ہو کر) چھما کیجئے دیوی!

رتن۔ (مسکرا کر) تم بڑے وہ ہو تمہیں کاٹ کے ٹکڑے کر دیں۔

سروپ۔ دیوی ہو رتن۔

زور کی بارش ہوتی ہے۔ بجلی چمکتی ہے۔ بادل گرجتا ہے۔ اندھیرا ہو جاتا ہے۔

رتن۔ اچھا اب وداع کیجئے۔

سروپ۔ چلئے کمرے تک پہونچا دوں۔

کمرے تک سروپ اپنی آڑ میں چھپائے ہوئے لایا۔ پھر بھی رتن بھیگ گئی۔ دونوں آگ سے کپڑے سکھانے لگے —— پھر سروپ گاتا ہے۔ ؎

ہم اپنے دل پہ لئے غم کا داغ جاتے ہیں
اندھیرے گھر کا یہ ہوگا چراغ جاتے ہیں

(رتن بھی گانے میں شریک ہو جاتی ہے) ؎

کل مجھ سے جو پوچھا یہ کسی نے کہ بتا تو
کیا حال ہے اے بسمل صمصام جدائی
کیوں دل پہ ترا ہاتھ ہے کیوں آنکھ ہے پُرنم
ہے تجھ سے جدا کون سا آرام جدائی
آغازِ جدائی کو جدائی نہ سمجھ تو
ہوتا ہے وصال ایک دن انجامِ جدائی
تب میں نے کہا ہائے نہ پوچھو یہ نہ پوچھو
کچھ اور کرو ذکر نہ لو نام جدائی
اللہ نہ دے گردشِ ایامِ جدائی ہو کم صبحِ قیامت سے نہیں شامِ جدائی

سروپ جاتا ہے۔ رتن سونے والی مہین ساری بدل کر اپنے
بستر پر لیٹ جاتی ہے۔

{موتی۔ رتن کی داسی جوان ہے حسین ہے۔ الھڑ ہے۔ گنوار ہے
سناٹا دیکھ کر رتن کے حوض میں نہاتی ہے چاہتی ہے کہ اٹھے
مگر بار بار پھسل جاتی ہے}

ہائے رے کر گئی۔ اوہ میں مرگئی۔ مرگئی۔ مرگئی۔ کہتی ہوئی نکلتی
ہے۔ ایک دوسری ساری پہن کر سنگار دان کے سامنے کھڑی
کھڑی ہو کر بال جھاڑتی ہے۔ مانگ نکالتی ہے۔ سرمہ لگاتی
ہے۔ اور گاتی ہے۔ ؎

میری پھلتی پھولتی جوبن کی ڈالی اسے رکھونگی کیسے سنبھال کے
اسے رکھونگی کیسے سنبھال کے
آگئی ری جوانی دیوانی — اسے رکھونگی کیسے سنبھال کے
اسے رکھونگی کیسے سنبھال کے

{کھلاون نشہ میں چور۔ لڑکھڑاتا ہوا۔ کلے میں پان دبائے۔ بانکا
چھیلا بنا ہوا آتا ہے}

ہائے جالم مار ڈالا آج تو جوبن پھٹا پڑتا ہے۔ پری بنگئی ہو موتی پری

موتی۔ کھلاون بابو اس نہ گھورو۔ لگ جیہیں جوبنا پہ چوٹ راجہ لگ جیہیں

کھلاون۔ تورا اُمکارے جوبنوا گوریا کا ہے کرت ناہیں دان کر دیا کا ہے
(بڑھ کر ہاتھ تھامتا ہے)

موتی۔ رام موری کلیاں مرک جیہے۔ موکا چھانڈ دو ناہیں تو گر پائے دیبے
(تن جاتی ہے)

چھوو نہ مورا جوبنا پھٹے گاری دیبے ہو چھوو نہ مورا جوبنا۔
الھڑپنے سے ناچتی ہے اور بھاؤ بتاتی ہے۔

کھلاون۔ تمہارے منہ سے گالی بھی پھول کی چھڑی بن جائے گی ——
لاؤ ایک گرما گرم تو دلاؤ۔

موتی۔ (مٹک کر) گرما گرم چاہئے کے لیو کو نو ریڈی پتریا کے —— مورے
جوبنا پہ نتھیا کلیل کرے رے۔

کھلاون۔ (بڑھ کر ایک بوسہ لیتا ہے۔ موتی ایک تپانچہ ہلکے سے مارتی ہے)
دیکھو بابو جی ہم جات رہی۔

کھلاون۔ کہاں۔

موتی۔ تھانے میں۔ رپٹ لکھوائے دیبے۔

کھلاون۔ ابھی تو موری چھوٹی سی موتی رے۔ موتی تم تھانے مت جانا
دروگا تم کو موہ لے گا رے۔ دروگا۔

موتی۔ نکھول نیک ناہیں لاگت بابو۔ ہاں ہم سب ٹھیک کردھیا ہے
مُدا سو روپیہ سے ایکو ڈبل کم نہ لیبے۔

کھلاون۔ جانی۔ سو کیا۔ تمہارے اوپر سے ہزاروں نثار ہیں۔ مگر
اسوقت دس روپے نقد النقد لے لو۔ کام ہو جانے پر۔ تمہارا
منہ بھر دیں گے۔

موتی۔ جھوٹ نہ بولو۔

کھلاون۔ جھوٹ کہتا ہوں تو سامنے کی دونوں آنکھیں پھوٹ جائیں

موتی۔ ہمری آنکھ۔

کھلاون۔ پیاری تمہاری ان مدھ بھری انکھڑیوں کو کوئی ترچھی
نظر سے دیکھے تو آنکھیں نکال لوں۔
(ہونٹ چھو کر) ان ہونٹوں کو کوئی چھوئے تو انگلیاں کاٹ لوں
آؤ پیاری گلے تو لگ جاؤ۔ پیاس تو بجھاؤ ———

موتی۔ (کمر مٹکا کر) اہ جون بابو جی پر شیطان چڑھا ہے۔ میں جاتی ہوں

کھلاون۔ (ہاتھ بڑھاتا ہے۔ آنکھ بند کر لیتا ہے) ایک دو ———
دیکھو تین نہ کہوں کہ مجھ سے آکر لپٹ جاؤ اور میں اسے لپٹا لوں
(موتی ناز سے بھاگتی ہے کھلاون آدھی آنکھ کھول کر آنچل
پکڑ لیتا ہے۔ ساری آدھی کھل جاتی ہے۔ چست کرتی دکھائی
دیتی ہے۔ موتی لجا کر پھر گھوم پڑتی ہے اور ساری پھر
لپٹ جاتی ہے)

کھلاون۔ تم تو ست بچنا گھومنے لگیں۔

موتی۔ (بگڑ کر) بابو کھلاون تم ہو گھن چکر۔

کھلاون۔ ہاں تو پھر میں اپنے آدمیوں سے کہدوں کہ جسوقت تم
سبز روشنی دکھاؤ۔ میدان صاف سمجھیں۔

موتی۔ ہاں۔

کھلاون۔ تم نے دھوکا دیا تو یاد رکھنا کہ (اشارہ کرتا ہے) لپٹا ہی لونگا

موتی - (چھپ کر) رتن ہوئی پڑی سوت ہیں - ماں جی جاگت آہیں - بابوجی ابھیں سوئے ناہیں - بڈھا بڈھی سوئے جائیں تب مالہ گنٹھے -

[کھلاون دس روپے دے کر جاتا ہے]

رتن کے سامنے والے مکان کا اندھیرا کرہ - سواہٹ - جوکھو اور بھکن تینوں موالی دھندھلکے میں بیٹھے ہوئے ہیں - پہلو میں اک ہتھی ڈنڈے اور بھالیاں ہیں -

سداہٹ - یار میرے (سوتی ہوئی رتن کو انگلی سے دکھا کر) بڑا بانکا مال ہے - کیسا گدرایا جوبن ہے - ہائے رام -

بھکن - ہے تو مگر ہیں کیا -

جوکھو - پٹاخہ ہے پٹاخہ ——— ہائے ہائے -

بھکن - چوزہ ہے چوزہ ———

سداہٹ - ہم تو اپنی جان جوکھم میں ڈال کر لڑکیاں اڑا لاتے ہیں اور بابوجی ہم کو دور ہی سے ٹھینگا دکھاتے ہیں - پکڑے جائیں تو گت الگ بنے اور کال کوٹھری الگ ہو - کھلاون بابو کبھی ہمکو اپنا اگلا نوالہ بھی نہیں دیتے -

بھکن - سردار جی - اگلی گٹھلی آپ ہی چاٹئے - ہم تو کوری سینگل کھاتے ہیں - کھلاون بابو کو ہوا بھی نہیں دیتے -

سداہٹ - دیکھو بھکن - وہ تو ہمیں بھاڑ میں جھونک دیتے ہیں بس میں چنگی چھوڑ جالو دور کھڑی - مگر ہم رتن کو مانگ لیں گے -

جوکھو - ساجھے کی ہانڈی بزار میں پھوٹے - اب وہ دن نہیں کہ (مونچھوں پر تاؤ دے کر) ایک استری کے دو پتی ہوں -

سداہٹ - یار میں تو لٹ گیا - اس چھوکری رتن نے مجھے لوٹ لیا - اب تو جان جائے مگر اس کو ہاتھ سے جانے نہ دونگا -

جوکھو - گلا نہ پھاڑیئے سردار جی - کہیں بابو نے سن لیا تو الٹی آنتیں گلے پڑیں گی -

سداہٹ - (مونچھوں پر تاؤ دے کر) ہم کیا کسی سے کم ہیں - وہ سیر تو ہم سوا سیر اور پھر ایسا تر مال روز روز تو ملتا نہیں - ہائے جانی -

کھلاون - (چپ چاپ اندر آ کر ہنستا ہے) کیا کہہ رہے ہو سداہٹ -

سداہٹ - (گھبراہٹ) کچھ نہیں - پاس لگی تھی - پوچھ رہا تھا - لائے پانی -

کھلاون - مجھ سے اڑتے ہو - بولو - میں اڑتی چڑیا -

سداہٹ - آپ سے کہتے شرم آتی ہے ——— مالک کی چیز پر آنکھ ڈالنا نمک حرامی ہے مگر بابوجی - (ہاتھ جوڑ کر) رتن مجھے نہ ملی تو مر جاؤنگا -

کھلاون - (روشنی جلا کر) نمک حرام کمینے - اس خیال کو اپنے سر سے نکال دے ورنہ کچل ڈالوں گا - میرے کاٹے کا مرہم نہیں -

جوکھو - سردار جی آج ذرا الٹی چڑھا گئے ہیں دل لگی کر رہے تھے -

کھلاون - مجھ سے دل لگی -

بھکن - ترنگ میں ہیں - آپ کو ہم سمجھ رہے ہیں - اپنی جان میں ہم کو بنا رہے تھے -

سداہٹ - چھما کیجئے بابوجی - غصہ کو تھوک دیجئے -

جوکھو - گولی ماریئے جانے دیجئے -

(سب کے سب ہنس پڑتے ہیں)

کھلاون - یہ لو رومال اور یہ لو کلوروفارم کی شیشی دیکھو تمنے کے پاس لیجانا اور ایک منٹ تک رکھنا جو انی کی نیند ہے زور سے سانس لے گی تو بس کام بن جائے گا - مگر تم لوگ اپنا منہ اور اپنی ناک بند رکھنا تمہارے نتھنے کا کوئی سوراخ کھلا رہ گیا تو الٹ جاؤگے - سمجھے؟

جوکھو - سمجھ گئے بابو سب سوراخ بند کر دینگے -

کھلاون - میں جاتا ہوں - تم لوگ موتی کی سبز روشنی دیکھتے ہی پہونچ جانا - موتی دروازہ کھلا رکھے گی اور وہیں جنگل والے اڈے میں لانا -

کھلاون مارواڑی کے بھیس میں ایک طرف روانہ ہوگیا - اس کے اوجھل ہوتے ہی موتی نے سبز ٹارچ دکھائی - تینوں چوکنے ہوگئے -

سداہٹ - جوکھو اور بھکن ڈھاٹے باندھ کر ڈنڈے اور بھالی سنبھال کر چلتے ہیں - پانی موسلادھار برس رہا ہے - ہاتھ کو

ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا بجلی کی چمک میں دیکھ دیکھ کر راستہ چل رہے ہیں۔

رتن بائی اپنے مہین کپڑوں میں سو رہی ہے۔ سنگیگاتی ہے گویا کچھ سوپن دیکھ رہی ہے۔ اس نے دیکھا کہ ایک بڑا سا کالا ناگ آکر گلے سے لپٹ گیا۔ دم گھٹنے لگا تو دھیرے سے کہا ماتا جی پھر بولی۔ پران ناتھ سروپ۔ سروپ نے آکر کالے کو پھن کے پاس سے پکڑ لیا اور رگڑ رگڑ کر مار ڈالا۔ رتن چونک پڑی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھا پھر سو گئی۔

موتی۔ (کانپتے ہوئے) دیکھو ذرا کو آہٹ نہ ہوئے۔

سداہٹ۔ کھڑکیاں اور دروازہ کھلے ہیں نا؟

موتی۔ ہاں (مسکرا کر) سب کھلے ہیں۔ سداہٹ آگے بڑھ جاتا ہے۔ جوکھو چلتے چلتے موتی کا منہ ایک ہاتھ سے بند کر کے لپٹا لیتا ہے۔ اور ایک بوسہ لے لیتا ہے۔

موتی۔ (دھیرے سے) ہائے۔

جوکھو۔ ہائے وائے کرو گی تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہا ہا ہا ہا

تینوں اندر آتے ہیں۔ سداہٹ شیشی ناک کے پاس لے جاتا ہے مگر رتن چونک پڑتی ہے اور چیخنا چاہتی ہے۔ سداہٹ فوراً رومال منہ میں ٹھونس دیتا ہے اور دونوں ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ پھر کہتا ہے جوکھو تم دونوں ہاتھ پکڑ لو۔ پھکن تم پاؤں سے خبردار رہو مچھلی ہے مچھلی۔ تھوڑی دیر تڑپے گی کھیلے گی پھر چپ ہو جائے گی۔ بھلا ہماری کٹیا میں پھنس کر کون نکل سکتا ہے۔

رتن تڑپتی ہے مگر نہیں چھوٹتی جوکھو۔ چھچھل ندیا بنسی ڈوبت ناہیں

سداہٹ۔ چپ چاپ لے چلو۔ کوئی سن نہ لے۔

تینوں لے چلے رتن تڑپتی ہوئی چلی۔ تڑپنے میں بدن کا جو حصہ کھل جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی اسکو ڈھانک دیتا تھا۔

جوکھو۔ اچھا ودع کرو موتی۔

موتی۔ (انگلیاں چٹاچٹ توڑ کے) نرک میں جاؤ جوکھو۔

تینوں کے جاتے ہی لگی چیخ چیخ کر رونے۔ ہائے دَدّا رے۔ ہائے بٹیا رے۔ ہائے میّا رے۔ موری بہوئی۔ ہائے بہوئی۔

دہائی ہے بابو جی دوڑو۔ مہارانی جی دوڑو۔

رام لال آنکھ ملتے ہوئے اُٹھتے ہیں۔ اپنی بیوی کو جگاتے ہیں۔ دیکھو تو رادھا۔ موتی کہیں گر گئی ہے۔ میں بھی اٹھتا ہوں تو مسہری کو ٹھیک کرتا ہوں۔

رادھا۔ (نیند میں) تھ کھی ٹھیک (ہکلانے کی عادت ہے)

رام لال۔ اس سے ہکلانے سے کام نہ چلے گا۔ پھر چیخ کی آواز سنکر صرف دھوتی پہنے تو ند نکالے۔ غصے میں بھرے ہوئے چلے آتے ہیں۔

کیا ہوا جہنم جلی آدھی رات کو کان کھا گئی (رہ تو جا دمارنے کو دوڑتے ہیں)

موتی۔ بابو جی سن لو تو مارو۔ بہو جی کا کہیں پتہ نہیں ہے۔

رادھا چونکتی ہے۔ دیکھتی ہے بستر خالی ہے۔ غصے میں اُٹھ کر آتی ہے۔ موتی کے پاس بابو جی کو دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتی ہے

یو۔ یو۔ بوڑھ بوڑھ تی میں بہ بہ بھین۔ لج لجا کرو۔

رام لال۔ آئیں وہاں سے لجا لجاتی ہوئی۔ دیکھو تو رتن اپنے بچھونے پر نہیں ہے۔

اب تینوں نے مل کر ڈھونڈھنا شروع کیا۔ کمرے۔ باغ۔ غسل خانہ برآمدہ۔ پلنگ کے نیچے سب جگہ ڈھونڈھ ڈالا۔ موتی تو ملتی بڑے صندوق اور الماریاں بھی ڈھونڈھی گئیں۔

موتی۔ (رو رو کر) ہائے ہو۔ ہوئی۔ ہائے مو کا ناگ کس ناڈس لین ہائے مور بہوئی۔ تلاش کرتے کرتے ایک جگہ ساری کا ایک ٹکڑا اور ایک بجھا بتی ملی۔ رام لال نے فوراً ٹیلیفون پر داروغہ جی کو خبر دی۔

سب انسپکٹر صاحب۔ اگر۔ دیکھئے میری تلاشی اور تفتیش میں اگر کسی نے ذرا سی چوں کی تو میں ابھی چالان یا حوالات میں بند کر دونگا۔ یہ کہکر انہوں نے بھی تمام چھان مارا۔ پاؤں کے نشانات کا فوٹو لیا۔ بجھا بتی اور ساری کا ٹکڑا لیا اور موتی سے آنکھ مار کر کہنے لگے۔ مر وہ جائے سورگ میں یا نرک میں ہم کو تو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ اچھا نہیں بتاتی تو ساتھ چل دو ایکدن

(پھر آنکھ ماری) حوالات کی ہوا کھا۔ طبیعت ہو جائے گی
موتی کو بھی لے کر چلے گئے۔

رام لال منہ کھولے دیکھتے رہے۔ رادھا ہکلا کر کچھ کہنے والی تھی
پر موموموموکے سوا کوئی شبد نہیں نکلا۔

شیو بودھ۔ سروپ اور سلامت بیٹھے ہیں۔

شیو بودھ کو اپنی بھی خبر نہیں۔ اپنی خیالی محبوبہ کی تصویر بنا رہا ہے
آدھا جسم مکمل ہو چکا ہے۔

سلامت۔ اب بہت رات گئی۔ کل تم کو جانا بھی ہے۔ آؤ اب سو رہیں
شیو تو۔ تصویر بنالیں گے تب ہی سوئیں گے۔

سروپ۔ پتے الگ رکھ کر۔ یہ بازی تمہاری ہوگئی۔ (شیو بودھ سے)
ابے مہاشے ایک بج گیا ایک۔

شیو بودھ۔ (چونک کر دیکھتا ہے رنگ کا قلم تصویر کی چھاتی پر چل جاتا ہے
۔۔۔ بگڑ جاتا ہے) دیکھو ایسی دل لگی اچھی نہیں۔ دو گھنٹے کی
محنت خاک میں مل گئی۔

سلامت۔ جانے بھی دو شیو۔ صبح کو ٹھیک کر لینا (تصویر دیکھ کر)
یہ تو کامنی کی تصویر ہے۔

شیو۔ کون کامنی۔

سلامت۔ وہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ ہم دونوں نے
ایک ساتھ بی اے پاس کیا تھا۔

شیو۔ سچ کہو سلامت! میں تو سمجھتا تھا کہ ایسی سندری۔ جیتے جی نہیں
مل سکتی۔ وہ کہاں ہے۔ کیا کرتی ہے۔ کہاں رہتی ہے؟

سلامت۔ رکو تو۔ اس کی منگنی بالے پن میں ہوگئی تھی اب بیاہتا ہے
نہ جانے کہاں ہے اور اب منش سے اس کو نفرت سی ۔۔۔

شیو۔ (پریشان ہو کر) تم مجھے چھیڑ رہے ہو۔ میں تو مر جاؤں گا۔
ٹیلیفون کی گھنٹی ہوتی ہے۔

سلامت۔ ہلو۔ کون۔ کامنی۔ کہاں سے۔ اچھا۔ انند کٹی سے۔ انند جی
کیسے ہیں ۔۔۔ ہائیں کیا کہا مر گئے۔ کب۔ زور سے کہو ۔۔۔
ایک ہفتہ ہوا۔

کامنی۔ (اپنے کمرے میں) ہاں ایک ہفتہ ہوا۔ آپ اسی سمے میرے
میرے پاس آئیے۔ گھبرائیے نہیں۔ میں آپ کو اپنا بھائی سمجھتی
ہوں ایک بڑا کٹھن کام ہے ۔۔۔ کٹھن ۔۔۔ کٹھن کام ہے۔

سلامت فوراً جانے کے لئے اٹھتا ہے۔

شیو بودھ۔ میں بھی چلوں۔

سلامت۔ آج نہیں (مسکرا کر) یہ جوش۔ ایسی گرمی۔

اتنے میں پھر گھنٹی ہوتی ہے۔

سروپ۔ ہلو۔ کون؟ بابوجی۔ کہئے۔ کیا ہوا۔ ڈاکہ پڑا!؟ ۔۔۔

رام لال۔ (اپنے کمرے سے) توند پر ہاتھ پھیر کر ڈکار لیتے ہیں۔ فون کا
دستہ ہاتھ میں ہے۔

سروپ۔ میں نہیں سمجھا معاف کیجئے۔

رام لال۔ ڈاکو میری پتری کو اٹھا لے گئے۔ داروغہ جی آئے تھے
موتی کو پکڑ لے گئے۔

سروپ۔ میں ابھی آتا ہوں ۔۔۔

کھلاون۔ تم نے (مسکرا کر) میری محبت کا کرشمہ دیکھا۔ پیاری رتن
میں تم پر دل و جان سے فدا ہوں۔ مرتا ہوں۔

رتن چپ رہتی ہے۔

کھلاون۔ بولو۔ میرے دل کی گرہ کھولو۔ ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

رتن۔ (ہاتھ جھٹک کر) مجھے دربل جان کر بہت نہ بڑھئے بابو کھلاون
میں دکھی ہوں۔ بے بس ہوں۔ مگر ایشور سب کچھ دیکھتا ہے
اسی کے چرنوں میں شرن لونگی۔

کھلاون۔ پیاری بہت تڑپا چکیں۔ اب آؤ کلیجے سے لگ جاؤ۔ چھاتی
ٹھنڈی ہو۔ مہینوں سے گھٹ رہا ہوں۔ تن من کی سدھ
نہیں رتن۔

رتن۔ ہے پران ناتھ۔ کہاں ہو پربھو سروپ۔

کھلاون۔ (قہقہہ لگا کر) سروپ مروپ یہاں کوئی نہیں یہاں تو
(مونچھوں کو تاؤ دے کر) میں موجود ہوں۔ یہ ڈیل دیکھو
یہ بلّے دیکھو یہ سینہ دیکھو (تن کر) سچ کہنا میں حسین نہیں ہوں
پیاری رتن وشواس کرو۔ استریاں مجھے دیکھتے ہی گھائل
ہو جاتی ہیں۔ اور جو ایک بار ۔۔۔

رتن ۔ اپنے گھونے شبد کسی اور کو سنانا ۔ ہے پربھو ۔

کھلاون ۔ (اکڑکر) پربھو مربھو آج کوئی تجھے میرے پنجے سے نہیں بچا سکتا۔ (آگے بڑھتا ہے)

رتن ۔ تو بڑا ڈرپوک ہے ۔

کھلاون ۔ (بگڑکر) سر چڑھی ڈومنی گاوے تال بے تال ۔

رتن ۔ تو نام کا مرد ہے ۔ میری چھاتی میں دربل استری کا ہردے ہے ۔ چوری چھپے کسی کی بہو بیٹی کو لانا اور رہے کسی میں آنکھ دکھانا منش کا کام نہیں ۔

کھلاون ۔ لے اب سنبھل جا ۔

رتن ۔ (گڑگڑا کر) دیکھو تم اپنا دھرم تنے سستے داموں میں نہ بیچو میری ست کا نشٹ کروگے تو اس لوک میں بھی اور اُس لوک میں بھی پچھتاؤگے ۔

کھلاون ۔ (ہنسکر) بڑی آئیں کہیں کی ہنڈ تائن ۔
آج تو چین سے گزرتی ہے ؛ عاقبت کی خبر خدا جانے

رتن ۔ میرے کوئی بھائی نہیں کھلاون ۔ میں آج سے تم کو بھائی بناتی ہوں ۔

کھلاون ۔ بھائی کو جھونک دو چولھے بھاڑ میں آج تو میرا پہلو گرم کر

رتن ۔ (رو کر) ہے پرمیشر ۔ ہے پران ناتھ ۔

کھلاون ۔ میں راون کا بھائی ہوں اور اس سے پانچ جوتے بڑھکر میں آج تجھے اس سنسار کا سب سے میٹھا رس پلاؤں گا ۔
اور پریم ومان پر اڑا لیجاؤں گا ۔

رتن ۔ تو راون کا بھائی ہے تو میں بھی سیتا کی داسی ہوں ۔

کھلاون ۔ رہ تو جا سیتا کی دہی ۔ دیکھوں تو (قہقہہ لگاکر) اس سمے تجھ کو میرے ہاتھ سے کون بچاتا ہے ۔

رتن ۔ بہت نہ اکڑ ٹھوکر کھائے گا ۔

کھلاون ۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گریں گے جو گھٹنوں کے بل چلے

یہ کہہ کر جھپٹتا ہے رتن بھاگتی ہے ۔ جو چیز ملتی ہے اٹھا اٹھا کر پھینکتی ہے ۔ مگر ایک کونے میں پکڑی جاتی ہے ۔ ناخون سے چہرہ نوچتی ہے ۔ طمانچے مارتی ہے پر کھلاون بھی ایک ہی شور ہے دونوں ہاتھ پاؤں قابو کرکے بوسہ لینا چاہتا ہے ۔ منہ قریب تک پہونچتا ہے کہ یکایک کھڑکی سے کود کر اس کی دھرم پتنی آجاتی ہے ۔ اور پیچھے سے چوٹی پکڑکر کھینچ لیتی ہے ۔

(رتن سے) بہن جب تک میرے اس سریر میں آتما بسی ہوئی ہے تم پر کوئی آنچ نہیں آسکتی ۔

کھلاون ۔ دشٹ ملیچھ مجھے مرگھٹ پر پہونچالے تب ایسے نیچ کام ——

کھلاون ۔ میں ۔ میں تو اپنی جان بچا رہا تھا ۔ یہ آپ بھیگی بلی بن گئی ہے دیکھو تمام کھر لوٹ لیا ہے ۔

رتن ۔ میں جیتے جی تمہاری داسی رہونگی تم نے یہ نیا جیون مجھے بھیک دیا ہے ۔ ست نہ رہے ۔ تو جینے پر دھکار ہے ۔

دیوی ۔ تم میری بہن سمان ہو دیوی ۔ یہ راکشس ہے تم سیتا ہو ۔ اور میں تمہاری داسی ہوں ۔

کھلاون ۔ اور میں تم دونوں کا غلام ہوں ۔ بھائی ہوں (منہ پر طمانچہ مار کر) بھائی ان کا غلام تمہارا (پھر کان پکڑکر کہتا ہے) غلام ان کا بھائی تمہارا (سب ہنس پڑتے ہیں) رتن دیوی مجھے چھما کر دو ۔

رتن چپ رہتی ہے ۔

دیوی ۔ بہن ۔ ملیچھ سہی ۔ راکشس سہی ۔ پر وہ میرا پتی دیو ہے میرے کہنے سے تم اس کو چھما دیدو ۔ میں تم سے پریم کی بھکشا مانگتی ہوں رتن ۔

رتن ۔ میں تمہاری بات کاٹ نہیں سکتی بہن ۔ میں ان کو چھما کرتی ہوں ۔

رادھا دیوی ۔ تو مجھے بھی اگیان دو کہ میں انکو ان کے ماتا پتا کے یہاں پہونچا دوں ۔

کھلاون ۔ تم جانتی ہو دیوی ۔ میں اپنی بات کا دھنی ہوں تم کو بچن دیتا ہوں کہ فرصت پاتے ہی ان کو پہنچوا دونگا ۔ تب تک تم ان کو پریم سے رکھو میں نے بہن بنایا ہے ۔ تو بھائی کے یہاں سے ایسے کیسے وداع ہوجائے گی ۔ بہن رتن تم دو چار روز

بہن اس کو ابھی ابھی جلا کر خاک کر دو - کامنی نے کانپتے ہاتھوں سے
جلا دیا -
کھلاون - آج تو بازی تمہارے ہاتھ رہی سلامت اگر یاد رکھنا میں
بھی کھلاون نہیں اگر تم سے اس کا بھرپور بدلہ نہ لے لوں -
سلامت - (مسکرا کر) دیکھا جائے گا -
——— کھلاون ہارے کھلاڑی کی طرح وہاں سے نکل گیا -
کامنی - میں یہاں اکیلے نہیں رہ سکتی بھائی صاحب -
سلامت - تو چلو میں اپنی ماتا جی کے پاس پہونچا دوں -
کامنی - کہیں لے چلئے بھائی ——— (مرضی پاکر ایک خط چچا بسا ون کو
لکھتی ہے)
"میں اپنے بھائی کے ساتھ جاتی ہوں - کسی سے آکر سب باتیں
بتاؤنگی" آپ کی داسی کامنی
[دونوں جاتے ہیں]

رام لال کا مکان -
انسپکٹر - دروازہ کھولو -
رام لال - (اندر سے تو ندپر ہاتھ پھیر کر) کون ہے -
انسپکٹر - میں ہوں -
سدا ما - تو تو تو تم ک ک ک کون ہو -
انسپکٹر - میں ہوں -
سدا ما - ل ل ل لا لاٹ ص ص ص صاحب کے نچے - نہ نہ نا نام
بتاؤ -
انسپکٹر - میں ہوں داروغہ جی -
رام لال صاحب گھبرا کر اُٹھے - دروازہ کھولا - دونوں
توندیلے تھے - ہاتھ ملانے بڑھے تو توندوں کی ٹکر لگی - دونوں
پیچھے ہٹ گئے -
رام لال نے بڑے آدر سے اندر لاکر بٹھایا - کہئے کچھ پتہ چلا -
انسپکٹر - ہاں بہت کچھ معلوم ہوگیا (کان میں زور سے) یہ بات کھل گئی
کہ رتن بائی کو کون لے گیا ہے -
سدا ما - کک ک ک کون لے لے گیا ہے -

رام لال - جلدی بتائیے -
انسپکٹر - مٹھی گرم کیجئے تو بتاؤں -
رام لال - بتائیے تو بھلا ہم آپ سے باہر جا سکتے ہیں (گدے کے نیچے
کئی نوٹ نکال کر دیتے ہیں)
انسپکٹر - (لے کر جیب میں رکھتے ہوئے) نہیں اس کی کیا ضرورت تھی
میں نے تو یونہی ہنسی سے کہدیا تھا - خیر آپ دیتے ہیں تو پرشاد
سمجھ کر لئے لیتا ہوں -
سدا ما - ہہ ہہ ہاں بہ بت بتائیے تو
رام لال - (بے چین ہو کر) کیا آپ پران ہی کے بھوکے ہیں داروغہ جی
داروغہ جی - بڑی چھان بین کے بعد پتہ لگا ہے - دوسرا کوئی ہوتا تو
ایک ہزار سے کم میں نہ بتاتا - مگر میں تو آپ کو اپنا پتزا رے پتا
سمجھتا ہوں -
سدا ما - پت پتا پتز رہ رہ رہنے دیجئے - بت بت بت بت بتائیے
جلدی -
رام لال - (تڑپ کر) دیکھئے داروغہ جی اب ٹال مٹول نہ کیجئے -
داروغہ جی - میں نے اپنا خون پانی ایک کر دیا ہے تب پتہ ———
(رک گئے)
سداما اور رام لال دونوں بیچین ہو کر قریب آگئے -
داروغہ جی - تو بنا پوچھے نہ مانئے گا -
رام لال - اب تو پران نکس جائے گا داروغہ جی -
داروغہ جی - (کھڑے ہو کر) تو بچن دیجئے کہ یہ بات گپت رہے گی -
نہیں تو میری دال روٹی کا سہارا جاتا رہے گا - اور آپ بھی
سنکٹ میں پڑ جائیں گے -
رام لال - دیتا ہوں ——— بچن ———
سدا ما - مے مے مے مے میں بھی دے دے دے دے دیتی ہوں ———
بچ بچہ بچن -
داروغہ جی - (اکڑ کر) میری پیٹھ ٹھونک دیجئے -
رام لال - (بڑی زور سے پیٹھ ٹھونکتے ہیں جلدی بتائیے -
داروغہ جی - باپ رے آپ نے تو مرمت ہی کر دی - رتن کو ڈاکو

لے گئے۔

رام لال۔ کون ڈاکو۔

داروغہ جی۔ بس اب اتنا ہی تو معلوم کرنا رہ گیا اور سب کچھ۔

سداما۔ رہ گئی کسر تھوڑے کی زین لگام اور گھوڑے کی

رام لال۔ (کھسیا کر) اسی رائی کا آپ پربت بنا رہے تھے۔

داروغہ جی۔ سچ ہے سنسار میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ مہینے دو مہینے میں یہ بھی پتہ چل جائے گا۔ کہ ڈاکو کا نام کیا ہے۔

رام لال۔ اچھا اب تم چپکے زبر چل اور دو پیش دو۔ نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔

داروغہ جی اکڑتے ہوئے جاتے ہیں۔

سداما۔ او او اور موموموموتی کہاں ہے۔

داروغہ جی۔ (رک کر) بڑے آنند سے ہے۔ سب کشل منگل ہے۔ سپاہی سیاں بیٹے کو تو اب ڈر کا ہے کا۔

رام لال۔ (بگڑ کر) کشل منگل کے بچے۔ جاتا ہے کہ نہیں۔

[داروغہ جی جاتے ہیں]

رادھا دیوی اور رتن بیٹھی ہوتی ہیں۔ کملا دن کے جنگل والے اڈے میں ایک دو محلا مکان ہے۔ کھڑکی سے باہر کا سماں دیکھ رہی ہیں۔ دن ڈوبنے کو ہے شفق پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی ہیں۔ بادل گھر رہے ہیں۔

رتن گاتی ہے۔ گھر آئیں بدری ——

ناہیں آئے دھن شیام گھر آئیں بدری —— گھر آئیں بدری
آئی ساون کی بہار اٹھے موریلا پکار —— گھر آئیں بدری۔ گھر آئیں بدری
پڑے بوندن پھوہار —— گھر آئیں بدری۔ گھر آئیں بدری
کہو سکھیا جائے لائے پیا کو منائے —— گھر آئیں بدری
جیا لگ مٹائے —— گھر آئیں بدری

رادھا دیوی۔ ایسی سندرتا اور ایسے گن اجب میں استری ہو کر موہت ہو گئی تو پرش پرش کٹھور کیوں نہ رجھیں۔

رتن۔ (لجا کر) مجھے نہ چھیڑو نہیں تو رو دونگی۔

رادھا دیوی۔ (گدگدا کر) روؤ تو جانوں۔

دونوں ہنسنے لگتی ہیں۔

رتن۔ دیکھو بہن دیوی آج تین دن ہوگئے۔ نہ میں جا سکی نہ پتا جی آسکے نہ انکی کچھ سدھ بدھ ملی۔

رادھا دیوی۔ اُن کی کس کی؟

رتن۔ (جھیپ کر) سروپ کی۔ امتحان سر پر ہے۔ ان کو سب باتیں معلوم نہ ہوئیں تو ٹھیک نہ ہوگا۔

رادھا دیوی۔ اور ہردے میں بھی تو کسک ہوتی ہوگی۔

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

رتن۔ آپ کو تو ہر سمے ہری ہی ہری سوجھتی ہے۔

رادھا دیوی۔ میں نے بہنوئی صاحب کو کبھی نہیں دیکھا بھلا آپ کیوں دکھانے لگیں۔

رتن۔ کیوں نہ دکھاؤنگی۔

رادھا دیوی۔ ابھی تو میرا چھوٹا سا نولیا رے۔ ابھی تو میرا چھوٹا سانولیا رے

(ناچتی ہے)

سیاں تم باگ نہ جانا۔ ملنیا تم کو موہ لیگی رے۔ ابھی تو میرا چھوٹا سانولیا رے

پیا تم سوتن نہ جانا۔ سوتیا تم کو موہ لیگی رے۔ ابھی ؍ ؍ ؍

راجہ تم ہاٹ نہ جانا۔ پتریا تم کو موہ لیگی رے۔ ابھی ؍ ؍ ؍

رتن۔ واہ بہن۔ تم بڑی گنوان ہو میں مر جاؤں تو بھی ایسا ناچ نہیں سکتی

رادھا دیوی۔ رتن پیاری! میں پرش ہوتا۔ ہوتی۔ تو تمہیں تگنی کا ناچ نچا دیتی۔ اچھا دیکھو میں پرش بنتا ہوں اور تم سے پریم کرتا ہوں۔ ارے بنتی ہوں اور پریم کرتی ہوں۔ رادھا دیوی مرد بن کر اینک پرکار سے چھیڑتی ہے اور پریشان کرتی ہے رتن بہت تنگ آتی ہے تو بھاگتی ہے تالاب میں پھسلتی ہے تالاب میں پانی بھرا ہوا ہے۔ دونوں بھاگتی تھامتی اسی میں گر جاتی ہیں۔ اور تر ابور ہو کر نکلتی ہیں۔

سروپ راستے میں چلا جا رہا ہے کہ ایک لنگڑی بڑھیا لکڑی ٹیکتی پاس سے گذری۔

سروپ۔ ماتا ایسی بھیانک رین میں اب یہاں کہاں۔ چلئے میں

آپ کو آپ کے گھر پہونچا دوں۔
بوڑھیا۔ بیٹا تم بڑے دیالو ہو۔
سروپ۔ نہیں ماتا یہ تو بھارت ورش کے ہر بیٹر کا کرم ہونا چاہئے
بوڑھیا۔ بڑے دین دیال ہو بیٹا۔ تم کشٹ نہ اٹھاؤ میری جھونپڑی
پاس ہی ہے چلی جاؤنگی۔ (نظر بھر کر دیکھتی ہے)
سروپ۔ (کھلاون کو کچھ پہچان کر) تو کیا ہوا ماتا میں بھی چلتا ہوں۔
بڑھیا۔ چلتے ہو تو چلو بیٹا۔ پر میری گلی بہت تنگ ہے۔ کہیں ٹھوکر نہ
لگے۔ میں ابھی گھر سے پھر نکلوں گی۔
سروپ۔ نہیں تو— میں بھی بچہ نہیں ہوں۔
راستے میں اکّا دکّا آدمی ملتے تھے نہیں تو سروپ وہیں نپٹ
لیتا۔ بوڑھیا ایک مکان میں پہونچ کر کھٹ کھٹ اوپر چلی گئی
سروپ وداع ہو کر چلدیئے مگر تھوڑی ہی دور جا کر ایک
کھمبے کی آڑ میں چھپ رہے — دو ہی منٹ کے بعد ایک
عورت نکلی مگر دبلی پتلی تھی اور لنگڑی بھی نہ تھی۔ سروپ نے
پیچھا کیا۔ وہ عورت چوکنی ہو کر بار بار ادھر ادھر دیکھتی تھی
اب بالکل سناٹا تھا۔ اسنے گلی سے نکل کر سڑک پر ایک ٹیکسی
ٹھہرائی۔ اور کچھ کہکر بیٹھ گئی۔ موٹر اسٹارٹ ہو رہی تھی۔
کہ سروپ نے بھی دوسری ٹیکسی کی اور اس سے کہدیا کہ اگلی
ٹیکسی کے پیچھے ہی پیچھے رہے مگر ایسا نہ ہو کہ اگلی ٹیکسی والے کو
معلوم ہو سکے۔
ٹیکسی پل کے پار پہنچ کر ایک سنسان جگہ میں رُکی پہلے وہ عورت
اُتری پھر سروپ۔
استری۔ (ایک املی کے پیڑ کے نیچے ٹھہر کر) کون ہو تم؟
سروپ۔ آدمی ہوں۔ کیوں؟
استری۔ تم یہاں کیوں آئے۔ نہیں جانتے۔ جتنی ودھوائیں گھر سے
نکل جاتی ہیں وہ یہیں کہیں آ کر بستی ہیں۔ تم کس کے گھر
جاؤگے۔
سروپ۔ میرا مکان اسی طرف ہے۔ میں اپنے گھر جاتا ہوں۔
استری۔ تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے۔ تم میرے پیچھے یہاں تک
کیوں آئے؟
سروپ۔ (جھک جھک ہو کر) یونہی۔
استری۔ لڑائی وڑائی نہ کرو۔ سچ سچ کہو میں سندری ہوں یا نہیں؟
سروپ۔ تم سندری ہو۔ اپروپ سندری ہو پر مجھے کیا۔
استری۔ (ناز سے) تم مجھ سے پریم نہ کروگے!
سروپ۔ میں کسی اور سے پریم کرتا ہوں۔
استری۔ پر کسی اور کے پیچھے پیچھے چلتے ہو۔ (مسکرا کر)
تو تم جس کے پریمی ہو وہ مجھ سے ادھک سندری ہے۔
سروپ۔ نہیں تم سے ادھک سندری تو سنسار میں شاید ہی کوئی ہو
استری۔ تمہیں لجا نہیں آتی۔ میں آپ پریم کے لئے کہتی ہوں اور تم
سروپ۔ میرے پاس ایسی باتوں کا کوئی جواب نہیں۔
استری۔ میں سمجھ گئی پر یہ تو بتائیے مہاشے میرے پیچھے آپ دو گھنٹے سے
کیوں پڑے ہیں۔
سروپ۔ (جھیپ کر) چھما کیجئے دیوی —— ایک طرف چلتا ہے
استری زور سے ہنسکر تالی بجاتی ہے۔ تالی بجتے ہی تین سنڈے
منڈے لاٹھیاں لئے آجاتے ہیں۔ مگر سروپ سروپ ہی ہے
پینترا بدل کر پہلا وار خالی دیتا ہے اور گردنی لگا کر لٹھ چھین
لیتا ہے۔ پھر تو کھٹا کھٹ ہونے لگتی ہے۔ آخر تینوں کو مار بھگاتا
ہے۔ جب میدان خالی ہوتا ہے تو دیکھتا ہے۔ سندری استری
کھڑی مسکرا رہی ہے۔
سروپ۔ (اچنبھے سے) ارے تم بھاگی نہیں یہاں سے؟
استری۔ تم سے گبرو جوان کو ایسی بپت میں چھوڑ کر میں کیسے جاتی
میں نقلی پرپنی نہیں سجن۔ ایسی کٹھور نہیں بیر۔
سروپ۔ تم ایک پہیلی ہو سندری۔ چاہتی کیا ہو؟
استری۔ کہہ تو چکی کھول کر۔ تمہارے منموہک روپ پر مرتی
ہوں۔
سروپ۔ مگر میں تم سے پریم نہیں کر سکتا۔ پریم لڑکوں کا کھیل
نہیں۔
استری۔ اچھا میں کھلاون کو گرفتار کرادوں اور رتن کو تم سے

ملادوں تب پریم کروگے۔

سروپ۔ ہاں تب تو تجھ سے پریم کروں گا۔

استری۔ ٹھیک بچن دیتے ہو۔

سروپ۔ ہاں ہاں ٹھیک بچن ہے۔

استری۔ اچھا میری کلائی پکڑ کر بچن دو۔

اب تو سروپ بغلیں جھانکنے لگے۔ کانپتے ہاتھوں سے نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہاتھ پکڑا۔ بجلی کی لہر رگوں میں دوڑ گئی۔ میں بچن دیتا ہوں۔ اچھا بتاؤ رتن کہاں ہے۔ کھلاون کہاں ہے

استری۔ اب تو تم بچن دے چکے۔ میں کیا جانوں۔

سروپ۔ (بگڑ کر) تو پھر میرا بھی بچن وچن کچھ نہیں۔

استری۔ اتنے ہی میں ڈھیلے ہوگئے۔ واہ ری مردانگی ——— میں تمہارے پریم میں شرابور نہ ہوتی تو اس بیچھا کرنے اور ہاتھ تھامنے کا مزا چکھا دیتی۔ کیا کروں۔ اپنے ہردے سے مجبور رہوں۔ بڑے بنتے ہو وہ۔ جس بوڑھیا کو تم ماتا بنا کر پہونچانے لے گئے تھے۔ وہی تو کھلاون تھا۔ جب وہ اوپر پہونچا۔ ہم دونوں نے بچار کر یہ ترکیب نکالی۔ اب وہ اپنے اڈے پہونچ گیا ہوگا۔ رتن بھی وہیں ہے۔ کھلاون کی دھرم پتنی دیوی نے رتن کی ست بچالی۔ اور اپنی منہ بولی بہن بنالیا نہیں تو (ہنسکر) آج تم صرف میرے ہی پریمی ہوتے۔ رتن کی موتی سی آبرو مٹی میں مل گئی ہوتی۔

سلامت شاہ صاحب کا روپ بدل کر چلے۔ بڑی بڑی زلفیں۔ ہاتھ میں لوہے کا چمٹا۔ گلے میں مالا۔ گیروا النبا کرتہ۔ آنکھوں میں سرمہ۔ اکڑتے ہوئے جاتے تھے۔

ایک ہوٹل کے پاس پہونچے تو دیکھا جوکھو پھکن اور سدآہٹ بھی موجود ہیں اندر جا کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ ٹھرے والے مست تھے۔ کوئی ناچ رہا تھا۔

جوکھو۔ اماں یار سدآہٹ سنتے ہو۔ اس دن تو کھلاون بالونے بڑی جیاستی کی۔

سداہٹ۔ تم لوگ بھی پکے نامرد ہو۔ کھلاون نے مجھے ٹھوکر ماری اور تم دیکھتے رہ گئے۔ (اور چڑھا کر) یہ دیکھو رتن بائی اس بوتل میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ وہ مجھ سے پریم کرتی ہے۔ ناچ رہی ہے۔ اگر کھلاون کو خاک میں نہ ملادوں اور ——— اور ——— رتن سے اپنا پہلو گرم نہ کروں تو میرا نام بھی سداہٹ نہیں چمار رہے۔

پھیکو۔ نہ روک ہاتھ ساقیا پلائے جا پلائے جا
پلائے جا پلائے جا
دو آتشہ کھچی ہوئی لنڈھائے جا لنڈھائے جا
ترے نثار اور دے پلائے جا پلائے جا
نہ ہو خمار اور دے لنڈھائے جا لنڈھائے جا

بہت سی آوازیں۔ پلائے جا پلائے جا پلائے جا پلائے جا

اور آوازیں۔ لنڈھائے جا لنڈھائے جا لنڈھائے جا لنڈھائے جا

بہت سے لوگ ناچنے لگتے ہیں

ہلڑ ہو جاتا ہے

دوکاندار۔ دیکھو شور مچاؤ گے تو ہم پولیس کو بلالیں گے۔

شرابی۔ سیاں ہم تو تمہاری کتیاں ہیں ———

دِن وِن وِن وِن وِن وِن وِن وِن

دوسرے۔ راجہ ہم تو تمہارے کتے ہیں ———

وُون وُون وُون وُون وُون وُون وُون وُون

شرابی۔ سیّاں ہم تو تمہاری گدھی ہیں۔

چیں چیں چیں چیں چیں چیں چیں چیں

دوسرے۔ راجہ ہم بھی تمہارے گدھے ہیں۔

پوں پوں پوں پوں پوں پوں پوں پوں

شرابی۔ سیاں ہم تمہاری بکری ہیں ———

اُم میں اُم میں اُم میں اُم میں

دوسرے۔ راجہ ہم بھی تمہارے بکرے ہیں ———

اون اون اون اون اون اون اون اون

سداہٹ۔ (شاہ صاحب کی طرف اشارہ کرکے) امیں یہ تو یار بڑے

سیلانی ہیں یا نرے گاؤدی۔

(سلامت سے) آؤ بھائی تم بھی تو ——— اندھیاؤ ———

ایک بازاری عورت۔ ادھ کھلی۔ بال بکھرے ہوئے۔ شاہ صاحب کے پہلو سے لگ کر

سیاں بہت دن بعد درس دکھلایو

درس دکھلایو جیا ترڑ پایو

توری برہ میں ترڑ پوں دن رین

آؤ گلے لگ جاؤ درس دکھلایو

پھر تمام ہلڑ ہوتا ہے۔ شاہ صاحب زور سے ڈھکیل دیتے ہیں۔ عورت ایک طرف گرتی ہے۔ بڑبڑاتی ہے۔

پیا پیارے نہ اب ترڑ پاؤ

آؤ گلے لگ جاؤ درس دکھلایو

ایک مولوی صاحب لمبی داڑھی میں کنگھی کرتے ہیں۔ بازاری عورت کو آنکھ مارتے ہیں اور ہاتھ کی آڑ کرکے ایک بوتل اڑا دیتے ہیں ڈکار آتی ہے تو کہتے ہیں۔ لعنت نعوذ۔

شاہ صاحب۔ (سداہٹ سے) بھائی جب سے فقیر ہوا توبہ کر لی ہاں ایک لت البتہ ابھی باقی ہے۔

کہیں آڑ میں چلو تو بتاؤں

تینوں بدمعاش کچھ بھانپ کر ہنستے ہوئے اٹھے اور پاس آئے

شاہ صاحب۔ سولی کی عادت نہیں جاتی۔ جب تک پھڑ پر دو چار داؤں نہ لگیں نیند نہیں آتی۔ (جیب میں روپے کھنکا کر) کہیں چلو تو چلیں۔

چاروں آدمی ساتھ ساتھ گئے اس املی کے نیچے پہونچ کر پھڑ بچھ گیا۔ شاہ صاحب دوسو کا داؤں ہارے تو بگڑ کر پانچ سو کے نوٹ اور نکال لئے بس پھر کیا تھا۔ تینوں کے منہ میں پانی بھر آیا املی کے نیچے سے سرنگ کا رستہ ایک پتھر سے ڈھکا ہوا تھا۔ سیڑھیوں پر چٹان اور چٹان پر گھاس تھی۔ دونوں نے دو طرف سے ہاتھ تھاما اور سداہٹ کے منہ میں رومال دے کر ہاتھ پاؤں جکڑ لیا۔

تینوں بدمعاش سرنگ سے لے چلے جب جنگل کے دہانے پر وہانے پر پہونچے تو نوٹ نکال لئے اب پانچ سو باقی تھے۔

سداہٹ۔ چار سو مجھے دیدو۔ پچاس پچاس تم لوگ لے لو۔ اور اسے بابو کے پاس لیجاؤ۔

جوکھو۔ بڑے آئے کہیں کے گنڈے۔ تین سو مجھے ادھر وہنے ہاتھ سے دیدو نہیں تو وہ دونگا۔ کہ کھوپری بجتا جائے گی۔

پھکن۔ ہاں اور دو سو جو پہلے جیتے ہو اس میں سے سو ملا کر تین سو ادھر بھی حوالے کرو نہیں تو ہم دونوں تمہیں چٹنی کر دیں گے کیوں بھائی جوکھو۔

جوکھو۔ ہاں بھائی پھکن۔

تینوں میں لٹھ چلنے لگا۔ ساتوں سو روپیہ زمین پر رکھ دیا گیا۔ سلامت نے موقعہ پاکر دانت سے ہاتھ کھول لیا۔ اور روپے لے کر نو دو گیارہ۔

ادھر جب تینوں نے لہو لہان ہو کر مڑ کر دیکھا تو نشکا رجمع ہمت غائب تھا۔ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے سرنگ سے نکلے۔

ادھر سلامت سرنگ سے نکلا ہی تھا کہ پاس ہی آواز سن کر جھٹ درخت پر چڑھ گیا اور گھنے پتوں میں بیٹھ گیا۔

باہر آکر جوکھو اور پھکن ایک طرف تلاش میں چلے۔ سداہٹ دوسری طرف گیا۔ اور سلامت مسکراتا ہوا درخت سے اتر کر تیسری طرف چل دیا۔

شیو بودھا اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ طرح طرح کی تصویریں ٹنگی ہوئی ہیں۔ بہت سے ماڈل رکھے ہوئے ہیں۔ شیو بودھ کامنی والی تصویر بنانے میں محو ہے۔

کامنی آتی ہے ٹھٹک کر واپس جانا چاہتی ہے۔ بھائی سلامت یہاں نہیں ہیں۔

شیو بودھ۔ (چونک کر) کامنی۔

کامنی۔ (لجا کر) شیو۔

شیو۔ (اٹھ کر پاس آتا ہے۔ انگلیوں سے اشارہ کرتا جاتا ہے) وہی

آنکھیں - وہی ہونٹ - وہی رنگ - وہی مسکراہٹ -
کامنی ــــــ کامنی -

کامنی - وہی جوش - وہی شرافت - وہی سنجیدگی - وہی سندرتا -
شیو ـــــ شیو -

شیلو - بی اے کے بعد سے آپ ایسی کھوئیں کہ آج ملیں - یہی وفا تھی کامنی

کامنی - شیو! میں اسوقت پرائی تھی -

شیلو - کیسے؟

کامنی - گونا نہیں ہوا تھا پر بواہ ہو چکا تھا -

شیلو - اور اب؟ کامنی - اب تو میں اپنی آپ مالک ہوں - گونے
سے پہلے ہی بدھوا ہو گئی - دونوں تصویریں دیکھتے ہیں اور
چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے ہیں -

شیلو - یہ دیکھو تمہارا ہی چتر بن رہا تھا - ہزاروں تصویریں کھینچیں مگر
تسلی نہ ہوئی - جو چاہتا تھا وہ بات پیدا ہی نہیں ہو سکی -
جان کیسے ڈالتا کامنی -

کامنی - ہم دونوں کو کوئی دیکھ لے تو پہچان نہ سکے (تصویر کی طرف
اشارہ کر کے)

شیلو - میری آنکھوں سے دیکھے تو فوراً جان لے -

کامنی - تو کیا میں ایسی ابھاگنی ہوں کہ میری تصویر نہیں کھچ سکتی -

شیلو - کھچ کیوں نہیں سکتی کامنی! پر ـــــ ایک بات کہوں برا تو نہ مانوگی -

کامنی - (ہنس کر) آپ کی بات اور میں برا مانوں شیو!

شیلو - میں اب بھی اتنا ہی پریم کرتا ہوں - میں نے کبھی اور کسی دوسرے سے
پریت نہیں کی -

کامنی - نہ میں نے -

شیلو - کیا کہا کامنی - پھر تو کہدو (قریب آگیا)

کامنی - صاف سننا چاہتے ہو شیو - میں نے تمہیں سے پریم کیا اور اب
بھی کر ـــــــ

شیو نے چاہا کہ گلے لگالے مگر کامنی دو قدم پیچھے ہٹ گئی -

ٹھہرو شیو اب میں تمہارے لایق نہیں رہی -

شیلو - (درد سے) وہ کیسے کامنی -

کامنی اور کچھ سندیہ نہ کرنا شیو - پرماتما جانتا ہے کہ میں بال بدھوا
ہوں - پر سماج کی آنکھ میں ـــــــــ

شیلو - (مسکراکر) بھول ہو کامنی ـــ دھرم اور سماج ست کے
داسی ہیں - ست ہی ست ہے اور کچھ نہیں -

کامنی - کیا کہتے ہو شیو!

شیلو - کامنی - دیوی کامنی - میرا پریم اب تو اور ادھک ہو گیا سنتی ہو
اگر تمہیں مجھ سے کچھ پریم اب بھی ہے تو بچن دو کہ اسی ستپاہ میں
مجھ سے بواہ کر لوگی -

کامنی شرما کر سر جھکا لیتی ہے -

شیو بڑھ کر گلے سے لگا لیتا اور کہتا ہے - کہو! بولو!!

کامنی - (دھیرے سے) بھائی سلامت سے پوچھ لوں تو -

شیلو - سلامت سے (مسکراکر) میں نپٹ لوں گا - انکی چنتا تم نہ کرو -

کامنی - تو پھر ـــــ میں ـــــ تمہا ـــــ ری ـــــ ہوں

شیو ایک گہرا پیار لیتا ہے ـــ لو پران پیاری کامنی تم بھی
اپنے بچن پر سہی کر دو مہر لگا دو ـــــــــ

کامنی پریم انند میں کھو کر دیکھتی ہے ـــ کھٹ کھٹ ہوتی ہے
دونوں الگ ہو جاتے ہیں -

شیلو - آئیے!

ایک چھوکرا کسی کا کارڈ تشتری میں لاتا ہے -

شیلو - (نوکر سے) کہدو گھر میں نہیں ہیں ـــ (کامنی کو کارڈ دیکر)
اتنے لمبے چوڑے خطاب ہیں - روپیہ بھی بہت ہے مگر سدھی
نام کو نہیں -

کامنی - کیوں -

شیلو - دیکھو نہ سمے دیکھا نہ گھڑی اور آدھمکے -

کامنی - (لچک کر) اور میں؟

شیلو - تم تو پران ہو پیاری - بواہ دھرم کا ایک پردہ ہے سماج کی
آڑ ہے اور کچھ نہیں - جب ہم تم راضی ہو گئے تو بیڑا پار ہے
کامنی سچ کہتا آج سے میں تمہیں اپنا سمجھوں -

کامنی - او چھیکا رہے تم کو شیو!

شیلو - اچھا تو کر دکھاؤ۔

کامنی - وہ کیا؟

شیلو - تم جانتی ہو سارے سنسار میں تمہیں چھوڑ کر مجھے سب سے ادھک جو چیز پیاری ہے وہ یہی چتر کھینچنا ہے۔

کامنی - جانتی ہوں شیلو۔

شیلو - تو اپنی تصویر کے لئے موڈل بن جاؤ۔ مجھ پر پورا وشواس کرو کامنی اگر میرے ہردے میں نچتا ہو تو بھگوان مجھ سے سمجھ لیں۔ بس یہی کامنا ہے کامنی کہ ایک چتر ایسا بناؤں کہ تم بھی پرسن ہو جاؤ۔

کامنی - لو بیٹھی جاتی ہوں شیلو۔ یہ کیا بڑی بات ہے۔

شیلو - (مسکرا کر) ایسے نہیں کامنی۔ میری نگاہ اور تمہارے بیچ میں کوئی ہلکا سا پردہ بھی نہ رہے۔
دیکھو جیسے یہ ہے پیاری (ایک برہنہ مجسمہ کو دکھاتا ہے)

کامنی - (غصہ سے) یہ تو نہ ہوگا (مسکرا کر) انگلی دیتے پہونچا پکڑنے لگے۔

شیلو - (روٹھ کر) بات بھی کھوئی التجا کر کے ــــ تم مجھے نیچ سمجھتی ہو کامنی ــــ

کامنی - میں تم کو دیوتا سمجھتی ہوں شیلو! کڑھو نہیں میں ابھی آتی ہوں
قریب کے پردے میں جا کر سب کپڑے اُتارتی ہے اور ایک چادر دونوں ہاتھ سے گلے کے پاس تھامے ہوئے دروازہ میں کھڑی ہوتی ہے۔

کامنی - بس۔

شیلو - داہنا ہاتھ کھول دو۔ (تصویر پر جھکتا ہے)

کامنی - (سیدھا ہاتھ کھول کر) بس! (ناز بھی ہے شرارت بھی شرم بھی)

شیلو - بایاں پاؤں بھی۔

کامنی - (کھول کر) بس!

شیلو - داہنا پاؤں بھی۔

کامنی - (دھیرے دھیرے کھول کر) بس

شیلو - بایاں ہاتھ بھی۔

کامنی بے خیالی میں بایاں ہاتھ کھولتی ہے۔ کھولتے ہی چادر گرجاتی ہے۔ فوراً ہی چیخ کر بیٹھ جاتی ہے ــــــ
شیلو گھبرا کر دوڑتا ہے۔

سروپ اور سلامت لکڑہاروں کا بھیس بدلے ہوئے ہیں۔ گنوار لوگ بھی بھروپ میں ہیں۔ کوئی کچھ بنا ہے کوئی کچھ۔
سروپ اور سلامت سرنگ کے پاس پہونچے تو سدا آہٹ کو وہیں پایا۔

سلامت - سدا آہٹ خبردار ہو جاؤ آج تم میرے پنجے سے نہیں بچ سکتے۔

سدا آہٹ - پرنام ہے بابوجی (مسکرا کر) آپ جس کام سے جارہے ہیں میں بھی اسی کام سے جارہا ہوں۔

سروپ - کیا کام ہے؟

سدا آہٹ - یہی کہ رتن دیوی کو بپتا سے چھڑائیں۔ اور کھلاون کو نرگ کی ہوا کھلائیں۔

سلامت - دیکھو دھوکا نہ دینا۔

سدا آہٹ - میں نیچ نہیں ہوں بابوجی۔ مرہٹہ ہوں۔ تلوار کی چوٹ بھول سکتا ہوں پر زبان کی نہیں۔

سروپ - ہوا کیا۔

سدا آہٹ - شاہ صاحب جانتے ہیں۔

سلامت - یہ بھی رتن بہن کے عاشق ہیں۔ کھلاون نے ٹھوکر جمائی اور نکال دیا۔ کیوں سدا آہٹ۔

سدا آہٹ - میری کایا پلٹ ہوگئی ہے بابو۔ رات کو سپنے میں سورگ باشی ماتاجی نے آکر مجھے پاپ سے نکال کر پن کے مارگ پر کر دیا ہے۔ میں آج سے رتن دیوی کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔
سروپ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دو طرف سے دربان آتے دکھائی دیئے۔ تینوں نے پینترہ بدل کر خالی دیا۔ پھر تو چاروں طرف سے بانوں کی برشا ہونے لگی۔
سدا آہٹ نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا مگر سروپ نے روک لیا۔

بھائی کہاں جاتے ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ سیٹی بجائی —— کہار
اکٹھا ہو گئے — چاروں طرف لوگ چوکنے ہو گئے۔ تیر بند ہو گئے
ڈھیلے چلے۔ وہ بھی موقوف ہو گئے ———— اب یہ لوگ
سرنگ سے پار ہو کر — گھنے جنگل اور جھاڑیوں میں ہوتے
ہوئے اڈے کی طرف چلے۔

سروپ ۔ کتنی دور ہے سدا آہٹ۔

سدا آہٹ ۔ ابھی آدھا راستہ تک آئے ہیں۔ آگے رستہ اتنا کٹھن نہیں ہے

سلامت ۔ اڈے پر کتنے آدمی ہوں گے۔

سدا آہٹ ۔ چوبیس پچیس ہوں گے۔

سروپ ۔ اور ہمارے ساتھ پچاس ہوں گے (لوگوں سے) دیکھو
کمند اور جال سے کام لینا۔ سب کو زندہ پکڑنا۔ کوئی بھاگے
نہیں۔ اور گھائل بھی نہ ہو۔ مَنش سب برابر ہیں۔

ایک سپاہی ۔ اور وہ وار کریں تو!

سلامت ۔ بیر تا یہی ہے کہ ان کا وار روکو اور مرے ہوئے کو نہ مارو
تم دو ہو وہ ایک۔

سدا آہٹ ۔ یہ کام اتنا سرل نہیں بابوجی۔

سروپ ۔ بھگوان کی کرپا چاہئے —— ساری مشکل آسان ہو جاتی ہے
چلے جا رہے ہیں۔

رتن اور رادھا سو رہی ہیں۔ جوانی کی نیند — کھلاون دبے
پاؤں جاتا ہے۔ کلیجہ پکڑ لیتا ہے۔ پہلے رادھا کے دونوں ہاتھ باندھ
دیتا ہے۔ پھر رتن کی چارپائی پر بیٹھنا چاہتا ہے۔ رتن جاگتی ہے
اور تڑپ کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے۔

"رادھا دیوی۔ رادھا دیوی"۔

رادھا دیوی کی آنکھ کھلتی ہے اٹھنے کی کوشش کرتی ہے مگر اٹھ
نہیں سکتی۔ ہائے رام کلائیاں دکھ رہی ہیں۔ پتی دیو کہاں ہو؟

رتن ۔ بھائی کھلاون۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ ہٹئے تو میں اپنی بہن کو
کھول دوں۔

کھلاون ایک طرف ہو جاتا ہے۔ جب رتن بڑھتی ہے تو چاہتا ہے
کہ پکڑ لے مگر رتن بجلی کے سمان تڑپ کر کترا جاتی ہے۔

رتن ۔ کیسے ہو رہے ہیں بھائی۔ کیا آج بہت پی گئے ہیں آپ؟

کھلاون ۔ (قہقہہ لگا کر) ہاں پیاری۔ پران پیاری رتن۔ پریم سے
مستانہ ہو رہا ہوں۔

رتن ۔ بہن کو ایسا کہتے ہو بھائی۔

کھلاون ۔ ارے بس رہے بھولی بھالی بہت نخرے نہ دکھا چھوکری
آج تو سارے دیوی دیوتا آ جائیں تو بھی تجھے نہ چھوڑوں گا۔

غم کے جگر پہ بھالے پڑے ہیں ۔ جل جل کے اس دل میں چھالے پڑے ہیں
گردن میں پریم کے مالے پڑے ہیں

بھاؤ بتا بتا کر ناچتا ہے۔

رادھا ۔ کیسے ہو رہے ہو سوامی؟

کھلاون ۔ چپ رہ سوامی کی خالہ۔ تو نے ہی اس دن اس ترمال کو میرے
پنجے سے چھڑا لیا تھا۔

رتن ۔ ہائے رام کہاں جاؤں (چاروں طرف دیکھ کر) سارے
کواڑ بند ہیں۔

رادھا ۔ اور میں بندھی ہوئی ہوں۔ کھلاون پیارے تم ہوش میں
نہیں ہو۔

کھلاون ۔ چپ رہ لنگورنی۔

رادھا ۔ میں تمہاری دھرم پتنی ہوں۔

کھلاون ۔ اور میں تمہارا دھرم پتنا ہوں۔

رادھا ۔ میری بہن کو چھیڑو گے تو میرا رواں رواں۔

کھلاون ۔ بکے ہی جاتی ہے۔ چپ ہو جا نہیں تو۔

رادھا ۔ نہیں تو کیا ہوگا سوامی۔

کھلاون ۔ تیری ہڈیاں کچل ڈالوں گا۔

رادھا ۔ (زور سے ہنس کر) ـــ
بال نہ بیکا کر سکے جو جگ بیری ہوئے۔ باکو کہیں سائیاں مار سکے کوئے

کھلاون تو سی کر ان گورے گالوں پر نیل نہ بنا دوں۔

رادھا ۔ (قہقہہ لگا کر) تم مجھے چھو بھی نہیں سکتے پتی۔

کھلاون ۔ رہ تو بادھرمن۔

کھلاون جوش میں چارپائی کے پاس پہونچتا ہے اور طمانچہ مارتا ہے
رادھا کے منہ میں ایک انگلی آجاتی ہے وہ زور سے دبالیتی ہے۔
کھلاون ہائے ہائے کرکے تڑپ اٹھتا ہے پھر بائیں ہاتھ سے رادھا کا
گلا دباتا ہے۔ انگلی چھوٹتی ہے مگر خون بہہ رہا ہے۔
اتنے میں رتن نے موقعہ پاکر بھجالی کی نوک کھلاون کی پیٹھ پر
رکھدی۔ دیکھئے بھائی کھلاون آپ ہلیں گے تو میں نہیں جانتی
بھجالی پیٹھ سے پار ہوجائے گی۔
کھلاون پہلے تو سن ہوگیا پھر بڑی پھرتی سے روم گھوم کر سامنے آگیا
رتن ہکا بکا ہوگئی۔ کھلاون نے بائیں ہتھیلی سے داہنا ہاتھ
تھام کر مروڑ دیا بھجالی چھوٹ گئی۔
کھلاون۔ (قہقہہ لگاکر) اب کہو رتن۔ اب بولو رادھا۔ ہاہاہا۔
کتنی سندر ہو رتن۔ کیا جوبن ہے۔ اوہوہو۔ ابھی ابھی اس
میٹھے رس کو جی بھر کے پیتا ہوں۔
رادھا نے دونوں ہاتھ کھول لئے تھے۔ تڑپ کر اٹھی اور
کھلاون کی لانبی چوٹی پکڑ کر کھینچ لی۔ رتن چھوٹ گئی۔ اب
سارے کمرے میں آفت مچ گئی۔ کھلاون ایک طرف جاتا تھا
تو دوسری طرف سے کوئی نہ کوئی چیز کبھی سر پر پڑتی تھی کبھی
کہیں۔ پھر بھی حرامزادے کی رسی دراز ہے اس نے دونوں کی
چاروں کلائیاں ایک ایک ہاتھ سے پکڑ لیں۔ مگر خون بہنے سے
مرنیست ہوگیا۔
کمرے کے باہر بڑی جنگ ہو رہی تھی ایک طرف گاؤں کی گوہار
اور دوسری طرف سنڈے منڈے موالی۔ بڑی دیر کے بعد
سب لوگ گرفتار ہوگئے۔
کھلاون کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ہاتھ پاؤں بندھے ہیں۔ رتن
سروپ کی گود میں بیہوش پڑی ہے۔ سداہٹ کھڑا مسکرا رہا ہے
سلامت چپ چاپ ہے۔ رادھا اپنی گود میں پتی کا سر لئے
ہوئے ہے۔
رادھا۔ کیسے ہو سوامی۔
کھلاون۔ شرما کر منہ پھیر لیتا ہے

(رتن چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ پرمیشر میں سوپن دیکھ رہی ہوں
بڑی انند ہے پران ناتھ۔ کیا سچ مچ میں جاگ رہی ہوں۔
(آنکھ ملتی ہے)
سروپ۔ (کلیجے سے لپٹا کر) تم جاگ رہی ہو رتن! یہ پرلوک نہیں پران
پیاری۔
رتن۔ (دکھی ہوکر) مجھے وشواس نہیں ہوتا۔
سروپ۔ (ایک بوسہ لے کر) وشواس کرو رتن۔
رادھا۔ (رتن کے پاؤں پڑکر) دیوی اپنی دکھی بہن کی لاج رکھ لو۔
میرے سوامی کو چھوڑ دو۔
رتن۔ پران ناتھ یہ استری نہیں دیوی ہے۔ میری آتما میری جان
میری آبرو سب اسی دیوی نے بچائی ہے سروپ۔ کھلاون کو
چھوڑ دو۔
کھلاون (روکر) میں چھوٹنا نہیں چاہتا۔
سداہٹ۔ تو پھر کیا چاہتے ہو بابوجی۔ لڈو۔ پیڑا۔ برفی۔ بالوشاہی
سلیم شاہی۔
کھلاون۔ مجھ سے پاپی راکشس اور ملچھ کو اب موت چھوڑ کر کسی کی کامنا
نہیں۔ سداہٹ میں نے مور کھتا کی تھی۔ تم میرے بس میں
تھے۔ میں نے ایک ٹھوکر لگائی تھی اب میں تمہارے بس میں ہوں
تم تین ٹھوکریں لگالو۔
سداہٹ۔ (کانپ کر) کیا کہتے ہیں بابوجی۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے
اگر آپ اپنے پاپوں سے توبہ کرتے ہیں تو میں اب بھی آپ کا
داسی ہوں۔
کھلاون۔ اور پران پیاری رادھا تم بھی چھما کرتی ہو۔
رادھا۔ مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو پیارے۔
سلامت سروپ کا اشارہ پاتے ہی ہاتھ پاؤں کھول دیتا ہے
کھلاون اٹھتے ہی سروپ کے پاؤں پر گرتا ہے۔ یہ سر آج تک
کسی کے سامنے نہیں جھکا تھا ٹھے سروپ۔ آپ دیوتا ہو —
رتن دیوی آج سے میری بہن ہیں۔
سروپ پاؤں سے اٹھا لیتا ہے۔ رتن کیا کہتی ہو۔

رتن - پران ناتھ اگر آپ چھما کریں تو میں بھی -

سروپ - اگر آپ کریں تو میں بھی -

رتن - پہلے آپ -

سروپ - پہلے آپ -

سلامت - یہ تو لکھنؤ کا تکلف ہے - آپ آپ میں ریل چھوٹ جائیگی

رتن - میں چھما کرتی ہوں (مسکراتی ہے)

سروپ - اور میں بھی -

سلامت - کیوں بھائی کھلاون ہم سے چھما نہیں مانگتے -

کھلاون - (ہاتھ جوڑ کر) آپ بھی چھما کیجئے -

سلامت - (ہاتھ کھول کر گلے لگا لیتا ہے) مگر ایک شرط سے -

کھلاون - وہ کیا -

سلامت - ہنس دو -

کھلاون - دانت نکال دیتا ہے -

سلامت - (قہقہہ لگا کر) ایسے نہیں ایسے -

کھلاون - (ہنسکر) اس سماں -

سلامت - اسی سماں - کیا کالج والی ہنسی کی گھوڑدوڑ یاد نہیں -

. . . .

. . . .

کھلاون اور سلامت بے اختیار قہقہے لگاتے ہیں جیسے نوجوانوں میں ہنسی کا مقابلہ ہوتا ہے - سروپ اور رتنا ہٹ بھی ہنستے ہیں - مگر کم آواز سے - رتن اور رادھا بھی ہنستی ہیں مگر لے آواز -

---

وہی برسات اور چاندنی رات مگر باغ میں بہت سے جھولے پڑے ہیں - بط اور مور کے بہت سے جوڑے مست ہیں - چھ جھولے پڑے ہوئے ہیں -

جوان چھوکریاں اور جوان چھوکرے جھلا رہے ہیں -

جھولا نمبر - (۱) سروپ اور رتن - دولھا اور دولھن بنے ہوئے -

〃 (۲) سلامت اور چندا 〃 〃 〃 〃

〃 (۳) شیو بودھ اور کامنی 〃 〃 〃 〃

〃 (۴) کھلاون اور رادھا 〃 〃 〃 〃

〃 (۵) رام لال اور سدا ما

〃 (۶) انسپکٹر صاحب اور موتی 〃 〃 〃 〃

کلیوں اور پھولوں کے گجرے پڑے ہیں - سروپ اور رتن گاتے ہیں سب ساتھ دیتے ہیں - کہیں کہیں سدا ما ہکلاتی ہے یا موتی غلط شبد استعمال کرتی ہے - تو لوگ مسکرا دیتے ہیں - پریم ہی تن ہے پریم ہی من ہے رام لال اور دارو غہ جی کو گانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے بار بار توند پر ہاتھ پھیرتے ہیں ؂

(سید طالب علی - عابد)

زورِ بیان

(از جناب فراق گورکھپوری)

ابھی تک عندلیبِ زار کی حسرت نہیں نکلی
سرِ گلشن لہو میں تر گلوں کی آستیں نکلی

بہارِ گل نے آنکھیں پھیر لی ہیں ہم اسیروں سے
ہر اک موجِ ہوا گلزار سے چیں بر جبیں نکلی

سیہ مستوں میں شورِ ہرچہ بادا باد ہے ساقی
چھری کھینچے ہوئے موجِ شرابِ آتشیں نکلی

دلِ عشاق پر پیہم گرائیں بجلیاں لیکن
ہزاروں میں کروڑوں میں نگاہِ شرمگیں نکلی

دیارِ کفر و ایماں سے تو زاہد جی اچٹتا ہے
جو دل کھینچے وہ ملکِ عشق ہی کی سرزمیں نکلی

فریبِ دید پر مارے خوشی کے جان دے بیٹھے
محبت وہ کہ دنیا کہہ اُٹھے حسرت نہیں نکلی

دبے تھے جو شرار اسمیں وہ دوزخ میں نہیں ملتے
زمیں دل کی بھی یارب کس قیامت کی زمیں نکلی

جو ہوش آیا تو کثرت گاہ عالم کا بھرم ٹوٹا
وہ غفلت تھی کہ جس سے ہر تمیزِ آن و ایں نکلی

نمودِ شاہدِ دنیا بھی تھی جاتی ہوئی دنیا
نگاہِ حسنِ عالم بھی نگاہِ واپسیں نکلی

حریمِ ناز دل نے کر دیا ہے بزمِ عالم کو
کہ جو صورت نظر میں کھب گئی خلوت نشیں نکلی

وہ ہم تھے جس نے بارِ عشق اُٹھایا وقت آنے پر
فرشتے تیرے نکلے آسماں نکلا زمیں نکلی

بہارِ جلوۂ صبحِ ازل کو دل نہیں بھولا
پڑی جس کی نگہ اس پر نگاہِ اوّلیں نکلی

گلوں کا زخمِ پنہاں پیرہن در پیرہن نکلا
صبا کی موج لرزاں تیغ کیں در تیغ کیں نکلی

فراق اب تو دلِ بے مدعا بھی مٹ چکا کب کا
کہے جاتی ہے چشمِ شوخ ابھی حسرت نہیں نکلی

(فراق)

اُردو زبان پر ایک خطبہ

(از جناب محمد مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی بی اے علیگ)

خدا رکھے زباں ہم نے سُنی ہے میر و میرزا سے
کہیں کس مُنہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ شعر مصحفی نے کس سن میں کہا ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ سنہ ۱۷۷۶ء میں ایک مستند شاعر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ڈاکٹر جان بی گلکرائسٹ نے سنہ ۱۷۹۶ء میں لکھا ہے کہ "مخلوط زبان اردو[1] کہلاتی ہے۔ جو دربار کی مہذب زبان ہے اور جو بفضلہ آج بھی ہندوستان کے وسیع صوبجات میں رائج ہے۔"

چونکہ ہم کو مصحفی کے شعر کا سن نہیں معلوم ہو سکا اس لئے ڈاکٹر گریہم بیلی کے قول کے مطابق گلکرائسٹ کو اس افضلیت کا شرف حاصل ہے کہ اسنے ادبیات میں اردو کو ایک زبان کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا۔ جولیس بلاخ[2] نے ایک عجیب و غریب بات لکھی ہے وہ یہ کہ اردو کا نام یورپین مستشرقین کا رہین منت ہے لیکن اس دلیل کی کوئی سند نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں یہ قابل غور مسئلہ ہے کہ اردو گلکرائسٹ کے خیال میں ایک مشہور زبان کا نام تھا جس کا استحکام بھی ہو چکا تھا۔ اس بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی اردو کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ گلکرائسٹ خود اس زبان کو ہندوستانی کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ ڈبلیو ایچ ٹیسلی نے (انگریزی میں) "ہندوستانی" لکھیں میں (سنہ ۱۸۲۰ء)[3] جو اب بھی سلطنت برطانیہ میں موجود ہے اور شائقین اس سے مستفید ہو سکتے ہیں لکھا ہے کہ جس زبان کو میں نے ہندوستانی لکھا ہے وہ کبھی کبھی ہندی۔ اردو مسلمانی اور ریختہ بھی کہلاتی ہے۔ سید انشا نے بھی دریائے لطافت میں لکھا ہے[4] کہ خوش بیانان آنجا متفق شدہ از زبان ہائے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودہ و در بعض عبارت بکار بردہ زبان تازہ سوا زبان ہائے دگر درسانیدند و بہ اردو موسوم ساختند۔

باغ و بہار میں میر امن نے بھی اردو کی پیدائش پر مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ گو وہ اردو کو علیحدہ استعمال نہیں کرتے ہیں بلکہ ہر جگہ اردو کی زبان استعمال کرتے ہیں:۔

"حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کی زبان سے یوں سُنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے انہیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے جنکے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے۔ ہندوستان کو لیا انکے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اسواسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سنکر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی اکھٹے ہونے سے آپس میں

---

[1] ہندوستانی زبان کی قواعد صفحہ ۲۶۔
[2] اردو نام اور زبان۔ ڈاکٹر ٹی گریہم بیلی لنڈن یونیورسٹی
[3] میوزیم۔
[4] صفحہ ۲ لکھنؤ ایڈیشن۔

(امیر محل کتب خانہ کاکوری۔ لکھنؤ)

لین دین - سودا سلف - سوال جواب کرتے ایک زبان
اردو کی مقرر ہوئی -

جب حضرت شاہجہاں صاحب قران نے قلعۂ مبارک
اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا.........
تب سے شاہجہاں آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلّی جدی ہے
اور وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے اور وہاں کے
بازار کو اردوے معلےٰ خطاب دیا"

سیاق کی عبارت سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی خاص نام کے فکر میں ضرور مستغرق ہیں اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فارسی - ہندی - اسم معرفہ کی حیثیت سے بہت قبل سے مشہور ہیں - لیکن لفظ اردو کو غیر معمولی ہردلعزیزی ومقبولیت اٹھارھویں صدی کے آغاز سے قبل نہ ہوسکی - ہم تقی میر کے نکات الشعرا میں سب سے پہلی بار زبان آردوئے معلے نظر آتا ہے جو ۱۷۵۲ء کی تالیف ہے - چنانچہ ذکر میر (صفحہ ۶۲) میں یہ عبارت موجود ہے

پوشیدہ نماند کہ در فن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوے معلےٰ شاہجہاں آباد دہلی کتابے تاحال تصنیف نہ شدہ -

یہاں ڈاکٹر گریہم بیلی کا خیال ہے کہ اردوے معلےٰ سے مفہوم میر کا اسی زبان سے ہے جو با محاورہ ہو اور دہلی کی مستند اور فصیح اردو ہو -

مخزن نکات میں قائم نے دو برس بعد لکھا ہے کہ

"اکثر از ترکیبات فرس کہ موافق محاورہ اردوے معلےٰ مانوس گوش می یابند منجملہ جواز البیان می دانند"

یہاں بھی بیلی کے خیال میں اردوے معلےٰ سے مفہوم "صحیح اردو محاورہ ہے" اور مصنف کو فوج کا خیال بھی نہ ہوگا - لیکن چونکہ میر اور قائم اس جدید زبان کو ہندی یا ریختہ ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں تو غالباً اس عبارت کا مفہوم "زبان یا محاورہ فوج" ہوگا - میر کے بیٹے عرش جو انیسویں صدی میں حیات تھے - کہا ہے کہ

ہم ہیں اردوے معلےٰ کے زباں داں اے عرش
مستند ہے جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

اس شعر کا بھی سن نامعلوم ہے - شاعر کے باپ کا انتقال ۱۷۹۹ء میں ۸۶ سال کی عمر میں ہوا[1]

محمد عطا حسین نے نوطرز مرصع میں جو ۱۷۹۸ء کی تصنیف ہے "زبان اردوئے معلےٰ استعمال کیا ہے - اور تذکرہ گلزار ابراہیم میں (جسکو علی ابراہیم خاں نے ۱۷۸۳ء میں مرتب کیا تھا) وہ حالت خاں ثابت کے حالات میں لکھا ہے کہ تتبع زبان اردو نمودہ - اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں - وہ اردو زبان کا اتباع کرتا تھا - یا اردو کی زبان یا اپنی توجہ اس طرف منعطف کی تھی - مصحفی کے تذکرہ شعرائے ہندی میں (جو ۱۷۹۴ء میں مرتب ہوا تھا) محمد امان نثار کے حالات میں لکھا ہے کہ ادائے زبان اردو اس کا مفہوم یا توطرز اردو زبان ہے یا زبان اردو ہوسکتا ہے -

---

یہ ہمیشہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس زبان کا آغاز فوج یا چھاؤنی کی گفتگو سے ہوتا ہے (زبان اردو) اور ارتقائی حیثیت میں لفظ زبان حذف کردیا گیا اور کثرت استعمال سے محض اردو ہی باقی رہ گیا - ہم کو یہ معلوم ہے کہ شعر میں مصحفی نے لفظ اردو پہلی بار استعمال کیا تو ہم نے قرائن سے یہ طے کرسکتے ہیں کہ مصحفی کے اس شعر کا کیا سن ہوسکتا ہے تو ہمارے خیال میں مصحفی نے یہ شعر ۱۷۹۰ء کے لگ بھگ میں کہا ہوگا - جب شاعر کی عمر ۴۰ سال کی ہوگی - اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ یہ لفظ پہلی بار ۲۰۰ سال مغل قیام افواج لاہور میں استعمال کیا گیا یا تقریباً ۶۰ سال بعد افواج کے مستقر ہونے کے بعد دہلی میں یا ۱۶۰ سال مابعد بابر نے اپنی چھاؤنی کا نام اردوئے معلےٰ رکھا - اردو زبان ۷۵ سال قبل سے اس نام سے تحریرات میں عالم وجود میں آئی جس نام سے یہ آجکل یاد کیجاتی ہے اور اگر ہم اولین تاریخ ۱۷۵۲ء تسلیم کرلیں جب میر نے اس زبان کو شاہی چھاؤنی کی زبان استعمال کیا ہے ہم اعداد میں سے ۴۰ سال حذف کردیتے ہیں - دور مغلیہ کے کسی مورخ نے لفظ اردو استعمال نہیں کیا ہے ہم کو حسب ذیل سوالات کے جوابات بھی دیتا ہے -

(۱) اردو کا نام صدیوں بعد کیوں دیا گیا؟
(۲) اگر اٹھارھویں صدی میں یہ نام وضع کیا گیا ہے تو اس زبان کے لئے یہ نام کیوں منتخب کیا گیا جبکہ سالہا سال قبل یہ نام فوج کا تھا -

[1] ڈاکٹر گریہم بیلی نے اپنی جدید تحقیقات کی بنا پر یہ لکھا ہے کہ میر کا سن وفات ۱۷۹۹ء ہے ۱۸۱۰ء غلط ہے -

(۳) اگر فوج کا نام ۱۵۳۶ء تک (عہد بابری تک) اردو نہیں تھا تو وہ زبان جو ۵۰۰ سال سے قبل سے رائج تھی اس کا نام ضرور کچھ ہوگا۔ تو پھر وہ نام کیوں دور ہوگیا؟

اس مسئلہ کو بیان کر دینا حل کر دینے سے زیادہ آسان ہے میرے نزدیک اس کے سوا اس عقدہ کا دوسرا حل نہیں ہے کہ کوئی نام باصفت مثلاً زبان اردو عام بول چال کی گفتگو میں ضرور تھا۔ اس وقت سے پہلے بھی جبکہ فوج کو اردو کا نام دیا گیا اور وہی تدریجاً سالہا کے مابعد میں کتابوں میں داخل ہوگیا اور غالباً اس (تعین) وقت سے قبل جس کا ہم کو علم نہیں۔ کیونکہ لفظ اردو کا استعمال عہد مابعد میں ہو ڈاکٹر گریم بیلی کا خیال ہے کہ یہ ثبوت شرمندہ دلیل ضرور ہے۔ لیکن پھر بھی یہ خیال خضر راہ ضرور ثابت ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ہم کو یہ ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے۔ کہ عہد آغاز میں اردو ادب روزمرہ کی گفتگو زندگی کا مکمل آئینہ نہیں تھا۔ اور بہت کچھ بول چال میں زبان مستعمل تھی جس کی "صدائے بازگشت" کتابوں میں مفقود تھی۔

اٹھارھویں صدی اور اس سے قبل ہندی (ہندوی) عام نام اس زبان کا تھا جو ہندوستان میں عجمی و ہندی سماج کے امتزاج سے بن رہی تھی۔ اور ریختہ اس زبان کو کہتے تھے جو ادبی و شاعرانہ کی جنبات کی حامل تھی۔

جعفر زٹلی (۱۶۵۹ - ۱۷۱۳) نے ایک شعر لکھا ہے۔ ؎

اگرچہ سخن کوڑہ کرکٹ است ؎ بہ ہندی و رندی زبان لٹ پٹ است

فضلی نے دہ مجلس میں (جو ۱۷۳۲ء کی تصنیف ہے) لکھا ہے۔ اور ابتک ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نثر نہیں ہوا۔

اثر نے خواب و خیال (جو ۱۷۴۰ء کی تصنیف ہے) میں لکھا ہے کہ

ریختہ نے تب یہ شرف پایا ؎ جبکہ حضرت[1] نے اس کو فرمایا

خواب و خیال میں صفحہ ۹ پر فہرست تصانیف میں اردو کو ہندوی بھی کہا ہے

فارسی سو ہے ہندوی سو ہے ؎ باقی اشعار مثنوی سو ہے

افضل بیگ نے اپنے تذکرہ تحفۃ الشعرا[2] میں (جو ۱۷۵۲ء کی تالیف ہے اور زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے) مطلقاً انہیں شعرا کا تذکرہ ہے جو فارسی کے شاعر تھے۔ لیکن جہاں اردو کا تذکرہ ہے اسکو ہندی لکھا ہے چنانچہ میر عبدالحی وقار کے حالات میں لکھا ہے کہ اشعار فارسی و ہندی تاب درست دارد

چمنستان شعرا[3] میں صفحہ ۱۵۲ پر یہ عبارت موجود ہے

شاہ حاتم نے (اپنے متعلق) اپنے دیوان زادہ میں (جو ۱۷۵۵ء کی تالیف ہے) میں لکھا ہے کہ

در شعر فارسی پیرو میرزا صائب است و در ریختہ ولی را استاد میداند۔

میر حسن (جن کی وفات ۱۷۸۶ میں ہوئی ہے) ہمیشہ ہندی اور ریختہ استعمال کیا ہے اور اردو کو استعمال نہیں کرتے اور اپنی بیاض میں (جو ۱۷۷۶ء کی تالیف ہے) تذاکرہ سخن آفرینیان ہندی استعمال کیا ہے۔

شاہ عبدالقادر نے اپنے مشہور ترجمہ کلام مجید میں لفظ ہندی ہی استعمال کیا ہے۔

"اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف کہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو"

میر (۱۷۱۳-۹۹) سودا (۱۷۱۳-۸۰) اور قائم (۱۷۹۰) نے ریختہ میں استعمال کیا۔

میر نے لکھا ہے کہ

مضمون کیسے کیسے کہے ریختہ ولے ؎ سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

لفظ ہندی پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے ابتدائے عہد میں قدرتاً یہی لفظ مستعمل تھا۔ بہت سے وجوہ ریختہ کے دئیے گئے ہیں۔ مثلاً ریختہ فارسی لفظ ہے جس کے معنی گرایا ہوا یا ڈھالا ہوا اور اصطلاحاً ریختہ کا اطلاق ایسے کلام پر ہوتا ہے جو دو زبانوں (عربی و فارسی) پر مشتمل ہو۔ (۲) ریختہ کے معنی گرا ہوا ہیں چونکہ اردو کو ذلیل و حقیر تصور کیا جاتا تھا اس لئے اس کو ریختہ کہا گیا۔ (۳) اردو کو ریختہ اس لئے کہتے تھے کہ اس کے اندر ہندی عربی و فارسی الفاظ شامل کئے گئے تھے۔ (۴) ریختہ امیر خسرو کی

[1] حضرت سے مفہوم درد ہے جو استاد بھائی تھے۔

[2] آب حیات ایڈیشن ۱۹۱۷ء صفحہ ۱۱۵۔ محمد حسین آزاد۔

[3] تذکرہ چمنستان شعرا لچھمی نرائن شفیق۔ یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو کیجانب سے شائع ہوچکا ہے۔

ایجاد کردہ فن موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔ کیونکہ ہندی الفاظ فارسی
سخن میں گانے سے زیادہ پیارے معلوم ہوتے ہیں (۵) ریختہ کے معنی ہیں
مختلف مسالوں کی ایک ریختہ اور مستحکم تعمیر کے۔ ناسخ کے بعد (المتوفی ۱۲۵۴ھ)
شعرائے لکھنؤ نے لفظ ریختہ ترک کیا اور اس کے بجائے اردو استعمال کرنے
لگے۔ مگر دہلی میں ۱۸۵۷ء تک ریختہ مستعمل رہا۔

خضر بلگرامی نے جلوہ خضر میں لکھا ہے کہ ریختہ شاہجہاں کے عہد سے
مستعمل ہے اس کے لئے ڈاکٹر گراہم بیلی کے الفاظ میں "ثبوت کی ضرورت ہے"

امیر خسرو نے اس جدید زبان کو زبانِ دہلوی لکھا ہے اور آئینہ اکبری
میں ابوالفضل نے بھی زبان دہلوی لکھا ہے۔

شاہ حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں روزمرہ دہلی لکھا ہے

"روزمرہ دلی کہ مرزایان ہند در محاورہ آرند منظور دارد"

اور دوبارہ لکھا ہے کہ

"روزمرہ راکہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمود"

دکنی مصنفین میں شاہ میراجی (المتوفی ۱۴۹۶) نے جو مشہور مذہبی
مصنف گزرے ہیں جو مبلغ بھی تھے۔ اردو ہی میں تبلیغ کیا کرتے تھے لکھا ہے کہ

یہ بولو ہندی سب اس ارتو کے سبب

ان کے بیٹے شاہ برہان الدین (المتوفی ۱۵۸۲) نے ارشاد نامہ میں لکھا ہے کہ

اب نہ ہندی بول۔

انہوں نے اس جدید زبان کا نام حجتہ البقامی گجری بھی استعمال
کیا ہے۔

جے ہوے گیان بھکاری دیکھے بھاکا گجری

جو لوگ عقلمند ہیں جو گجری کو ذلیل نہ سمجھیں گے۔ یہاں گجری سے
اردو ہی مقصود ہے۔ اور ارشاد نامہ میں ہے کہ

یہ سب کیا گجری زبان

میں نے یہ سب گجری زبان میں لکھا ہے یہاں بھی گجری سے
اردو ہی مقصود ہے۔

مو کما وجہی نے قطب مشتری میں (جو ۱۶۰۹ کی تصنیف ہے) جو
ہندوستانی دفتر کی فہرست میں گمنام اور مختلف ناموں کے موجود ہے۔
۱۶۳۴ء میں ایک نثر کی کتاب سب رس تصنیف کی اور حمد و ثنا کے بعد لکھا ہے کہ

آغاز داستان بہ زبان ہندوستان

یہاں سے دکھنی اور دہلوی اردو کا لطیف فرق شروع ہوتا ہے

دکھن کی زبان دکنی یا دکھنی کہلاتی تھی جیسے رستمی کے خاور نامہ میں (جو
۱۶۴۹ء کی تصنیف ہے) لکھا ہے کہ "خاور نامہ دکنی کہتا ہوں نام تین نے
اس کا نام دکنی خاور نامہ لکھا ہے۔ شاہ مسلک کے شریعت نامہ میں بھی
(جو ۱۶۶۷ء کی تصنیف ہے) لکھا ہے کہ "دکھنی میں بولیا ہے صاف"
کہ یہ صاف دکھنی میں ہے۔ ہندوستانی دفتر کی فہرست میں غلطی سے اس
مصنف کا نام شاہ ملک لکھ گیا ہے۔

ڈاکٹر بیلی نے اسی سلسلہ میں ایک یہ بھی تحقیقات کی ہے کہ اردو ترکی
زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر یا چھاؤنی (کیمپ) میں اور انگریزی
زبان کا لفظ ہورڈ (HORD) اسی سے مشتق ہے۔ ۱۱۹۳ء کے
بعد دہلی میں جو اسلامی افواج تعینات رہیں انکو اردو یا اردوے معلے
کہتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے فی الحقیقت اردوے
معلےٰ کی بنیاد اس سے ۲۰۰ سال قبل یعنی ۱۰۲۰ء میں رکھی جا چکی تھی۔
زندہ دلانِ پنجاب اس پر بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں کہ جب سلطانی افواج کی
چھاؤنی لاہور میں قائم ہوئی تھی اور وہ ولایتی سپاہیوں اور پنجابی
لوگوں کی گفت و شنید اور داد و ستد اور شادی و بیاہ و اختلاط کے
سلسلہ میں ایک جدید زبان بننا شروع ہوئی جو آئندہ چل کر اردو
کہلائی۔ گویا زبان اردو کا سب سے پہلا پودا وہ تھا جو پرانی پنجابی کی
زمین میں فارسی و ترکی الفاظ کی تخم ریزی سے اس سرزمین میں پیدا ہوا
اور اس کے بعد جب ۱۱۹۳ء میں مسلمان افواج کی چھاؤنی دہلی میں
قائم ہوئی تو وہ پودا دہلی کی شیریں اور لوچ دار کھڑی بولی کے امتزاج سے
جدید زبان کا مورث اعلےٰ بن گیا۔

تاریخ بیہقی سے پتہ چلتا ہے کہ جب سبکتگین نے اپنی نئی سلطنت کا
مُتلا بنا کر کھڑا کیا اور ہندوستان کی بولیوں میں عربی و فارسی کے ترکی
میل کا وقت آیا اسوقت پشاور۔ پنجاب اور غزنین میں صلح اور
لڑائی کے تعلقات قائم تھے۔ آمدورفت۔ جنگ۔ صلح و آشتی کے لئے دونوں
قوموں کی زبانوں میں اختلاط کا موضع موقع آگیا تھا۔ اس وقت

ترکستان میں ہزار ہا ہندوستانی موجود تھے جو یہاں سے نوکری کے لئے اور دوسرے مختلف طریقوں سے بھی گئے تھے اور امیر سبکتگین کی فوج میں دوسری اقوام کے دوش بدوش ہندو بھی داخل تھے۔

"ولشکر خواستن گرفت وبسیار مردم جمع شد از ہندو خلیج وازہر دستی"[۱]

محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم تلک تھا جو فارسی جانتا تھا اور نامہ و پیام مراسلت کی خدمت اس کے سپرد تھی۔

"خطے نیکو ہندوی فارسی و مدتے دراز بکشمیر رفتہ بود وشاگردی کردہ ——— دادرا دبیری ومترجمی کردی باہند وان"[۲]

آل سبکتگین میں (جو آل مسعود کے عہد میں مرتب ہوئی تھی) بھی ایک ہندو مترجم بیربل کا ذکر موجود ہے جس کا تعلق دفتر انشا سے تھا۔

"ہمچناں بیربل بدیوان ما"

محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے اہل علم تھے وہاں ہندوستان کے اہل علم بھی شریک بزم تھے۔

کالنجر کے راجہ نندا نے ۴۱۴ھ میں سلطان کی مدح میں ایک ہندی شعر لکھ کر بھیجا۔ تو اس کی دربار خسروی میں بڑی قدر ہوئی۔ یہ واقعہ فرشتہ میں موجود ہے۔

"ونندا بزبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد وسلطان امرا وفضلائے ہند وعرب وعجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ ہمگی تحسین وآفریں کردند"

یہ وہ عہد تھا جب لاہور بھی فتح نہیں ہوا تھا۔ اس زمانہ میں بھی سلطان کے دربار میں عرب وعجم اور ہند کے فضلا پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے اور سب اتنا درخور رکھتے تھے کہ ہندی شعر کو سمجھ لیں اور مزہ لیں اس عہد کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان جو لاہور میں پیدا ہوا تھا اس نے عربی وفارسی اور ہندی کا دیوان یادگار چھوڑا ہے۔

یکے بہ تازی ویکے بہ پارسی ویکے بہ ہندی[۳]

یہ شوق روز بروز ترقی کرتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک ترک خاندان جو دہلی میں رہتا تھا اسمیں خسرو جیسا ہمہ داں شاعر پیدا ہوا جس نے عربی فارسی ہندی میں علیحدہ علیحدہ بھی اور تینوں زبانوں کے مصرعوں کو بھی ملا کر بھی شاعری کی چنانچہ انہوں نے خود بھی اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ میں اسپر فخر کیا ہے۔ یہی میل جول ہے جو زبان بنی اس کا پہلا نمونہ ہم کو ۷۲۹ھ میں حضرت تغلق کے عہد میں ملتا ہے سنہ مذکور میں سلطان ٹھٹھہ ناکام حملہ کرکے گجرات چلا گیا۔ تو ٹھٹھہ والوں نے اسکو اپنے شیخ کی کرامت سمجھ کر کہا "برکت شیخ تھیا اک مرا اک تھا" یعنی شیخ کی برکت سے ایک حملہ اور (محمد تغلق نے ۷۵۲ھ میں حملہ کیا تھا مرگیا) اور دوسرا (فیروز تغلق) ناکام رہا۔ ۱۱۹۳ء میں دہلی پر قبضہ کرکے بحیثیت سلطان کے (اپنے آقا کی وفات کے بعد) حکومت شروع کردی۔ اس کی فوجوں نے لاہوری افواج کو مغلوب کرکے بعض سپاہیوں سے دوستی پیدا کی اور دونوں افواج دہلی گئیں اور رسل ورسائل کے ذرائع قائم رکھنے کے لئے بہت کافی فوج لاہور میں بھی چھوڑ دی گئی۔ اور ایبک کے لئے یہ ضروری بھی تھا کہ وہ سب مغلوب سپاہ کو دہلی لے جائے تاکہ لاہور میں بغاوت کا کوئی خدشہ باقی نہ رہ جائے۔ لہٰذا ایک بہت بڑی جماعت جو قطب الدین ایبک کے ساتھ دارالخلافت میں داخل ہوئی وہ یقیناً سی زبان (اردو) بولتی تھی جو نتیجہ بھی اس امتزاج کا ہوا کا ہندی و افغانی سماج کے معاشرتی جذبات کی پذیرائی کا اور یہ فوج ظفر موج جب دہلی آئی تو یہاں بھی اس نے قدیم کھڑی بولی کو متاثر کیا اور یہی آگے چل کر اردوئے معلیٰ بن گئی۔

ان ابتدائی حالات پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اردو کا وطن اصلی لاہور ہے[۴] نہ کہ دہلی اور ابتدائی پنجابی اس کے اجداد میں شمار ہوسکتی ہے اور برج بھاشا کو اس سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔ بدقسمتی سے اس دور کی کوئی مستند کتاب ہم کو نہ مل سکی جس سے ہم یہ طے کرسکتے کہ قدیم ابتدائی پنجابی کی شکل کیا تھی لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ قدیم کھڑی سے زیادہ مختلف ہوگی برج بھاشا کا کوئی سوال ہی نہیں ہے یہ مابعد کی غلط تحقیقات کا نتیجہ ہے جو ممالک متحدہ والوں کی طبعزاد ہے۔ ۱۳۲۶ء میں جب

سلطان محمد تغلق نے دکن پر حملہ کرکے دولت آباد (متصل اورنگ آباد) کو دارالخلافہ بنایا تو اسوقت یقینی امر ہے کہ اس کی فوج اردو بولتی تھی۔ اور اس کے عہد سے بیشتر دہلی میں امیر خسرو کا طوطی بول رہا تھا۔ اور جب سلطان علاء الدین بہمنی کے خانوادہ بہمنیہ کا اساسی پتھر رکھا تو شاہی زبان اردو ہی مقرر کی گئی[۶]

[۱] تاریخ بیہقی صفحہ ۲۷۰ و صفحہ ۵۰۰ کلکتہ ۔ [۲] تاریخ بیہقی صفحہ ۴۰۳، کلکتہ ۔ معارف ا ۔ جلد ۳۲ صفحہ ۹ ۔ [۳] لباب الالباب ۔ صوفی جلد ۲ صفحہ ۲۴۲ گب اڈیشن معارف ا ۔ جلد ۲ صفحہ ۱ ۔ [۴] حکیم صاحب کو خوش ہونا چاہئے اور حاسدان ادب کو جلنا چاہئے اگر آج اردو کی ترویج واشاعت پر پنجاب آگے ہے تو اس کا حق تو یہی ہے ۔ [۵] اس خطبہ میں بہت سی کتابوں سے امداد لی گئی ہے۔ اور سب سے زیادہ ڈاکٹر گریم بیلی کے ایک مضمون سے ۔

پریم ساگر کی ایک رات

(از جناب خورشید اقبال حیاؔ میرٹھی)

نظر تاروں کی جھپکی جا رہی ہے — فضائے دہر کو نیند آ رہی ہے
سکوتِ شب سکوں بر دوش آیا — درختوں پر خموشی چھا رہی ہے
شگوفے نرم و نازک کھل چلے ہیں — ہَوا سرد اور پُر نم آ رہی ہے
اُفق سے چاند چپکے چپکے نکلا — تجلّی اُس کی بڑھتی آ رہی ہے
منوّر چاند کے میٹھے اثر سے — فضا پُر نور ہوتی جا رہی ہے
ستاروں کی یہ ہلکی مسکراہٹ — فضا میں جس سے تابش آ رہی ہے
سریلے راگ پریم اور پریت کے گیت — کہیں پھولوں پہ بلبل گا رہی ہے
ہواؤں میں ہیں ہلکے ہلکے نغمے — سکون بنکر مسرّت چھا رہی ہے
کسی نے بانسری میں راگ چھیڑا — صدا کچھ دھیمی دھیمی آ رہی ہے
نہ جاگ اُٹھیں کہیں خوابیدہ کلیاں — ہوا دھیمے سروں میں گا رہی ہے
رواں ندی کی موجیں ہیں سکوں سے — لطافت موج پر لہرا رہی ہے
یہ خاموشی یہ دلآویزیٔ شب — نگاہوں پر سکوں برسا رہی ہے
وہ روز و شب جو تھے اک خوابِ شیریں — تصور میں انہیں یہ لا رہی ہے
وہ دن جب زندگی تھی کیف یکسر — انہیں کی یاد پھر تڑپا رہی ہے
تصور پھر وہی دل آزما ہے — طبیعت ہے کہ مچلی جا رہی ہے
مری تخئیل میں پھر آ گئے وہ — نظر جن سے تجلّی پا رہی ہے
تصورؔ اُن کا کتنا کیف زا ہے — ابھی سے بیخودی سی چھا رہی ہے
نہ آؤں یاد جن کو بھول کر میں — مجھے کیوں یاد ان کی آ رہی ہے
محبت چھا گئی ہے میرے دل پر — محبت میرے دل پر چھا رہی ہے
بلائے یاس ہے دل پر مُسلّط — گھٹا سی بن کے چھائی جا رہی ہے
پتہ ساحل کا کوسوں تک نہیں ہے — محبت کس طرف لے جا رہی ہے؟

اگر دلکش ہے ساحل تو مجھے کیا
میری کشتی تو ڈوبی جا رہی ہے

(خورشید اقبال حیاؔ)

آہ - وہ عہدِ کیف بار!

(از جناب گوہر اقبال حورؔ)

آہ، وہ عہدِ کیف بار جب تھیں مسرتیں نصیب
میرا خیال میری یاد۔ دل سے "کسی" کے تھی قریب

چھایا ہوا تھا اِک سکون اس دلِ ناشکیب پر — روح تھی میری مطمئن، وعدۂ پُر فریب پر
کھیل رہی تھیں عشرتیں، ذہن کے صبح زار میں — ڈوبا ہوا تھا ہر نفس کیفیتِ خمار میں
ایسی چلی ہوائے غم — شمعِ سکوں بجھا گئی
ٹوٹ پڑی بلائے غم — یاس کچھ ایسی چھا گئی

جلوۂ صبح کیف زا
شامِ الم میں چھپ گیا

چھا گئی تیرگیٔ شام — سو گیا بختِ خفتہ کام
مٹ گئی لمحہ بھر میں آس — رہ گیا میرا جی نراس

وہ تھی خوشی کی ابتدا
یہ ہے الم کی انتہا

یہ ہے الم کی انتہا۔ ٹوٹا پڑا ہے دلِ غریب

غم ہی مرا نصیب تھا، غم سے گھرا ہوا ہے دل
سیلِ ملال و یاس میں ڈوبتا جا رہا ہے دل

پہلی خوشی کی ساعتیں ہو گئیں اس طرح تمام — خواب میں بھی نہیں نصیب ایسا مٹا خوشی کا نام
زخمِ جگر میں ہے خلش نشترِ غم کی چھیڑ سے — آنکھ جراحت آشنا اشکِ الم کی چھیڑ سے
ختم ہوئیں مسرتیں — کیفِ حیات کھو گیا
خواب ہیں اب وہ راحتیں — میرا نصیب سو گیا

نقشِ محبت و وفا
دل سے "کسی" کے مٹ چکا

مٹ گئیں ساری حسرتیں — آہ! میری مسرتیں
دل ہے فگار و مضمحل — ہائے یہ بیقرار دل!

ٹوٹ چکا سکوں کا جام
عمر بھی ہو کہیں تمام

عمر بھی ہو کہیں تمام، جینے سے تھک گیا ہے دل

کوہسار شملہ

(از نتیجۂ فکر مصورِ فطرت - ڈاکٹر تاج زبیری میرٹھ)

دیکھ اے حیرت نگر! شملے کا یہ کہسار دیکھ
رفعت و رنگینیٔ و عظمت کا اِک انبار دیکھ

نغمہ سنجانِ فرازِ کوہ کے نغمات سُن
دُور تک چوٹی پہ رقصِ ابرِ گوہر بار دیکھ

دیکھ یہ اونچے درختوں کی خموشش استادگی
یہ شفق کے سائے میں رنگِ نہفتہ زار دیکھ

رہ گذر ہیں جن سے چکراتا تھا رہرو کا دماغ
سب وہ ناہمواریاں پھر ہو گئیں ہموار دیکھ

دیکھ آثارِ نمو کی یہ مسلسل شوخیاں
آ، عروسِ رنگ و بو کو مستقل بیدار دیکھ

منکشف قدرت کا ہر رازِ نہفتہ ہے یہاں
خاطرِ فطرت بہ ہر لمحہ شگفتہ ہے یہاں

دیکھ غیر آبادیوں میں دُور تک آبادیاں
زندگی کے شور سے گونجی ہوئی ہیں وادیاں

ہر نفس مستی سے صد میخانہ در آغوش ہے
یعنی حاصل ہیں نگاہ و ذہن کو آزادیاں

پتھروں کے ڈھیر اور ان میں بہر سو زندگی
دیکھ یہ انسانِ ناقص کی جہاں ایجادیاں

یہ فضا یہ ہستیٔ غم آشنا کی عید گاہ
مل رہی ہیں شادکامی سے گلے ناشادیاں

یہ ثریا خام کلیاں نازنینانِ بہار
یہ حسین و مہ جبین کہسار کی شہزادیاں

سیر کر شملے کی ہر اندوہِ ہستی بھول جا
رفعتوں کا چاند بن جا رنجِ پستی بھول جا

غزل

(از جناب مصورِ قلم ماسٹر باسط - بسوانی)

جو آئے ہو یہاں آتش بیانی دیکھتے جاؤ
لحد پر شمع کی شعلہ زبانی دیکھتے جاؤ

مُبتو شانِ خدا ابھی تم کو کہکر جی نہیں بھرتا
ابھی کیا ہے - ہماری حق بیانی دیکھتے جاؤ

سراپا سوز مثلِ شمع ہوں پر اُف نہیں کرتا
زباں ہونے پہ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ذرا سنبھلے ہوئے اے عاشقو بحرِ محبت میں
کہیں سر سے گزر جائے نہ پانی دیکھتے جاؤ

جو تم چاہو وہی اچھا - جو تم کہدو وہی بہتر
ہماری ہمنیالی - ہم زبانی دیکھتے جاؤ

خلاصہ ہے نگاہِ واپسیں افسانۂ غم کا
مرے جذباتِ دل کی ترجمانی دیکھتے جاؤ

کہاں پر پاؤں رکھتے ہو - کہاں پر پاؤں پڑتا ہے
ذرا تم لغزشِ کیفِ جوانی دیکھتے جاؤ

تمہارا نام سب لیتے ہیں اور آنکھیں نہیں کھلتیں
ذرا بیمارِ غم کی ناتوانی دیکھتے جاؤ

ابھی آغاز ہے افسانۂ اُلفت کا ہنستے ہو
رُلائے گی تمہیں میری کہانی دیکھتے جاؤ

نہ کچھ اس کی حقیقت ہے، نہ باسط اعتبار اس کا
طلسمی گھر ہے یہ دُنیائے فانی دیکھتے جاؤ

ایران میں اقتصادی ارتقا کی ابتدا

رضا شاہ کا دہ سالہ کارنامہ

(از مفتی غلام جعفر بی اے صحیفہ نگار لاہور)

تاثراتِ مغرب ایک مدت سے دنیا پر موثر ہو رہے ہیں۔ امریکہ اور آسٹریلیا کی گرمی حیات یورپ کے ہی نو آبادکاروں کے دم سے ہے۔ وہاں تاثراتِ مغرب تو بجائے خود مغربیت بلکہ مغرب زدگی کا عمل دخل ایک امر لازم تھا اور ہے۔ بلکہ مغربیت میں امریکہ تو مادرِ یورپ سے بھی پیش پیش ہے علیٰ ہٰذا القیاس افریقہ کے وہ قطعات جہاں سفید فام مغربیوں کا عنصر غالب ہے۔ خواہ بلحاظ کثرتِ آبادی و فوقیت و آزادی اور خواہ بلحاظ غصبِ تصرف اقتصادی سحرِ مغرب سے مسحور رہیں اور رہونا بھی چاہیئے تھا۔

رہا ایشیا۔ یہاں چین و جاپان اور ہند و افغانستان۔ گو نسبتاً بیش و کم مگر سب کے سب کچھ نہ کچھ بہرحال۔ زبانِ حال و قال سے مغرب کے مداح اور مغربیت کے مقلد بننے میں جد و جہد کی داد دیتے نظر آتے ہیں کم سے کم معاشرہ کے بعض طبقے۔ بالخصوص پڑھے لکھے اور روپے پیسے والے تو مغرب زدہ ہوئے جاتے ہیں۔ پھر جاپان سا شاگرد رشید تو استاد سے بھی گوئے سبقت لیجانے میں کوشاں ہے بلکہ بعض صورتوں میں لے جاچکا ہے۔

ان سب سے قطع نظر اسوقت ہمارے خیالات اور تحقیقات کا مرکز شعاعی ایرآن ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دودمان زار کے روس اور انگلستان۔ ان دو دول یورپ کی رقابتوں اور فوقیتوں کے ہاتھوں ایران کی نکبت انتہا تک پہنچ چکی تھی اور بقول بعضے از مدبرین فرنگ ایران کی گردن کے ساتھ مغربی استعمار کی تسمہ بازی اپنا ہلاکت آفریں کھیل کھیل رہی تھی کہ اتنے میں۔ ع

"مردے از غیب بروں آمد و کارے مے کرد"

رضا شاہ پہلوی کی شخصیت حرکت و عمل کی علمبردار بن کر میدان میں نکلی اس نے جہاں قدیم قاچاری ملوکیت کا تار و پود بکھیرا۔ وہاں اس کے بجائے جمہوریت اور آمریت کے بظاہر اجتماع ضدین سے ایک جدید طرز حکومت قائم کیا۔ پارلیمانی مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ مگر شخصی پنجۂ آہنی سے اس کا استحکام ہوا۔

ایسا اس جوہر قابل نے مغربیوں اور مغرب زدگیوں دونوں کو راہِ فرار دکھائی اور حریف و حلیف سب سے پہلوی خاندان کی حکمرانی منوائی مگر ساتھ ہی وہ شے بھی قبول کی جسے "تاثراتِ مغرب" یا بالفاظ صحیح تر "تاثراتِ عصرِ حاضر" کہنا چاہیئے۔

آغاز اصلاح

نکتہ جو اور نکتہ رس نگاہوں سے دیکھنے والے محققین اور ماضی حال و استقبال کا موازنہ کرنیوالے مدبرین کے نزدیک ایران نے آخری قاچاریوں کے عہد میں تاثراتِ مغرب اور مقتضیاتِ عصرِ حاضر کو بہت کم قبول کیا۔ اور اگر کچھ کیا بھی تو اس کی رفتار سست ہی رہی۔ اور کیوں نہ رہتی جبکہ اصل و حقیقت میں اغیار برسرِ کار تھے۔ روس اور انگلستان کو اپنے اپنے حلقۂ اثر یعنی شمالی اور جنوبی ایرآن میں اپنی اپنی ملک دارانہ سیادت

سیاست اور تاجرانہ منفعت سے سروکار تھا۔ اور بس۔ ان مغربیوں کو کیا پڑی تھی کہ اصلاحِ ایران کا دردِ سر بیکار مول لیتے۔ اُدھر آخری قاچاری سلطان ماشاء اللہ کجکلاہِ ایران ان کا یہ حال تھا کہ آئے دن ارضِ فرنگ کی سیاحت و سیر کا سودا ضرور ان کے سر میں سماتا۔ وہ یورپ کو اپنے قدوم مفتخر فرماتے۔ حسنِ فرنگ کی پرستاری اور تعیشِ فرنگ کی پاسداری میں خوب خوب انہماک دکھاتے۔ لاکھوں لٹاتے۔ مگر جب واپس آتے۔ تو فرنگستانیوں کے سیاسی۔ اقتصادی اور معاشری اطوارِ شائستہ میں سے کوئی سی شے ہمراہ نہ لاتے۔ ان کی سیاحتِ یورپ ایک گراں قیمت امیرانہ مشغلے اور شخصی تفریح و تفنن کے مشغلے سے بڑھ کر ثابت نہ ہوتی۔ اگر یہ عیش کے بندے ایک آدھ کام کی بات بھی سیکھ آتے اور اسے ایران میں رائج کرتے تو غیر جانبدار مفکر و مورخ ان کے اسراف کو ایک حد تک حق بجانب قرار دیتے۔ اگر قسامِ ازل نے تفاخرِ اصلاح رضا شاہ کو قسمت کیا تھا۔ جس کی آمد تک ایران وہ ولایت تھی کہ تاثراتِ عصرِ حاضر سے اثر پذیر ہونے میں باقی سب ایشیائی مملکتوں سے پیچھے ہی رہی تھی۔

غرض رضا شاہ کا دورِ جدید کا آغاز ہو گیا۔ اب پہلوی خاندان کے پہلے حکمران نے فیصلہ کیا کہ تاثراتِ عہدِ حاضر تو ضرور کار فرما ہوں مگر غلط کارانہ مغربیت سے گریز اور مغرب زدگی سے قطعاً پرہیز کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب سے اب تک (یعنی ۱۹۲۵ء سے جب رضا شاہ تخت نشین ہوا آجتک) جدت کے متعلق اس کی اس حکمتِ عملی پر ایران برابر عمل پیرا ہے۔ اور اُس نے عصرِ حاضر کے تقاضوں اور مطالعوں کے سامنے سرِ نیاز جھکا رکھا ہے۔

زمانۂ حالیہ میں ایران کی مادی ترقی اور نشو و نما کے وسائل قدرتی کی تفصیل ایک بیان طویل ہے۔ اس لئے صرف چند نسبتاً زیادہ اہم امور کی کیفیت تحریر کی جاتی ہے۔

آج کل قاچاری جمود و خمود کی جگہ عمل و حرکت نے لے لی ہے۔ گزشتہ اور موجودہ کوائف میں بُعدِ عظیم رونما ہو گیا ہے۔

ترقی کی مختصر کیفیت

ایران کو حریفانِ فرنگ کا کچھ ایسا تلخ تجربہ ہو چکا ہے کہ آج وہ اغیار کو خوش آمدید کہنے میں تامل روا رکھتا ہے۔ پہلے جب مسافر آتے تو ایرانی ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ان میں تجارتی مراعات کے طلبگار فنونِ لطیفہ کے مشاق اور اوباش لوگ ہوتے اور سب کچھ نہ کچھ لے مرتے۔ لیکن اب پہلے کی سی بات نہیں۔ ایرانی سرحد سے گزرنے کے بعد ہر نو وارد سے پہلا مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ بندہ پرور ذرا شفاخانے تک چلئے اور صحت کی سندات دکھائیے اور اگر آپ ان اسلحہ سے مسلح نہیں تو ہم نے متعدی امراض کے ٹیکوں کا بندوبست کر رکھا ہے۔ بازو بڑھائیے اور ٹیکہ لگوائیے اس پر اکثر اہلِ فرنگ بہت گھبراتے ہیں۔ چنانچہ باخبر تاجر اور سیاح گھر سے ہی ٹیکہ لگوا کر چلتے ہیں اس حقیقت سے یہ ثابت ہوا کہ اب ایران اولیں مغربی تاثر کا خوگر ہو گیا ہے اُسے بھی یورپ والوں کی طرح یہ منظور نہیں کہ ہر احمق بلا باز پرس سیدھا درآتا چلا آئے۔ بلکہ پہلے اپنی صلاحیت دکھائے۔

مٹی کا تیل

حفظِ صحت کا یہ اصول مالیاتِ ایران پر بھی عائد کر دیا گیا ہے۔ حیلے حوالے سے یا زور و جبر سے جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا اور بغیر کامل تحقیقات اور معقول شرائط کے تجارتی حقوق اور معدنی پیداواروں کی اجارہ داری اغیار کے حوالے نہیں کی جاتی۔ مٹی کا تیل ایران کا ایک مدفون خزانہ ہے۔ اور وہی آج کل حکومتِ مرکزیہ کی آمدنی کا سب سے بڑا منبع و ماخذ ہے لیکن اس کی بہم رسانی کا انتظام عین مغربی اصولوں کے مطابق کیا گیا ہے۔ گو "اینگلو ایرانین کمپنی" واحد اجارہ دار ہے مگر اس کے اجازت نامے میں حکومتِ ایران نے اپنے حقوق نہایت عمدگی سے محفوظ کر لئے ہیں اور اس میں ایرانی سرمایہ شامل ہے۔

کسی زمانے میں کرمان شاہ متعدد تجارتی راستوں کا مرکز تھا جب دورِ انحطاط آیا تو کرمان شاہ کی قدیمی اہمیت رخصت ہو گئی۔ مگر اب مٹی کے تیل نے اُسے رونقِ تازہ بخشی ہے۔ پچھلے سال اس میں اضافہ ہوا یعنی شمالی اور مغربی ایران کو پیٹرول مہیا کرنے کے لئے یہاں مٹی کا تیل صاف کرنے کا ایک عظیم الشان کارخانہ تعمیر کیا گیا۔ لوہے کے متعدد حوض سطحِ زمین سے بلند بنائے گئے ہیں۔ ان پر ایلومینیم کا غلاف چڑھایا گیا ہے۔ حوضوں میں چالیس لاکھ گیلن (ایک گیلن۔ قریباً پانچ سیر) تیل سما سکتا ہے جو ایک سو پینتالیس میل کے فاصلے سے تیل کے چشموں میں سے نکال کر یہاں

پہنچایا جاتا ہے۔ چشمے نفت شاہ میں واقع ہیں۔ لوہے کے نل جو تین انچ
موٹی چادر سے بنائے گئے ہیں۔ اور اس لئے ان کا ہر ایک مربع انچ
اٹھارہ انیس من دباؤ برداشت کر سکتا ہے۔ جس تیل کو چشموں سے کرمان
شاہ کے کارخانے میں لاتے ہیں دنیا بھر میں معدنی تیل کے چشموں اور
کارخانوں کا اہتمام وانصرام اعلےٰ درجہ کی مہارت اور کثیر سرمایہ کے
صرف کا مرہون منت ہے۔ اور اس معاملہ میں ایران کی کارکردگی
اور کاردانی حریفوں سے کسی صورت میں کم نہیں۔ دور رضا شاہی کے
آغاز میں حکومت ایران کی مالیات کا حال ناگفتہ بہ تھا۔ اب حالات
روبہ اصلاح ہیں۔ بلکہ ایک بڑی حد تک ہو چکے ہیں۔ اس میں مٹی کے
تیل کی پیداوار اور آمدنی کو بہت بڑا دخل ہے۔ چنانچہ انتظام مذکور کو
رضا شاہ کے دہ سالہ کارنامے کا ایک شاندار جز وقرار دینا چاہئے۔ یہ
طویل نل اس راستہ سے لایا گیا ہے جو قدیم زمانے میں ایران کی ایک بڑی
شاہراہ تھی۔ اور بغداد سے چل کر شمال مشرقی ایران میں گزرتی ہوئی
سمرقند تک پہنچتی تھی ؂

موٹر کار اور لاری کا رواج

پہلے جب اس سڑک پر مسافروں کے
کاروان گزرتے تو کہیں کہیں
اونٹوں کے پنجر پاتے۔ مگر آج کل موٹر کاروں کے "کھنڈر" اور لاریوں کے
جلے ہوئے ذرّیات نظر آتے ہیں۔ ایران میں موٹریں اکثر وبیشتر بلکہ
قریبًا تمامتر امریکہ کی مسافت استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ موٹروں کی
کثرت بجائے خود ایرانی دولت میں نسبتًا فراوانی کی مظہر ہے اور یہ
بھی بتاتی ہے کہ وسائل آمد و رفت ترقی پر ہیں جو ظاہر ہے کہ تجارتی صنعتی
اور زراعتی ترقی کی شرط اولے ہے۔ اس سے عصر حاضر کے دوسرے آثار کا
پتہ چلتا ہے ؂

ٹین کے کنستروں کا کارخانہ

تیل کی گرم بازاری سے
ایک ضمنی صنعت بھی قائم
ہوگئی ہے۔ یعنی ہر سال پچاس لاکھ ٹین کے کنستروں کی ضرورت لاحق
ہونے کے سبب ان کی ساخت کا کارخانہ بھی بنایا گیا ہے۔ یہ بھی
کرمان شاہ میں ہے۔ خالی کنستروں سے کئی طرح کے کام لئے جاتے ہیں۔
مثلاً دیہات میں گھروں کی چھتیں اور ایک جگہ تو مسجد کے گنبد کو روپہلی
چمک دمک کا آئینہ دار بنانے کے لئے انہی کنستروں کے ٹین کا غلاف
بنا ہے ؂

سفر میں آسانیاں اور رہزنی کا سدباب

قدیم ایران میں سفر کی
مشکلات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ علاوہ ازیں مسافت طے کرنے میں سخت
دیر و دقت پیش آتی تھی۔ چنانچہ اونٹوں کا کاروان بغداد چل کر پورے پانچ
ہفتوں میں طہران پہنچتا تھا۔ اب موٹر کار میں یہ فاصلہ اڑتالیس گھنٹے میں
طے کرتی ہیں۔ رضا شاہ سے پہلے بلکہ عین ۱۹۲۵ء میں جب وہ تخت نشین ہوا
یہ امر معمولات سفر میں شامل تھا کہ کاروانوں پر رہزن حملہ کریں۔ چنانچہ یہ
لوگ مختلف علاقوں کے سرداروں کو محصول جان بخشی ادا کرتے اور جان و
مال سلامت لے جاتے تھے۔ لیکن آج شہنشاہ دولت ایران کا اسی ہزار
سپاہیوں کا لشکر نظم وضبط کا ضامن ہے اور گروہ جو خصوصیت سے رہزن واقع
ہوئے تھے رعب سلطانی تسلیم کرتے ہیں اور اسے موثر کرنے والی مشین گنوں کا
لوہا مانتے ہیں ؂

ایران میں ریلوے

کرمان شاہ کے شمال مشرق کی جانب وہ
ریلوے لائن زیر تعمیر ہے جس کا مقصد ارض
ایران کی شمالی اور جنوبی حدود کو آپس میں ملانا ہے یہ لائن بے حد پیچ و خم
کھاتی چلی آتی ہے۔ اور تین سال تک تکمیل کو پہنچے گی۔ کم از کم تعمیر کا
پروگرام یہی ہے کہ موسم گرما ۱۹۳۹ء میں ایک حصہ شمال کی طرف سے آتا
ہوا اور دوسرا جنوب کی سمت سے جاتا ہوا۔ طہران میں آکر مل جائے۔
ساری لائن کا طول نو سو میل ہے۔ یعنی شمالی سٹیشن جو بحیرہ کیسپین کی بندرگاہ
"بندر شاہ" پر واقع ہے۔ اس سے لے کر جنوبی سٹیشن تک جو خلیج فارس کے
ساحل پر بنایا جا چکا ہے۔ ہر دو حصص میں اس لائن پر ریل گاڑی کی
آمد و رفت جاری ہے۔ یعنی ان ٹکڑوں میں جہاں تعمیر ہر طرح سے
مکمل ہو چکی ہے۔ ایران کی اس ریلوے لائن کو بہت سی قدرتی
رکاوٹوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بالخصوص وہ جغرافیائی مشکلات جو
ایران کے سلسلۂ کوہستان کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔ ان پہاڑوں کا

رجحان مشرق سے مغرب کی جانب ہے اور ریلوے لائن کا راستہ شمال سے جنوب کی طرف ہے۔ اس لئے بہت سے مقامات پر پہاڑوں میں سرنگیں بنانی پڑتی ہیں۔ اور اکثر و بیشتر یہ لائن سیدھی نہیں چلتی بلکہ سانپ کی طرح پیچ و خم کھاتی ہے۔ اس ریلوے لائن کو استعمال میں لانے کے لئے خود لائن سٹیشن گاڑیاں انجن وغیرہ وغیرہ کل سامان پر دو سو لاکھ پونڈ یعنی قریبًا تین ہزار لاکھ روپیہ (تیس کروڑ) صرف ہوگا۔

بعض یورپی ماہرین کہتے ہیں کہ اقتصادی نقطۂ نگاہ سے یہ ریلوے ایک منفعت بخش کاروبار ثابت نہ ہوگی۔ مگر حال میں ایران نے روس کے ساتھ ایک تجارتی معاہدہ کیا ہے۔ اس کی رو سے قرار پایا ہے کہ وہ روسی مال جسے شمال سے جنوب کو لانا ہوگا۔ اسی ریلوے کی خدمات سے فائدہ اٹھائیگا۔ یہ ہے ایک صورت اس لائن کو ایک کامیاب کاروبار بنانیکی دوسری صورت اور ماہرین مالیات کی رائے میں نہایت کارگر وسیلۂ کامیابی یہ ہے کہ ریلوے حکومتِ ایران کی ملکیت ہے۔ اس میں سرمایہ دار تاجروں کی مالی بازی گری کو کام نہیں۔ حکومت حسب ضرورت کرایہ کی تعین کرے گی اور کرتی ہے۔ رہا تعمیر کے لئے سرمایہ تو اس کے لئے حکومت رضا شاہ نے "کھانڈ" اور "چائے" کی درآمد پر گراں قدر محصول لگا رکھا ہے اور وہ سب ریلوے پر خرچ کیا جاتا ہے۔ با ایں ہمہ ریلوے کو ابھی سے موٹر کاروں سے مقابلہ کرنے کی ضرورت پیش آنے لگی ہے۔ کیونکہ بحیرۂ کیسپین سے طہران تک موٹروں کے لئے سڑک موجود ہے مگر عہد حاضر نے جو سبیل موٹر اور ریلوے کے غیر اقتصادی مقابلے بلکہ مجادلہ سے عہدہ برآ ہونیکے لئے نکالی ہے۔ رضا شاہی حکومت اس سے پورا کام لے گی۔ یعنی دونوں میں تعاون کی راہ بذریعہ قانون نکالے گی۔ اور مادی ترقی کے ان عظیم الشان وسائل سے مغرب کے نقشِ قدم پر چل کر مملکتِ ایران کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچائے گی۔

افیون مٹی کے تیل سے دوسرے درجے پر

حکومت مرکزیہ کا وسیلہ آمدنی فروخت افیون ہے۔ ایران کے اندر متعدد زرخیز وادیوں میں اور بالخصوص کرمان شاہ کے مضافات میں کوکنار (پوست) کی کاشت کثرت سے کی جاتی ہے اور افیون کی ساخت کا ایک عظیم الشان کارخانہ کرمان شاہ میں ہے۔ شخصی طور پر کسی ایرانی کو افیون بنانے کی اجازت نہیں۔ یہ سارا کام سرکاری اجارہ داری سے کیا جاتا ہے۔ اور ہزاروں من افیون ہر برس چین کو بھیجی جاتی ہے۔ افیون کی باربرداری کے لئے "اینگلو ایرانیٹن کمپنی" کے اپنے جہاز ہیں۔ اور روانگی کی بندرگاہ آبادان ہے۔ افیون سے حکومت ایران کو گرانبہا مالی منافع حاصل ہوتا ہے اور جیسا کہ ہم نے لکھا تیل کے بعد یہ دوسرا وسیلۂ آمدنی ہے۔

خاتمۂ کلام

الغرض رضا شاہ کی بالغ نظری کاردانی اور کارکردگی نے فقط دس برس کی قلیل مدت میں ایران کی کایا پلٹ دی ہے وہ مملکت جو رضا شاہ سے پہلے صحیح معنی میں ایک آزاد دولت کہلانے کا استحقاق کھو بیٹھی تھی۔ روس اور انگلستان کی قید و بند میں ملی ہلاکت سے ہم آغوش تھی۔ اب مجلس اقوام عالم میں ایک بلند مرتبہ نشست پر متمکن ہے اور ایشیا کیلئے بالعموم اور ہندو افغانستان اور عالمِ اسلامیان کیلئے بالخصوص سرمایہ صد افتخار بن گئی ہے۔

(مفتی غلام جعفر بی اے)

رُباعی

دنیا دیکھی! دنیا کی بے رَوَانی دیکھی! اپنوں کی غیروں پہ مہربانی دیکھی!

اے کاش! کوئی لمحہ تو ہنستے جاتا خوشیوں میں یہاں شادمانی دیکھی!

(مطلوب حسن منصور (بدخشی))

محکمہ تعلیم پنجاب نے نیرنگ خیال کو تمام منظور شدہ علمی و ادبی رسائل میں شامل کرلیا ہے اور تازہ سرکلر میں نیرنگ خیال کا نام موجود ہے۔

مقالہ

مسلمانوں کے عہد میں فنِ موسیقی کا عروج

(از جناب ظفر قریشی بی اے دہلوی)

{ہندوستان کے لئے تو موسیقی "برہمانَدا" (ندائے الٰہی) کے مترادف ہے۔ کرشن کی بانسری کے نغمات اسرارِ الٰہی۔ شیو کا "ڈمرو" دنیا پر زندگی کے راز منکشف کرنے والے راگوں کا پیدا ہونا۔ اس کی سوتی ہوئی استری پاروتی کا شیو کی وینا (بین) پر رقص کرنا دراصل مظاہرات تھے۔ اس روحانی مسرت و بہجت کے اس ذہنی ارتفاع کے جنہیں روحانی و جسمانی مسرتوں کا ماحصل سمجھا جاتا ہے۔ وہ کیفیت جسے فیثاغورس "اجرامِ فلکی اور کائنات کی ہم آہنگی" اور فلاطون کے نزدیک "جو ذہنی ترنم" تھا وہ ان مظاہرات اصنامی۔ ان باطنی تمثیلوں اور تعبیروں میں مضمر تھا —— ؟ بانسری کی سریلی تانیں ہوں یا پکھاوج کی بھاری آواز۔ وینا کی نرم و نازک تڑپ ہو یا ستار کی کپکپاہٹ سب کا مقصد وحید انسان میں روحانی و جسمانی مسرت کا اجتماع پیدا کرنا تھا۔ رومان اور مذہب کا ایسا پرزور و موثر امتزاج جسے روحانی جسمانی سرخوشی و ہم آہنگی کا نام دے سکیں —— ایک وہ حالت جو نصب العین تھا یونان اہلِ فلسفہ کا —— !! ظفر}

ہندوؤں کے بعض کمالات کے مسلمان بھی معترف تھے۔ صدیوں پہلے مسلمانوں کا ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلق قائم ہوگیا تھا اور ذاتی میل جول کی وجہ سے تمدنی آمیزش بھی ترقی پا رہی تھی ایک دوسرے کو سمجھنے کے ذرائع بھی وسیع ہو رہے تھے۔ نویں صدی عیسوی میں بغداد میں ایک زبردست بحث چل رہی تھی کہ سفید اقوام زیادہ تمدن و شائستہ اور کمالات سے آراستہ ہیں یا کالے رنگ کی قومیں اور دونوں کے کمالات کا توازن کیا ہے۔ اس بحث میں بڑے بڑے علما و فضلا حصہ لے رہے تھے اور یہ بحث عرصہ سے جاری تھی۔ اس بحث کی تفصیلات کا ہمیں علم نہیں مگر جاحظ نے جو اس عہد کا ایک باوصف اور صاحب طرز مصنف تھا ایک رسالہ لکھا تھا۔ "کالی قوموں کا گوری قوموں پر تفوق" اس سے ہمیں اس دلچسپ تنازع کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ جاحظ نے لکھا ہے کہ تمام کالی اقوام میں ہندوستانی اپنی غیر معمولی دماغی قوت اور کسب کمال کے باعث ممتاز ہیں جاحظ کے اس رسالہ کو اگر اہلِ ہند کے فنی و علمی کمالات کا مبالغہ آمیز ڈھنڈورا کہیں تو بجا ہے کیونکہ سارا رسالہ انہیں باتوں سے لبریز ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"مجسمہ سازی۔ سنگتراشی۔ رنگوں کی تصویریں بنانا اور تعمیر کے فنون میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان لوگوں نے شطرنج نامی ایک کھیل ایسا بنایا ہے جسے دماغی ورزش کہیں تو بجا ہے۔ ان لوگوں کو تلواریں بنانے اور ان کو گھڑنے میں کیا ہی کمال حاصل ہے۔ ان کی موسیقی بھی سحر طراز ہے ...."

اسی قسم کے الفاظ میں ایک عرب نقاد و مصنف نے اہلِ ہند کے فوقانی و فنی و ذہنی عروج و کمال کا اعتراف کیا ہے۔ اور اس وقت کی تہذیب ہند کے روشن پہلو نمایاں کئے ہیں :

جب جانب شمال مغرب سے ہندوستان میں مسلمان آئے تو اپنے ساتھ اور کمالات کے ساتھ موسیقی کا بھی ایک بڑا اچھا ذوق لائے اور موسیقی ان کی کیا تھی عرب اور ایران کی موسیقی کا ایک نیا امتزاج جس نے ہندوستان کے ترنم میں مل کر وہ زمزمہ آرائی کی کہ زبان تعریف سے قاصر ہے :-

بغداد۔ وہ شہر عروسی۔ وہ بلدیہ شہر و فسانہ جو ہارون رشید کے عہد زریں ختم ہونے کے بعد بھی اسلامی تہذیب اور علوم و فنون کا مرکز تھا۔ بہت دور تھا۔ مگر ایک ایسی گھلی ملی تہذیب جو بغداد کے عربی تخیل سے پیدا۔ ایران کی ہواؤں سے پرورش یافتہ اور ہندوستان کے سحر و گداز سے آسودہ تھی ساحل بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر اندلس میں اسلامی تہذیب عروج پر تھی۔ فنون کی قدر دانی اور غیر مہذب یورپ کو زیور علم سے آراستہ کرنا "خیر جاریہ" شیوہ عام تھا۔ اگر اندلس کا سلطان زریاب موسیقی کے علم اور ہنر کا باکمال تھا۔ تو دوسری طرف بغداد کا ابراہیم موصلی بھی اپنے فن میں کامل دستگاہ رکھتا تھا۔ تمام اسلامی ممالک میں ایک معین تہذیب نشوونما پا رہی تھی۔ عربوں کی موسیقی دانی ان کی فطری شعر پسندی سے اور بھی اجاگر ہو گئی تھی۔ تمام اسلامی ممالک میں نغمہ جانفزا ایک ہی اصول و قماش کے پیدا ہو رہے تھے جب ایران سے رابطہ ہوا تو عہد قدیم کی موسیقی نے اس موسیقی کے ساتھ مل کر ایک اور طرب پیدا کیا۔ یہ وہ بنیاد تھی جس کے طفیل سلاطین اسلام کو ہندوؤں کی موسیقی کے سمجھنے میں مدد دی اور جب ہندوستان پر اسلامی حکومت ہوئی۔ تو عربی۔ ایرانی۔ ترکی اور عجمی تخیلات۔ تہذیب اور موسیقی کے پرتو پڑنا شروع ہوا ہندوؤں کی موسیقی نے اس عربی اور ایرانی موسیقی کے ساتھ مل کر ایک نیا جنم اختیار کیا جس کے اثرات آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اسلامی اور ہندی موسیقی کی ہم آہنگی نے نہ صرف فن موسیقی کو نئے نئے اصول سے آشنا کر دیا۔ بلکہ بیسیوں مزامیر اور موسیقی دان اور صاحب طرز باکمال بھی پیدا کر دیئے جن کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

نئے نغمات اور نئے باجوں سے لوگوں کے کان آشنا ہو گئے۔ جہاں لوگ "وینا" "بین" "پکھاوج" کو جانتے تھے وہاں "دلربا"۔ "رباب" اور "عود" کو بھی پہچان گئے۔ حضرت امیر خسرو نے "سہ تار" کی ایجاد کی جو کثرت استعمال سے "ستار" بن گیا۔ حضرت امیر خسرو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک عجوبہ روزگار ہستی تھے دنیا کا کوئی علم اور کوئی ہنر اس عجیب غریب ترک بچہ سے بچا ہوا نہ تھا علوم و فنون کا مخزن تھا۔ شاعری میں ید طولےٰ۔ موسیقی میں استاد۔ ایجاد و اختراع میں باکمال صناعوں کا استاد۔ صاحب حال اور صاحب قال۔ دنیا ایسا فاضل ادب و شعر اور صنائع دوبارہ پیدا نہ کرے گی۔ حضرت امیر خسرو نسلاً لاچین ترک تھے۔ اور ہندوستان میں آ کر حضرت نظام الدین اولیا کے مرید ہوئے۔ جن کے روحانی فیوض نے ان کی طبیعت رسا کو اور بھی روشن و منور کر دیا حضرت امیر خسرو کو ہندوستان کی ایک ایک ادا بھاتی تھی۔ انہیں یہاں کے موسموں۔ یہاں کے رواجوں۔ یہاں کے لوگوں کی رہن سہن سب سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ملک اور اس ملک کی خوبصورت چیزوں کو باہم کر ایک کرنے کے مشتاق رہتے تھے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اسلامی عہد کا یہ مصنف شعری ذوق فطری طباعی و ذہانت اور علوم و فنون کا گہوارہ ہونے کے باعث ایک عدیم النظیر شخصیت تھی تو بجا نہ ہوگا۔ اس میں لیونارڈ کی سی نزاکت خیال۔ اور سر فلپ سڈنی کی سی رعنائی حیات پائی جاتی تھی۔ آرٹ اور لٹریچر نے اس کو ایک عجیب و غریب چیز بنا دیا تھا۔ حضرت امیر خسرو نے جہاں اور چیزیں موسیقی میں اپنی ذہانت سے ایجاد کیں ان میں "خیال" "اور قوالی" ان کی خاص یادگار رہیں ہیں۔ اس سے پہلے قوالی کی قماش کی چیز سے یہاں کے موسیقار ناواقف تھے۔ اہل ہند کے صاحب دل لوگوں کے لئے یہ طریقہ عبادت مزامیر بہت ہی مرغوب معلوم ہوا۔ اصل میں یہ چیز حضرت نظام الدین اولیا کی روحانی مسرت و آسودگی روح کیلئے جاری کی گئی تھی جسے سن کر حضرت وجد میں آ جاتے تھے۔ پروفیسر یون نوگوچی شہرۂ آفاق جاپانی شاعر جب دہلی آیا تو اسے قوالی کی ایک محفل خاص میں شریک کیا گیا میں نے اس قسم کے گانوں کو کبھی نہ سنا تھا۔ اور نہ صوفیا کی محفل دیکھی تھی اس کے دل پر اس کا اثر ہوا اور اس نے بڑے اہتمام سے قوالی کے اثر انداز محاسن کا اعتراف کیا ہے۔

حضرت امیر خسرو نہ صرف خود اچھے موسیقی داں تھے۔ بلکہ گیت اور دوہے ہندی زبان میں بے نظیر لکھتے تھے۔ فارسی غزلیات ان کی شہرت دوام حاصل کر چکی ہیں۔ ہندوستان کے دیہات کی تصویریں کھینچنا ان کا کمال تھا۔ دیہاتی لڑکیاں امیر خسرو کے اشعار گاتی تھیں۔ جن میں جذبات و تخیلات کی وہ روانی اور وہ تصویر کشی ہوتی تھی۔ کہ انسان سنکر بے اختیار ہو جاتا ہے۔ آجکل بھی حضرت امیر خسرو کے ترانے ہندوستانی اہل دیہات کی زبانوں کے چڑھے ہوئے ہیں۔ جب شمالی ہند میں لڑکیاں ساون کی رت میں آموں کے درختوں پر جھولا ڈالتی ہیں تو حضرت امیر کے گیتوں سے جنگل گونجنے لگتے ہیں۔ لوگوں کو زمانہ قدیم سے شعر و موسیقی سے کیسا لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ اردو زبان کی تاریخ کے مطالعہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اردو کا پہلا نام "ریختہ" تھا۔ جس کے لفظی معنی "نغمہ" یا "گیت" کے ہیں۔ یعنی اردو زبان گیتوں کے اظہار

مطالب کے ذریعہ بنائی گئی تھی۔ اردو دراصل برج بھاشا اور فارسی کی آمیزش سے بنائی گئی تھی۔ اور ضرورت تھی کہ اس کے ادب کو ایسے ہی جواہر ریزوں سے مالا مال کیا جائے۔ جو ایرانی۔ عربی۔ ترکی تہذیبوں کے ساتھ خالص ہندی جذبات اور ہندوستانی تمدن کے بھی آئینہ دار ہوں۔ بادشاہ وقت کے دربار اور اہلِ علم فارسی ترکی سمجھتے تھے۔ مگر عوام کے لئے فارسی اشعار و ادب کا سمجھنا دشوار تھا۔ اس لئے ایک ایسی گھلی ملی زبان کا رواج دیا گیا۔ جو عوام وخواص دونوں کے لئے قابلِ فہم ہو اور ملکی وغیر ملکی جذبات وحسیات کی ترجمان ہو۔

ہر تعمیر کے ساتھ خرابی اور ہر خرابی میں صورتِ تعمیر مضمر ہوتی ہے۔ بعض حوادث وخرابات اپنے ساتھ تحسین وتعمیر کا پیغام بھی لے کر آتے ہیں۔ یہی حال دکن پر علاء الدین خلجی کے حملہ کا ہوا۔ حضرت امیر خسروؒ اسی بادشاہ کے دربار میں تھے۔ مسلمانوں کو یہ خبط رہا ہے کہ وہ اہلِ علم اور اہلِ ہنر کی دلجوئی اور قدر دانی میں جویا رہتے ہیں۔ حملہ کے بعد دستکاروں۔ صناعوں۔ اہلِ حرفہ اور علما وفضلا کے لئے عام معافی اور حفاظت کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔ اور زمانہ امن میں تو دربار کی طرف سے قدر دانی وعزت افزائی میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی جاتی تھی۔

جنوبی ہند سلمان حملہ آوروں سے محفوظ رہنے کی وجہ سے نسبتاً زیادہ پرامن فضا میں سانس لیتا رہا تھا۔ اس لئے وہاں کی تہذیب بہت بڑی حد تک غیر ملکی مراسم ونفوذ و اثر سے پاک رہی۔ ویدوں کے عہد سے یہاں کے لوگ جس پرانی تہذیب کے علمبردار چلے آ رہے تھے۔ وہ یہاں اب بھی موجود تھی۔ علاء الدین خلجی کے آنے سے یہاں کے اہل ہنر اور اس کے ساتھ آئے ہوئے صناعوں کا ایک اختلاط شروع ہوا۔ اور دو تہذیبوں کا ایک دھارا بہنے لگا۔ جس کے نتائج سے بعد کی نسلیں برابر اثر پذیر ہوتی رہیں۔

سترھویں صدی کے آخری زمانہ میں فارسی زبان میں ایک کتاب "راگ درپن" کے نام سے تیار ہوئی تھی اس میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ حضرت امیر خسروؒ کی ذہانت اور موسیقی دانی کا پایا گیا ہے۔ جو سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں وقوع پذیر ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ جنوب ہند کا مشہور گویا۔ گوپال نائک ایک پالکی میں سوار جنگل میں سے گذر رہا تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی کو معلوم ہوا کہ وہ یگانہ روزگار اس کی رہائش گاہ سے اسقدر قریب ہے۔ نہ معلوم کب اس سے ملنے کا اتفاق ہو۔ سپاہی بھیج استاد کو بلوا منگایا۔ جب حضرت امیر خسروؒ نے سنا کہ گوپال نائک دربار میں باریاب ہو گیا ہے تو آپ نے سفر کا بہانہ کر کے چند روز کے لئے دربار سے رخصت حاصل کر لی۔ دراصل یہ طریقہ تھا گوپال نائک کے گانے کو خفیہ طریقہ سے سننے کا۔

جب دربار ہوا تو امیر خسروؒ کسی ترکیب سے شاہی تخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ چھ روز تک گوپال نائک نے دربار خلجی میں اپنے پورے کمالات اور جوہر دکھائے۔ ساتویں روز حضرت امیر خسروؒ عام دربار میں آ گئے خفیہ طریقہ سے وہ اس استاد کی موسیقی کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ ہی گئے تھے اس لئے مقابلہ کی ٹھانی۔ امیر خسروؒ کے کہنے پر نائک نے اپنی وینا کے تاروں پر انگلیاں چلانی شروع کیں اور وہ راگ پیدا کیا جو اس نے دربار کے پہلے روز دکھایا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ نے اپنا ستار اٹھایا اور کچھ باریکیاں پیدا کر کے اسی راگ کو خود بجا کر دکھا دیا اور طعن کے لہجہ میں کہا ——— ! "یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے لو میں نے بجا کر دکھا دیا۔ اس میں کیا استادی ہے۔ بازاری گویئے ایسا کر سکتے ہیں" گوپال نے دوسرا کمال دکھایا تو حضرت امیرؒ نے اس کو بھی ٹھیک کر کے دوبارہ پیش کر دیا۔ جب گوپال اپنی ساری فضیلت دکھا چکا تو حضرت امیرؒ نے کچھ فارسی غزلیات الاپ کر دکھائیں۔ شیراز کے پُرتکلف صحن ہائے باغ میں نازنینانِ خود آرا کا نظارہ اور عاشق صادق کا درد انگیز اسلوب اظہار ایسا بیساختہ بیان کیا۔ کہ سننے والوں کے دل جوش ومستی سے لبریز ہو گئے۔ لوگ ان نغمات کے اسرار و رموز پر سر دھنتے تھے گوپال بھی یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ حضرت امیر خسروؒ نے کس کمال اور نزاکت کے ساتھ اپنی موسیقی دانی اور شاعرانہ افتخار طبع کا مظاہرہ کیا۔ وہ ان کے صاحب کمال ہونے کا معترف ہو گیا۔

ان دونوں استادانِ فن کے مقابلوں کے اور بھی بہت سے قصے اور لطائف زبان زد عام ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گوپال نہ صرف ایک عمدہ گویا اور موسیقی داں تھا بلکہ زبردست عالم اور نہایت شستہ بحث کرنے والا بھی تھا۔ شاید یہی وہ استاد ہے جس کے بارے میں حضرت امیر خسروؒ نے اپنی ایک نظم میں ذکر کیا ہے کہ ایک استاد موسیقی گانے اور شاعری کے باہمی مقابلہ کے بارے میں مجھ سے بحث کرنے کے لئے آیا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ نے شعر کی طرفداری کی۔ اور گوپال نے شعر پر موسیقی کی فوقیت کا علم بلند کیا۔ ہندوؤں کا عقیدہ تو یہ ہے کہ انسان کو گویا بننے سے پہلے عالم بننے کی ضرورت ہے۔ یعنی پہلے پنڈت بننے پھر موسیقی کی علمی و عملی

تعلیم حاصل کرے تب جا کر وہ "گندھروا" یا "نائک" کے بلند درجہ تک پہنچ سکتا ہے

بعد کے مسلم بادشاہوں کے عہد میں بھی فن موسیقی کی ہمت افزائی ہوتی رہی محمد تغلق نے دولت آباد میں ایک دائرہ نما ایوان تعمیر کرایا تھا۔ جہاں گانے والے اور ناچنے والے جمع رہتے تھے۔ موسیقی کا مظاہرہ کرتے۔ درباری مہمانوں کو خوش کرتے اور اپنے کمالاتِ فن دکھاتے تھے۔

بادشاہ زین العابدین جسے "بادشاہ" کے لقب سے ہندو مسلمان جانتے تھے اور جو بہت ہی عالم و فاضل بادشاہ دکن گذرا ہے نہایت وسیع معلومات اس فن کے بارے میں رکھتا تھا۔ وہ سنسکرت کا فاضل اور تبت کی بہت سی زبانوں کا عالم تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وہ مشہور بادشاہ گذرا ہے جسے سلطان شرقی جونپوری کے نام سے تاریخ جانتی ہے۔ جو ایک نہایت اعلےٰ دماغ حاکم وقت ہونیکے ساتھ ساتھ موسیقی کا بہترین استاد تھا۔ عطائے شاہی کے ساتھ بانسری کا بھی ذوق رکھتا تھا۔ جونپوری ٹُر اسی بادشاہ کے نام پر آج تک معنون پائی جاتی ہے

مگر مغلوں نے جس قدر ترقی اس فن کو دی شاید ہی کسی وقت میں اسے حاصل ہوئی ہو۔

مغل علم دوست اور ہنر پرور تھے۔ ان کے سایۂ عاطفت میں صناع معمار۔ عالم۔ شعرا۔ مورخ۔ مصور۔ حکیم۔ وید۔ مجسمہ ساز۔ کاریگر غرض ہر فن اور پیشہ و شغف کا آدمی پرورش پا رہا تھا۔ اور درباری ہمت افزائی سے ہندوستان کو ان صاحبان کمال کے کاموں سے وہ وہ فوائد حاصل ہو رہے تھے کہ اس سے قبل کبھی حاصل نہ ہوئے تھے۔

اکبر اعظم نے اس بارے میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا۔ میاں تانسین جن کی قبر گوالیار میں ہے۔ اکبر کے نو رتن میں شامل تھے۔ اور ان کی یگانۂ روزگار ہستی کو آج بھی لوگ قدر و منزلت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مغل سلطنت کے بانی بابر کو نہ صرف بہزاد جیسی آنکھ ملی تھی جو تصویروں اور نقوش کی باریکیاں سمجھ سکتی تھی بلکہ موسیقی سے بھی اسے شغف تھا۔ چنانچہ وہ اپنی تزک میں جگہ جگہ گانے والوں اور ان کے کمالات و مراسم کا بہت شوق سے ذکر کرتا ہے۔ جو لوگ "قانون" اور دیگر باجوں کو بجا سکتے تھے۔ ان کے حالات اور دیگر اہل موسیقی کا تذکرہ اس کے اندرونی رجحانات کو ظاہر کرتا ہے۔

مغل درباروں کی شوکت اکبر کے زمانہ میں سب سے زیادہ رونق پر تھی اور اکبر نے فنون کی ہمت افزائی کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ابوالفضل اپنی "آئین اکبری" میں کم و بیش تیس استادان موسیقی کا تذکرہ لکھتا ہے۔ جن کا دربار سے تعلق تھا۔ مگر ان سب میں تانسین میاں کا نام سب سے زیادہ نمایاں اور اہم درجہ رکھتا ہے تانسین ایک حقیقی و تاریخی ہستی تھی جسے فنِ موسیقی کا مربّی اعظم کہیں تو بجا ہے۔ کوئی تاریخ نہیں ہے۔ جس میں اس بے نظیر عالی دماغ موسیقی دان کا تذکرہ نہ ہو مگر اس کے مداحوں اور جاہل پیروؤں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوتا رہا ہے۔ اور پایا جاتا ہے۔ جس نے اس کی ذات سے ایسی بے سروپا باتیں منسوب کر دی ہیں۔ کہ لوگ اس تاریخی ہستی کے وجود پر ہی شبہ کرنے لگے ہیں۔ میاں تانسین گوالیار کے پیدائشی ہندو تھے۔ اور راجہ رامچند راجہ بندیلا کے ہاں ملازم تھے۔ جس جگہ تانسین پیدا ہوئے تھے وہ صدیوں سے آرٹ کی پرورش گاہ ہونے اور گہوارہ ہونے کے باعث مشہور رہی ہے۔ آج تک گوالیار میں بیسیوں نادر گانے والے اور ساز بجانے والے پائے جائیں گے۔ گوالیار کا سب سے بڑا اور مشہور محسن موسیقی راجہ مان سنگھ گذرا ہے۔ اور وہ اپنے ہم نام اکبر اعظم کے راجہ مان سنگھ کی طرح ایک عالی دماغ اور کسب کمال کی شائق ہستی تھی۔ اس نے "دھرپد" طرز کا گانا ایجاد کیا تھا۔ تانسین کے عہد میں بھی فن موسیقی عروج پر تھا اور قدر افزائی کا یہ عالم تھا کہ ایک روایت کے بموجب تانسین کو اس کے راجہ نے صرف ایک گانے پر ایک لاکھ "ٹنکا" (سونے کا سکہ رائج الوقت) عطا کیا تھا۔ جب اکبر کو ایسے یگانۂ روزگار ہستی کا پتہ چلا تو اس نے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ کہا جاتا ہے کہ جب میاں تانسین دربارِ اکبری کے لئے روانہ ہونے لگے۔ تو راجہ رامچند راپنے محبوب گویئے کی جدائی پر بہت مغموم ہوئے اور اس کی پالکی کو کندھا دیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے موسیقی کی عزت اور اس کے اہل کمال کا وقار کرنے کیلئے کتنا بڑا دل قدرت نے دیا تھا۔

گوالیار میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ اکبر نے تانسین کی اس قدر دلجوئی کی کہ تانسین نے اسے اپنا گرو مان لیا۔ اور اسلامی عقیدہ اختیار کر لیا اور جیسا کہ صاحبان کمال کا قاعدہ ہے تانسین کو بھی گوالیار کی یاد ستاتی تھی اور وہ بار بار واپس جانے کی اجازت چاہتے تھے۔ اگرچہ وہ اب راجہ رامچند کی ملازمت میں نہ تھے مگر وہ ان کے سب سے پہلے محسن تھے۔ اس لئے ابھی تک ان کے دل میں راجہ صاحب کی عزت و محبت جاگزیں تھی اس کا اظہار یوں ہوتا تھا کہ وہ اکبر اعظم کو کبھی سیدھے ہاتھ سے سلام نہیں کرتے تھے بلکہ الٹے ہاتھ سے

سلام کرتے تھے۔ سیدھا ہاتھ انہوں نے اپنے پہلے آقا راجہ رامچندر کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ مگر اکبر اعظم بھی دلجوئی۔ عزت افزائی اور قدر دانی میں راجہ سے کم نہ رہنا چاہتا تھا اور طرح طرح سے تانسین کو خوش کرتا رہتا تھا۔ ایکدن کا ذکر ہے کہ اکبر اعظم آموں کے ایک باغ میں ٹہلتے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ میاں تانسین نے دیکھا کہ ایک درخت پر بہت رسیلا اور خوبصورت آم لگا ہوا ہے شاخوں میں جھول رہا ہے۔ تانسین کی اس پر نیت آگئی اور اس کی طرف اچکنے لگے۔ مگر وہ اتنا اونچا تھا کہ ان کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اکبر نے ادھر اُدھر دیکھا قریب کوئی ملازم نظر نہ آیا۔ کہنے لگے۔ آؤ میری پشت پر سوار ہو کر کھڑے ہو جاؤ اور آم توڑ لو۔ تانسین ادب و عزت کے اس مظاہرے سے اس قدر مسرور بلکہ مجوب ہوا کہ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر تعظیم کی۔ کورنش ادا کی اور اس کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو گئی کہ اکبر جیسا جلیل القدر شہنشاہ ہند بھی اس کے کمال فن کی اس قدر عزت کرتا ہے۔ کہ راجہ رامچندر کی یاد وہ اپنے دل سے بھلا سکتا ہے یا اکبر کو نعم البدل سمجھ سکتا ہے۔ اس کے بعد سے اس نے سیدھے ہاتھ سے سلام کرنا شروع کر دیا۔

اکبر اعظم کا دربار تو علم و ہنر کی آماجگاہ تھا ہی اور مسلمان بادشاہوں کے دربار بھی موسیقی کی ترقی کے لئے وقف تھے۔ سلطان عادل شاہ بیجاپوری خود بہت اچھا گویا تھا۔ اور کئی سُر اس نے خود ایجاد کئے تھے۔ جب اکبر اعظم نے ایک ایک امیر کو دربار بیجاپور میں سفیر بنا کر بھیجا۔ تو اس کے ساتھ کچھ گویئے بھی روانہ کئے تھے۔ تاکہ وہ ابراہیم عادل شاہ سے اس کی ایجادات موسیقی سے کچھ کسب کریں۔

موسیقی کا ذوق تقریباً عام ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ نایاب موسیقی داں پائے جاتے تھے۔ تانسین کی زندگی کا ایک اور واقعہ ہے کہ اس نے سُنا کہ بلگرام میں کوئی گویا رہتا ہے۔ جسے اس کے اعلےٰ کمال کے باعث لوگ (مدھا نائک) کہتے تھے۔ تانسین نے سوچا کہ اس کے پاس چل کر کچھ حاصل کرنا چاہیئے۔ وہ بھیس بدل کر روانہ ہوا تاکہ بلگرام پہنچکر کچھ معلوم کر سکے۔

ابھی وہ شہر میں داخل بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ باہر ایک کنوئیں کے پاس پیپل کے درخت کے نیچے سستانے کو بیٹھ گیا۔ کیا دیکھا کہ گاؤں کی کچھ لڑکیاں اپنی گگریاں لئے۔ ڈول رسی لٹکائے کنوئیں پر آئیں۔ اور پانی بھرنے لگیں۔ تانسین نے دیکھا کہ ایک لڑکی نے کنوئیں میں ڈول ڈالدیا اور پانی بھرنے لگی۔ یکایک کنوئیں کی چرخی میں سے رگڑ کھانے کی بہت سخت اور بھدّی آواز نکلنے لگی۔ راہ چلتے کو تو یہ آواز لوہے کی چرخی کی چوں چوں معلوم ہوتی اور وہ کچھ دھیان نہ کرتا مگر ایک لڑکی جو قریب ہی گگری لئے کھڑی تھی۔ چرخی کی اس بانگ بے ہنگام پر بہت جھلائی اور اپنی گگری مینڈ پر پٹک کر بولی ——

"ارے! کمبخت کیسی بے تکی آواز نکلتی ہے!"

تانسین میاں کے کان کھڑے ہو گئے۔ سوچنے لگے۔ جس جگہ کی گنوار لڑکیوں کے کان موسیقی سے اسقدر آشنا اور ذوق ترنّم و آہنگ اس درجہ شائستہ و لطیف ہوں۔ وہاں کے استادوں کے تو کیا ہی کہنے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تانسین نے کان پکڑا اور بلگرام کے استاد سے ملے بغیر واپس آگیا۔ کہ ایسا نہ ہو اس کی جگ ہنسائی ہو جائے ——!

یہ واقعہ درست ہو یا نہ ہو یہ تو ضرور ماننا پڑے گا کہ اس وقت موسیقی کا ذوق عالمگیر ہو گیا تھا۔ اور لوگوں میں ایک عام شائستہ مذاق ترنّم پایا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ گھر گھر موسیقی کا چرچا اور قدر دانی تھی۔

آخری بادشاہوں میں محمد شاہ رنگیلے (دہلی) اور سلطان فن واجد علی شاہ (لکھنؤ) نے فن موسیقی کو جس اوج پر پہنچایا اور ان کے علاوہ دیگر مسلمان رؤساء و امرا نے وقتاً فوقتاً فنِ موسیقی کو باوجود مذہبی مخالفت کے جس طرح نوازا وہ مسلمانوں کی ہنر پسندی اور فطری فن نوازی کا زندہ ثبوت ہے۔

(ظفر قریشی)

لمعاتِ کوکب

(از جناب نواب پیارے مرزا صاحب کوکب رئیس اعظم لکھنؤ)

مری دنیا مری جنت مرے پیمانے میں
حشر بھی نشر بھی ہوگا مرا میخانے میں

توبہ ٹوٹی ہے یہ کس رند کی میخانے میں
موج مے لیتی ہے انگڑائیاں پیمانے میں

منتقل ہوگیا افسانے سے افسانے میں
سوزِ دل بنکے دُھواں شمع سے پروانے میں

دیکھ کر عکس وہ آئینے میں فرماتے ہیں
بستیاں یونہیں سما جاتی ہیں ویرانے میں

شمع سر دھنتی ہے پروانہ جلا کرتا ہے
کوئی تو بات ہے ایسی مرے افسانے میں

دوست بن بن کے وہ دھوکے تو نہیں دیتا ہے
کم سے کم ایک صفت ہے یہی بیگانے میں

اک نظر زندگیٔ عشق پہ کیوں ڈال نہ لوں
کوئی گنجائشِ ترمیم ہو افسانے میں

جیسے گھبرایا ہوا ہو کوئی معشوق کہیں
یوں تمنا ہے مرے دل کے نہانخانے میں

وہ مجھے منزلیں قربت کی عطا کرتا جائے
اور میں اپنے کو سمجھتا رہوں بیگانے میں

ہر نفس شعلہ بداماں ہے۔ سزا ہے اس کی
دو گھڑی بیٹھ گیا تھا کبھی میخانے میں

مٹ گیا دل مگر آثار مٹائے نہ مٹے
اب بھی کیا کچھ نہیں اُجڑے ہوئے کاشانے میں

اک پتنگے میں یہ احساسِ وفا کے جذبے
عشق نے روح نئی پھونک دی افسانے میں

ذرے لَو دیتے ہیں یا آگ لگی ہے کوکب
اک چمک سی وہ نظر آتی ہے ویرانے میں

آئینۂ خیال

(از جناب منور آغا صاحب منور۔ لکھنؤ)

بہار آئی ہے اپنے وقت پر صحنِ گلستاں میں
یہ میری خوبیٔ قسمت کہ میں ہوں قیدِ زنداں میں

نہ برگِ گل کے دامن پر نہ اوراقِ پریشاں میں
میری قسمت کا لکھا ہے مرے چاکِ گریباں میں

نہ شمعیں ہیں نہ پروانے نہ گل بزمِ خموشاں میں
نئی دنیا نہاں ہے عالمِ گورِ غریباں میں

مبارک ہو مبارک ہو اسیرانِ جنوں تم کو
بہار آئی گلستاں میں بہار آئی گلستاں میں

ہر اک ذرہ پریشاں ہے ہر اک قطرہ میں طوفاں ہے
اثر اب بھی یہ باقی ہے مری آہِ پریشاں میں

فلک اے مرکزِ ظلم و جفا اے دشمنِ قسمت
گرفتارِ بلا کیوں ہوں میں آب و گل کے زنداں میں

تمناؤں میں دل کی آج اک عالم ہے محشر کا
بہار آئی ہے شاید فصل بدلی ہے گلستاں میں

نہ کوئی ناخدا اپنا نہ کوئی رہنما اپنا
مری کشتی پڑی ہے قلزمِ ہستی کے طوفاں میں

منور گوشِ دل سے کیا سنوں ناصح کی باتوں کو

جلوۂ جمال

از جناب اسد صاحب ملتانی

رخ پردۂ ظہور میں پنہاں کئے ہوئے
پھرتے ہو اک زمانہ کو حیراں کئے ہوئے

دن ہے کہ ہے نقاب تمہارا اٹھا ہوا
شب ہے کہ تم ہو بال پریشاں کئے ہوئے

ہے کائناتِ شرح تمہارے جمال کی
راز حیات زینتِ عنواں کئے ہوئے

خود بیں ہو تم تو مجھ کو مٹانے سے فائدہ
میں بھی تو ہوں تمہیں کو نمایاں کئے ہوئے

ابتک گماں میں ہے دل گم گشتہ تلاش
جلووں کو ہو تم اس قدر ارزاں کئے ہوئے

پھرتا ہے کون تیرگیٔ شش جہات میں
خورشید کا چراغ فروزاں کئے ہوئے

یہ کون آگیا چمنِ کائنات میں
زیبِ بدن لباسِ بہاراں کئے ہوئے

یہ کون چھپ رہا ہے پسِ پردۂ خزاں
جلوے کو اپنے اور بھی عریاں کئے ہوئے

کس حسنِ خود نما کی تجلی کا فیض ہے
ہر شے کو اپنی ذات پہ نازاں کئے ہوئے

کس شوخ کی نگہ کے اثر سے ہے زندگی
عقل و جنوں کو دست و گریباں کئے ہوئے

للہ کھول آنکھ تو بیٹھا ہے کیوں اسد
روزِ وصال کو شبِ ہجراں کئے ہوئے

زمزمۂ تغزل

(از نتیجۂ فکر عالیجناب خان بہادر نواب مرزا محمد حسین علیخاں صاحب بہادر بی اے ریٹائرڈ کلکٹر)

مآل اندیش کھاتے ہیں خزاں کا غم بہاراں میں
گریباں چاک ہیں گل روتی ہے شبنم گلستاں میں

حسد صیاد و گلچیں باغباں کو ہے تو کیا ڈر ہے
مثالِ بوئے گل رہتا ہوں میں کنج گلستاں میں

جراحت تنگ ہمت ہے جو ہو شرمندۂ مرہم
نہ ہو مشغول تو اے چارہ گر تکلیف درماں میں

وطن میں قدر ہو کیوں کر ہمارے دُرِّ مضموں کی
گھٹی رہتی ہے بیشک لال کی قیمت بدخشاں میں

پریشاں جب ہوا انساں ہر طرف ایذا ہی ایذا ہے
نظر آتا ہے کانٹوں کا بچھونا صحنِ بستاں میں

خزاں آئی زمانہ فصلِ گل کا ختم ہے شاید
لگائے جاتے ہیں ٹانکے جو وحشی کے گریباں میں

قفس میں بھی شگفتہ ہو گیا دل فرطِ شادی سے
کسی نے کہدیا جھوٹوں بہار آئی گلستاں میں

عجب کیا دامنِ صحرا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا
قیامت ہے کہ میرا ہاتھ الجھا ہے گریباں میں

زلیخا بے خطا تھی کچھ خبر اصلا نہ تھی اس کو
نہاں ہے داغ رسوائی کا غم یوسف کے داماں میں

سخی پوشیدہ سخاوت سب سے کرتے ہیں
کہ شبنم رات کو موتی لٹاتی ہے گلستاں میں

زلیخائے سخن کے دور میں سروار کیا کہئے

عرب کا بادشاہ

سُلطان ابن سعود

(ایچ سینٹ۔ فلبی کے ایک مضمون کا ترجمہ جو انگریزی اخبار "لسنر" میں شائع ہوا)

(مترجمہ جناب عبدالرحیم صاحب شبلی۔ بی کام)

میں شاہِ عرب سے قریباً بیس برس سے واقف ہوں کیونکہ ۱۹۱۷ء میں مجھے برطانوی سفیر بنا کر ان کے صحرائی دار الخلافہ میں بھیجا گیا تھا۔ وہ اس وقت اگرچہ عرب کے بیشتر حصہ پر قابض تھے۔ لیکن ان کی شخصیت کے متعلق بہت کم معلومات لوگوں کو حاصل تھیں۔

اُس وقت تک اُن کی زندگی زیادہ تر فوجی معرکہ آرائیوں میں مصروف رہی۔ اُن کا ورزشی جسیم بدن جو متواتر گھوڑے کی سواری اور لڑائیوں کی وجہ سے خوب مضبوط ہو گیا تھا۔ معرکہ آرائیوں کے لئے خاص طور پر مناسب حال تھا۔ لیکن جو چیز مجھ پر زیادہ اثر انداز ہوئی وہ اُن کے اخلاق حسنہ کے فوجی پہلو کی بجائے ان کی قوتِ نظم ونسق ہے۔ کسی نہ کسی طرح آپ نے غیر منظم اور منتشر عربوں کو اپنے نظام کے ماتحت کر لیا۔ اور فوجی طاقت کی یہ مشینیری آپ کے حکم کے اشارہ پر حرکت میں آنے کے لئے تیار ہو گئی جس کو بعد میں ابن سعود کے اثر ورسوخ کو تمام عرب میں پھیلانے کے لئے چند در چند وقفوں کے بعد استعمال کیا گیا اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں اُنکی بادشاہت قائم ہو گئی۔ آپ کو بلاشک وشبہ عرب کا عظیم الشان اور نمایاں ترین انسان تصور کیا جاسکتا ہے!

ملک کے جملہ انتظام کا بار ابن سعود شاہ عرب کے دوش پر ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی مصروفیات کے لئے چوبیس گھنٹہ کا دن نہایت قلیل ہے آپ تمام دن اپنے دیوان خاص یا عام میں سلطنتی امور کی انجام دہی کے لئے ہمہ تن مصروف ومنہمک رہتے ہیں۔

اگر کسی شخص کو آپ سے کوئی کام ہو تو وہ دیوان عام میں خود حاضر ہو سکتا ہے دنیا کے تمام بادشاہوں کی نسبت غالباً آپ کی باریابی سب سے آسان ہے۔

آپ کے محافظ اور درباری فرش پر ہی آپ کے اردگرد بیٹھ جاتے ہیں آپ خود بھی ننگے پاؤں عربی لباس میں کمرہ کے ایک کونے میں ایک اونچی نشست پر تشریف فرما ہو جاتے ہیں۔ اور ملاقاتیوں اور وزرا کو بنچوں یا سٹولوں پر بٹھا دیا جاتا ہے۔

دیوانِ عام میں آپ صبح سات بجے سے لے کر دوپہر تک۔ تین بجے سے لے کر چھ بجے شام تک اور پھر آٹھ بجے رات سے لے کر نصف شب تک کام کرتے ہیں۔

اپنے روزمرہ فرائض کے علاوہ آپ نمازوں اور دیگر مذہبی رسوم کیلئے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ آپ درحقیقت نہایت صالح اور عابد مسلمان ہیں۔ اور کوئی چیز آپ کے مذہبی پروگرام میں حارج نہیں ہو سکتی۔

وقت پورا کرنے کے لئے آپ صبح سویرے تین بجے اٹھتے ہیں اور دو گھنٹے تہجد۔ نماز وتلاوتِ قرآن شریف کے بعد آپ اپنے معمول کے کام کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ دن کے وقت نمازوں وغیرہ کی ادائیگی کے لئے آپ کے کم ازکم چار گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ بدیں وجہ آپ کے پاس دیگر مصروفیات کیلئے بہت کم وقت باقی رہ جاتا ہے۔ لیکن آپ اپنے آرام کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔ آپ شاید ہی پانچ گھنٹوں سے زائد کبھی سوتے ہوں۔ بلکہ اکثر اوقات آپ کم ہی سوتے ہیں خوراک بھی آپ کے نزدیک ایک تعیش ہے اور آپ بہت کم توجہ اُس کی طرف

نیرنگ خیال میں چند ایسے مضمون نگار بھی لکھتے ہیں جو کسی دوسرے رسالہ میں لکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔

دیتے ہیں - کھانا بڑی بڑی قالینوں میں فرش پر چن دیا جاتا ہے اور تمام حاضرین کو اس میں شریک ہونے کے لئے دعوت دیجاتی ہے - لیکن یہ دعوت صرف چند منٹ تک رہتی ہے - جس کے بعد سلطان اپنی ملاقاتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں ؛

آپ کی واحد تفریح یہ ہے کہ آپ کبھی کبھی صحرا میں ہرن یا عربی شتر مرغ کے شکار کے لئے نکل جاتے ہیں - یہ سیر و شکار حقیقی معنوں میں تفریح ہوتی ہے اور سلطان اِس سے حد سے زیادہ محظوظ ہوتے ہیں ؛

شکار کی پارٹی موٹروں میں روانہ ہوتی ہے اور جب کوئی شتر مرغ یا غزال نظر پڑتا ہے تو موٹر اس کے پیچھے دوڑا دی جاتی ہے -

شکار کے علاوہ سلطان کی تفریح یہ ہے کہ کھانے نماز پڑھنے سونے اور شاہی امور کی انجام دہی کے بعد جو وقت چوبیس گھنٹوں میں سے باقی بچتا ہے وہ اسے خانگی فرائض کی ادائیگی کے لئے صرف کرتے ہیں ؛

آپ کو اپنے روز افزوں خاندان کی وجہ سے کافی وقت اس طرف خرچ کرنا پڑتا ہے ؛

البتہ ہمیں شاہ عرب کی خانگی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں - کیونکہ عرب میں غریب اور امیر عورتیں دونوں نہایت سختی سے پردہ کی پابند ہیں ؛

ان باتوں کے باوجود کبھی کبھی جب شاہ عرب کے ننھے بچے آپ کے قریب ہوں تو آپ اپنے انہماک کو توڑ کر ان سے تفریح طبع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں -

اکثر اوقات دو یا تین سال کا بچہ سلطان العرب کے ایوان عام میں کوئی چیز مانگنے کے لئے یا اپنا کوئی دکھڑا سنانے کے لئے چلا آتا ہے یا بچے دیہاتوں کی سیر کے وقت آپ کی معیت کرتے ہیں - اس وقت آپ کے دل کی اصلی کیفیت کا حال معلوم ہوتا ہے -

اور یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو شخص ایک بچے کی فطری طبیعت کے سامنے بالکل جھک جاتا ہے - اس کو یقیناً انسانوں کا فائدہ اور خدا کا عابد بندہ بننے کے لئے قسّامِ ازل نے منتخب کیا ہے - خدا تعالٰے کی خوشنودی اور رعب قوم کے ناموس کی حفاظت - یہی وہ اصول جو اس نامور تاریخی ہستی نے اپنی زندگی کی شمع راہ بنا رکھے ہیں !

(عبدالرحیم شبلی)

سلیس اور سادہ اردو نیرنگِ خیال کا معیار ہے تاکہ ہندو اور مسلمان اس رسالہ کے ذریعے قریب تر ہو جائیں

فلسطین

(از جناب مشیر احمد صاحب علوی قادری بی اے)

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہو

غالبؔ

ارضِ کنعان کا ایک جوان صالح اپنے برگزیدہ باپ کے حکم سے عراق کی طرف راہی ہوا تا کہ اپنے ماموں سے جو شہر حرّان کا ایک دولتمند باشندہ تھا اسکی بیٹی کی خواستگاری کرے وطن مالوف (بیر شیبہ) سے حرّان تک سترہ دن کا راستہ تھا۔ بے آب و گیاہ کوہستان اور خطرناک وادیاں سنگ راہ تھیں صحرائی جانوروں سے زیادہ اپنے توام بھائی (عیصر بن اسحٰق) کا خوف تھا۔ جس سے قدیم دشمنی تھی۔ شفیق باپ نے زاد سفر۔ تحائف و ہدایا کے لئے زر و جواہر کا انبار ساتھ کیا تھا۔ اور اس کی حفاظت کی فکر تردوات میں اضافہ کا باعث تھی۔ بستی سے کچھ ہی دور نکلا تھا۔ کہ بے رحم بھتیجے (الفاز بن عیصر بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام) نے راستہ روکا اور جس قدر مال و متاع ساتھ تھا لوٹ لیا نہ ہاتھ میں کوڑی رہی نہ تن پر کپڑا۔ آگے بڑھے تو مال نہیں حال نہیں۔ اور پیچھے پھرے تو والد ماجد کو منہ دکھانے کی مجال نہیں۔ بےکسوں کے مددگار سے فریاد کی اور بچشم نم آسمان کی طرف رُخ کیا۔ دیکھا کہ بارہ روشن ستارے فلک اخضر پر درخشاں ہیں۔ دن کے وقت سورج کی تیز روشنی میں ستاروں کا نور دیکھ کر حسرت و استعجاب کے بادل چھا گئے۔ آنکھ نیچی کی تو پہچانا کہ وطن سے بہت دور موریہ کے کوہستان میں استادہ ہے اور دو دن کی مسافت چند لمحوں میں طے ہو گئی ہے۔ اس طے الارض کی کھلی ہوئی کرامت نے حیران و مدہوش کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے آفتاب غروب ہو گیا۔ ہر طرف تاریکی چھا گئی اور اسی کوہستان کے ایک گوشہ میں رات بسر کرنا لازم ہوا۔

پہاڑ پر سنگریزوں کی افراط تھی۔ درندوں سے حفاظت کے لئے اپنے اردگرد پتھر بارہ پتھر لگائے اور ایک پتھر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ آنکھ بند ہوتے ہی قدرتِ ایزدی کا تماشا نظر آیا۔

سچے کا خواب

حضرت یعقوب نے دیکھا کہ ایک عظیم الشان سیڑھی زمین سے فلکِ ہفتم تک لگی ہے اور عجیب الخلقت فرشتے اس راستہ سے زمین پر اترتے ہیں۔ اور پھر آسمان پر چڑھتے ہیں۔ بعض ملائک نے اس نو وارد مسافر کے نزولِ اجلال کی ملاء اعلےٰ میں خبر پہنچائی۔ بابل کا بادشاہ آیا اور اس سیڑھی کے ستر ڈنڈوں تک چڑھ کر اترا۔ توران کا تاجدار آیا اور باون ڈنڈوں تک چڑھ کر لوٹا۔ یونان کا شہزادہ آیا اور ۱۸۰ زینے طے کر کے نیچے گرا۔ بعد ازاں ایڈوم کا حاکم آیا اور بڑبڑاتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ اس کے بادلوں تک پہونچنے اور آسمان پر حکومت کرنے کا عزم کیا۔ ناگاہ خداوند کے جلال نے اس تماشائی کو گھیر لیا۔ آسمانوں کے دروازے کھل گئے زمین کے طبق روشن ہو گئے۔ اور بانگ جرس نے صدا دی "ایڈوم کے حاکم سے۔ یہ مبارک زمین جسپر تو استراحت کر رہا ہے۔ تیرے فرزندوں کی میراث ہے اور تیری نسل ریت کے ذرّوں کی طرح بے شمار ہوگی"

یکایک فلسطین کی تمام زمین گنبد بن کر اس بخت بیدار سونیوالے کے ہاتھ میں آگئی۔ اور مکرر بشارت دی گئی کہ اس کے فرزند اس خطۂ ارض پر تصرف کریں گے .... اب اس سے زیادہ حیرت انگیز جلوے نظر آنے لگے۔ دیکھا کوہ سینا تجلی حق سے معمور ہے اور خدا کا ایک مقبول بندہ استادِ ازل سے احکام و قوانین کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ دفعتہً منظر بدلا۔ ایک عالی مرتبت عبادتگاہ تعمیر ہو رہی ہے اور خدا کی بندگی کا حق ادا کرنے والے دودھ اور شہد کی نہروں میں غسل کر رہے ہیں ایک لمحہ میں یہ تماشا بھی غائب ہوا

یروشلم کا خوبصورت شہر جل رہا ہے اور عبادت گاہ کا سارا مال و اسباب لوٹا جاتا ہے۔ یہ منظر بھی روپوش ہوا۔ دنیا کے ہر گوشہ سے غلام آزاد ہو کر آئے اور عبادت گاہ کی تعمیر دوبارہ ہونے لگی۔

گھبرا کر آنکھ کھول دی۔ رات ختم ہو چکی تھی اور صبح کا سپیدہ پھیل گیا تھا۔ عنایت و نوازش خداوندی کا شکریہ ادا کیا اور اس مقدس مقام کا نام بیت ایل رکھا۔

یہودی قوم بہت ضدی متعصب اور سخت مزاج ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ جو خیال جم گیا اس کا نکلنا مشکل ہوتا ہے خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ آپ یہودیوں کو کسی طریقہ سے قائل نہیں کر سکتے۔ وہ تمام اسباب و علل پر آنکھیں بند کر کے محض اپنے عقائد پر قائم رہتے ہیں۔ خواہ کوئی رسم کیسی ہی لغو کیوں نہ ہو۔ ایک بار اگر کسی یہودی نے کی ہے۔ تو وہ اب ہمیشہ قائم رہے گی۔ کسی خیال اور بحث سے اس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ ولادت حضرت مسیح سے بہت قبل ۹۷ سنہ میں ایرانی تاجدار بخت نصر نے کنعان پر حملہ کر دیا۔ یروشلم محاصرہ ہوا۔ فوج کی کمان بخت نصر کے ہاتھ میں تھی۔ یہود کا بدنصیب بادشاہ عاجزی سے صلح کا خواستگار ہوا۔ اور اپنے اعزہ و رفقا کو ساتھ لے کر بغداد کی مستعصم باللہ کی طرح دشمن کے خیمہ میں امان مانگنے چلا گیا۔ جنگ خود بخود ختم ہوئی بخت نصر نے ہیکل سلیمان اور شاہی محل کے خزانے لوٹ لئے۔ یہودیوں کی نگاہ میں ہیکل سلیمان کی وہ قدر تھی جو مسلمانوں کی نظر میں کعبۃ اللہ کی ہے۔ بنی اسرائیلیوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ایک شخص آنیوالا ہے وہ زور دار ہے۔ اور حضرت مسیح تشریف لائے لیکن یہودیوں نے ان کے وعظ کو ہنسی میں اڑا دیا اور آج تک وہ اسی خیال میں مست ہیں کہ نجات دہندہ آئے گا۔ حالانکہ وہ ... ۲ سال قبل حضرت مسیح کو اپنے خیال میں صلیب پر چڑھا چکے ہیں۔

آپ نے ابتدا میں ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح حضرت یعقوب نے فلسطین کا خواب دیکھا تھا۔ چنانچہ آج تک یہودی اسی خیال پر قائم ہیں۔ اور آج ہزارہا برس کے بعد بھی یہودی فلسطین کو بیت یہود بنانے پر تلے ہوئے ہیں اصل میں یہودیوں کو سیاسی اصول پر فلسطین سے وطنی بالفور یادداشت کے بعد سے شروع ہوئی۔ اس سے قبل وہ لوگ فلسطین کو تاریخی اور مذہبی مرکز تصور کرتے تھے۔ عربوں سے انکا اتحاد تھا اور یہ تصور کیا کرتے تھے کہ فلسطین یہودیوں کے تمدن اور مذہب کا مرکز ہے۔ اور قانع تھے کہ سال میں ایک بار زیارت سے مشرف ہو جایا کریں۔ لیکن حکومت کا خیال کبھی بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ اگر بالفور یادداشت سے یہودیوں کی تحریک صیہونیت شروع ہوئی تو مسلمانوں (عربوں) کو اسیوقت سے فلسطین کی سیاسی رفعت کی مرکزی حیثیت کو قائم کرنے کا خیال پیدا ہو گیا ہے اب عبرانی تعلیم حاصل کی جاتی ہے۔ عبرانی تمدن کی نشر و اشاعت ہوتی ہے اور تحریک صیہونیت کی تبلیغ کی جاتی ہے اور خالص یہودی مسئلہ پر گفت و شنید کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو خالص سیاسی نقطہ خیال سے سب سے پہلے ۱۸۹۷ء میں ایک المانی صحافی تھیوڈر ہرزل نے یہودیوں کے سامنے پیش کیا۔ اس کا مقصد تھا روس۔ آسٹریا۔ جرمنی اور دیگر مقامات سے یہودی ہجرت کر کے فلسطین میں آباد کئے جائیں۔ اس کی ڈائریاں۔ تقاریر۔ خطوط اور نجی تحریروں سے پتہ چلتا ہے نہ اس تحریک سے اس کا کوئی مقصد نہ تھا بلکہ وہ وقتی ہنگامہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ تحریک اثر پکڑتی گئی اور یہودیوں کو تحریک صیہونیت کا قدیم خیال پھر عود کرنا شروع ہوا بلکہ اب اس تحریک نے بیت ملی کا خیال پیدا کر دیا — ۱۹۱۵ء میں اس قدیم تحریک کے نشو و نما کے قدرتی ذرائع پیدا ہو گئے۔ اور مشرق و مغرب ہر جگہ اس تحریک کی پرچار شروع ہو گئی۔ پہلے یہودی خود تحریک صیہونیت پر اعتماد نہ رکھتے تھے اس لئے ایک جماعت نے جو عبرانی تمدن کی احیاء کی کوشش میں تھی وہ عام یہودیوں سے علیحدہ ہو گئی۔ اور رشید ہام اس گروہ کی نقابت کرتا رہا۔ رشید ہام اس عہد کا بہت بڑا یہودی مصنف ہے اور صیہونی ملی جذبہ کا سب سے بڑا ناقد و ناظر بھی۔ بالفور اعلان کے بعد ۱۹۱۷ء یہ جماعت حکومت کے ساتھ موالات پر تیار ہو گی۔ اس اعلان کے بعد سے عبرانی تمدن کا احیا ہو گیا ہے۔ اب فلسطین کے مدارس میں عبرانی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ عبرانی زبان بولی جاتی ہے۔ عبرانی تھیٹر۔ عبرانی مطابع اور عبرانی اخبارات رائج ہیں۔ بالفور اعلان نے اس تحریک صیہونیت کی پشت پناہی کی اور عبرانی نژاد نسل بہت جلد فلسطین میں تیار ہو رہی ہے اور وہ دن دور نہیں ہے کہ وہ دنیا کی طاقتور قوم بن جائے گی۔

ن جولائی ا — ں ں

ر. در اسرائیل کے خدا کا گھر جو یروشلم میں

یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ "وہ چاندی سونے مال اور مویشی سے مدد کرے

پشت پناہی کی اور کو

اور خدا کے گھر کے لئے جو یروشلم میں ہے ہدیہ بھیجے"۔ یہ فرمان یہودی قبیلوں کی رہائی کا پہلا شاہی اعلان تھا۔ بنی اسرائیل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آخری اسرائیلی بادشاہ کے جاہ وحشم دیکھنے والے نوجوان سن رسیدہ اور ضعیف ہو چکے تھے بوڑھے مر چکے تھے۔ اور لڑکے بوڑھے تھے۔ یروشلم کی رونق اور آبادی چند ہی نفوس کو یاد تھی مگر آبا واجداد کی راجدھانی بیت رہیم دیکھنے کا شوق اور ہیکل سلیمانی میں عبادت کرنے کی آرزو۔ باپ دادا سے میراث میں ملی تھی۔ دل کھل گئے اور ساری قوم یکزبان ہو کر کیخسرو کی عظمت اور عالی ہمتی کے ترانے گانے لگی۔

قدیم متبرک مقام پر عارضی قربانگاہ بنائی گئی اور ۵۳۵ء ق۔م۔ میں عبادت خانہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ بنیادی پتھر بڑے جوش وخروش سے رکھا گیا اپنے اعضا نے اس کار خیر میں مخالفت اور مزاحمت کی۔ سامری دشمنی پر تیار ہوئے۔ تعمیر قانوناً روک دی گئی۔ گشتاسپ نے دوبارہ ہیکل کی تعمیر کی اجازت دی اور شہنشاہ دارا کے چھٹے سن جلوس میں ۵۱۶ء ق۔م میں یروشلم پورے ۷۰ سال کے بعد پایۂ تکمیل کو پہونچی بنونہ قدیم معبد سلیمانی کا تھا مگر مسالہ کم قیمت استعمال کیا گیا۔ سن رسیدہ نفوس جنہوں نے قدیم عالیشان عمارت کی زیارت کی تھی۔ اس جدید گھر کو دیکھ رونے لگے اور نوعمروں نے شادمانی کے ترانے شروع کئے۔ خوشی کا شور اور غم کی صدائیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ بوڑھے چند تھے اور جوان بہت۔ اس لئے اغیار کو یہ امتیاز دشوار تھا۔ کہ بنی اسرائیل تعمیر جدید پر مسرت کے شادیانے بجا رہے ہیں یا پرانی یادگار کی تباہی پر بین کر رہے ہیں۔

عزرا کاہن پندرہ سو ایرانیوں کا مختصر قافلہ لے کر یروشلم آئے۔ الہامی زبان میں خدا کا ہاتھ اس کے ساتھ تھا اس نے راستہ میں گھاٹ والوں سے بچایا۔ لیکن جب وہ یروشلم میں پہونچے وہاں رنگ دگرگوں تھا۔ فسق وفجور کا بازار گرم تھا۔ مصحف انبیا کا نشان نہ تھا۔ تابوت سکینہ نذر آتش ہوا۔ اجنبی بیویاں گھروں میں تھیں۔ عزرا نبی نے لباس چاک کیا۔ روزے رکھے۔ ہیکل مقدس میں مناجات کی۔ بیت ایل میں رو رو کر دعا مانگی۔ آہ وزاری رنگ لائی۔ قوم کو بداعمالی کا احساس ہوا۔ اجنبی بیویوں کو چھوڑ اسوۂ ابراہیمی پر عمل پیرا ہونے کا بیڑا اٹھایا۔ عزرائیلیوں نے فوق العادت قوت حافظہ سے کام لے کر عہد نامہ عتیق کے سب پرانے صحیفے لکھوائے اور شریعت موسوی کو زندہ کیا۔ ان کے جوش خلوص ہمدردی اور قابلیت نے آل داؤد کو ملت ومذہب کا پرستار بنایا۔ اور وہ قدامت پرست متحمل قوم پرست کا جو ہزار ہا سال کے مظالم سہنے کے بعد آج بھی دنیا کے براعظم میں اپنے مخصوص رسوم و قواعد کے ساتھ زندہ ہے۔ ایشیا کا فلسفہ۔ یورپ کا فیشن امریکہ کے سائنس ان کے آداب و دستور کو ترمیم کرنے سے عاجز ہے۔ وہ سب سے ملے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں ان کا ایک نامور فرزند وائسرائے بھی رہ چکا ہے۔ دنیا کے مدبرین میں ان کے افراد کا شمار ہے۔ دولت میں اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے لیکن بایں ہمہ سب سے الگ "خلوت در انجمن" اور "بے ہمہ باہمہ" کا مصداق ہیں۔ اور موجودہ مذہب عزرا کا شرمندۂ منت ہے۔ لیکن ابھی تک شہرپناہ کی تعمیر نہ ہوئی تھی۔ نحمیا کی عنایت سے ۵۲ روز کی مدت میں شہر پناہ تعمیر ہو گئی۔ نحمیا اور عزرا ایران واپس چلے گئے۔ لیکن ان بلند ہمت بزرگوں کی برکت سے ارض موعود میں بنی اسرائیل کی سلطنت دوبارہ قائم ہو گئی۔

اب دنیا کی تاریخ کا ورق دوبارہ پلٹا۔ اکتوبر کی پہلی تاریخ ۳۳۱ء ق۔م میں صبح کے وقت سکندر کی فوج نے لڑائی کا بگل بجایا اور چند گھنٹوں میں جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ مشرق کو مغرب نے کچل دیا۔ ایشیا کو یورپ نے روند ڈالا۔ ایرانی ۳ لاکھ مقتول میدان میں بے گور وکفن چھوڑ کر فرار ہوئے سلطنت کا چراغ گل ہو گیا۔ ؎

نسب نامۂ دولت کیقباد ؛ ورق بر ورق ہر سوئے برد باد

سکندر ایشیا کا بادشاہ ہوا اور فرزندان اسرائیل اس کے فرمانبردار لیکن اس حیرتناک انقلاب کے ۸ سال ہی بعد ۱۱ جون ۳۲۳ء کو شام کے وقت خاندان کیقباد کا بے چراغ کرنے والا منزل عدم کا مسافر ہوا اور اس کی وسیع سلطنت متعدد جرنلوں میں تقسیم ہو گئی۔ شام و فلسطین پر سلوکس کی حکومت ہوئی۔ شام کی سلطنت تقریباً ۲۵۰ برس اس کے جانشینوں کے تصرف میں آئی لیکن ۳۱۲ء میں عزرا اس مقام پر بطالمی نے ولیعہد شام کو شکست دے کر فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اور سبت کے دن یروشلم میں داخل ہوا۔ اب مصریوں کا فلسطین پر تسلط ہو گیا۔ جو تقریباً ایک صدی تک قائم ہو گیا۔ شام کے بادشاہ موقع کے منتظر تھے

اور فلسطین کو زیرنگیں کرنے کی گھات میں تھے۔ ۲۰۳ء ق۔م۔ میں شاہ انطوکس سوم کے فلسطین اور سواحل پر قبضہ کرکے کنعان کو دوبارہ شام کا صوبہ بنالیا لیکن ۱۷۰ء ق۔م میں یونانی تہذیب۔ یونانی تمدن۔ یونانی مذہب کی نشر و اشاعت شروع ہوئی۔ یہود قدامت پرست تھے۔ ان کے مذہب کو یونانیوں سے اصولی اختلاف تھا۔ انہوں نے مذہب اور معاشرت تبدیل کرنے سے انکار کیا اور حکومت نے انکو ظلم و جور کا تختۂ مشق بنایا۔ مصائب کی کوئی حد نہ رہی۔ حتیٰ کہ سالس نے ۴۰ ہزار پیادے اور ۵ ہزار سوار لیکر حملہ کردیا۔ لیکن مقابی نے سرفروشانہ مقابلہ کیا۔ اور تمام ارض کنعان کا مالک ہوگیا۔ اور ہیکل سلیمانی جو اب معبد مشتری کے نام سے مشہور تھا۔ دوبارہ اس کو آلائشوں سے پاک و صاف کیا۔ اور عبادتگاہ سلیمانی بنایا اور تین سال کے بعد شریعت موسوی کے مطابق خدا سے وحدہٗ لاشریک کی ستائش شروع ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۶۴ء ق۔م کا ہے۔ شمعون مقابی یروشلم کا متولی اعظم ہوا۔ ارض کنعان کو قلعہ بند کیا اور ۱۴۳ء ق۔م میں اپنی خودمختیاری کا اعلان کردیا۔ اسرائیلی سکہ جاری ہوا۔ اور یہودیوں کی آزاد سلطنت دوبارہ ارضِ موعود پر قائم ہوگئی۔

ذرہ بھی چمک کے ہو ستارہ قائم جو زمین و آسماں ہے

بخت نصر کی غارت گری۔ بابل کی غلامی۔ شامیوں کی سفاکی کے بعد بنی اسرائیل کی ارض کنعانی میں خودمختار حکومت قوم کی جانبازی سرفروشی اور شوق شہادت کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ایک ہزار برس پہلے طالوت اور داؤد نے اس سرزمین پر سلطنت کا بنیادی پتھر رکھا تھا۔ مگر اس وقت اطراف و جوانب میں کوئی زبردست قوت منتظم موجود نہ تھی۔ لیکن اسوقت رومتہ الکبریٰ کی جمہوری حکومت روزافزوں ترقی کر رہی تھی۔ اور یونان کو مغلوب کرچکی تھی۔ یہود کا ملجا و ماوٰی مقدس یروشلم دشمنوں کے تصرف میں تھا۔ حتیٰ کہ عبادتگاہ سلیمانی میں بھی یونانی اصنام کی "خدائی" تھی اس عاجزی بےبسی اور ناامیدی کے ماحول میں آزادی کی کوشش اور کامیاب انقلاب کی سعی مشکور یہود امقابی کے صدق و خلوص کی کرامت تھی اس نے خونِ جگر سے نخل آزادی سیراب کیا تھا۔ اور جان بیچ کر قوم کو ظالموں کے پنجہ سے رہائی دلائی تھی۔ رومتہ الکبریٰ کی جمہوری سلطنت کا نامور سپہ سالار پامپی نے ۳۵ سالہ امارت میں بادشاہوں کو زیر کیا اور حیفا اور شام کی حکومتوں کو زیر کیا۔ ۶۳ء ق۔م میں جنوب کی طرف پیش قدمی کررہا تھا۔ اسں کو یروشلم کے باہمی نزع کا حال معلوم ہوا۔ فوراً اس نے شہر پر حملہ کردیا۔ ۳ ماہ تک شہر کی حفاظت کی گئی۔ فاقہ کشی کی نوبت پہونچی۔ ضبط و تحمل کی قوت گھٹی۔ فصیل میں رخنے پڑگئے۔ اور شہر بزورشمشیر فتح ہوا۔ ۱۲ ہزار یہودی تہ تیغ کئے گئے۔ یروشلم کی شہرپناہ مسمار کی گئی۔ پامپی ہیکل سلیمانی میں داخل ہوا۔ اس طرح ایک صدی کے بعد باہمی نفاق کی وجہ سے یہود کی خودمختار سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ اور ۶ء میں یروشلم کی حکومت ایک رومی گورنر کے سپرد ہوئی۔ اور سلطنت کنعان روما کا ایک صوبہ بن گئی۔ اور ارض موعود کا خیال گونگے کا خواب بن گیا۔

ہیرودؔ کی عہد میں حضرت ذکریا و حضرت مسیح کا ظہور ہوا۔ حضرت مسیح کو صلیب دی گئی۔ بنی اسرائیل ایک دوسرے کو کافر و مرتد تصور کرتے تھے۔ بعینہ انکی وہی حالت تھی۔ جو آج کل مسلمانوں کی ہے۔ کوئی گورنر یہودیوں کو خوش نہ کرسکا۔ ۶ء سے ۶۶ء تک ۶۰ برس میں ۱۴ گورنر بدلے گئے۔ اتفاق سے جس دن یروشلم میں خودمختاری کا اعلان ہوا۔ اسی روز قیصریہ میں رومی گورنر کے حکم سے ۲۰ ہزار یہودی قتل کئے گئے۔ باغیوں کی حکومت شروع ہوگئی۔ جوزیفس اس حکومت کا سردار مقرر ہوا۔ لیکن اس کی شہرت اس بےنظیر تاریخ یہود سے ہے جو اس نے کئی سال بعد رومتہ الکبریٰ میں تالیف کی تھی۔ اس نے آزمودہ فوج سے کھلے میدان میں جنگ خلاف مصلحت سمجھ کر جوکابیٹ کے حصہ میں قلعہ بند ہوگیا۔ یہود میں باہم اتفاق ہوتا تو دارالسلطنت کی تسخیر آسان نہ تھی۔ مگر بدقسمتی سے شہر کے اندر مخالف فرقوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ اور اس کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا کہ ۷۰ء میں طیطوس نے محاصرہ کرلیا۔ شہر میں قحط پڑگیا۔ رومی دھاوے کررہے تھے۔ اور پسپا ہوتے تھے۔ لیکن یروشلم کی طرح اطاعت پر تیار نہ تھا۔ آخرکار رومیوں کے قلعہ شکن آلات نے ایک جگہ دیوار میں رخنہ کردیا۔ رات کے وقت ۲۴ نفوس شہر میں داخل ہوئے۔ طیطوس نے اشتہار جاری کیا۔ بہتوں نے فائدہ اٹھایا۔ مگر بیشتر خیموں اور ہیکل مقدس میں پناہ گزیں ہوئے۔ ایک دل جلے نے جلتی ہوئی مشعل عمارت ہیکل پر پھینکدی۔ شعلے بھڑک اٹھے۔ یہودیوں نے یہ منظر دیکھ کر چیخ ماری اور تلواریں کھینچ کر دشمنوں کو مارنے اور ہیکل پر اپنی جانیں قربان کرنے لگے۔ طیطوس نے

شور مچایا۔ آگ بجھانے کا انتظام کیا مگر تلواروں کی جھنکار میں اس کی آواز کون سنتا۔ آج یہودیوں پر غضب خداوندی نازل تھا۔ ہزاروں بےگناہ قربانگاہ کے گرد کٹے ہوئے پڑے تھے۔ ہیکل کی سیڑھیوں سے خون کے پرنالے بہ رہے تھے۔ اور لاشیں بہہ بہہ کر نیچے گرتی تھیں۔ قبل اس کے کہ ہیکل مقدس کے مقام تک آگ کے شعلے پہنچیں طیطوس نے اس کو بچانے کی آخر کوشش کی۔ مگر اس کی آنکھوں کے سامنے مغلوب الغضب سپاہیوں نے الہام گاہ کے عالیشان دروازے میں آگ لگادی اور ساری عمارت ایک ساعت میں مل کر خاک کا ڈھیر ہوگئی اسی طرح یروشلم کا خاتمہ ہوا۔ اور جوزیفس کی روایت کے مطابق تخمیناً ۱۱ لاکھ یہودی مقدس شہر کی حفاظت میں قتل ہوئے۔ یہود کی تاریخ ختم ہوگئی۔ بنی اسرائیل کا من حیث القوم وجود باقی نہ رہا۔ کنعانی غلام یورپ اور ایشیا کے بازاروں میں علی الاعلان فروخت ہوئے۔ یہودیوں کا ملک قبرستان ہوگیا۔ بھیڑیئے اور درندے ان شہروں میں رہنے لگے۔ جہاں اسرائیلیوں نے عیاشی اور بدکرداری کی داد دی تھی۔ ؎

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را — چندیں اماں نداد کہ شب را سحر کند

کیا مسلمان قوم کے اکابر اس انجام سے سبق حاصل کریں گے۔

مسلمانوں نے رومیوں سے ۶۳۷ء میں فتح کیا۔ اور حضرت فاروق اعظم خلیفہ دوم یروشلم میں فاتحانہ داخل ہوئے تو انہوں نے حرم شریف کو غلاظت سے بھرا ہوا پایا۔ آپ نے ایک چبوترہ تعمیر کیا اور پہاڑی پر الاقصیٰ کی تعمیر کی۔ جو ۴۰ سال تک قائم رہی اور اس کے نشانات بھی اب پائے نہیں جاتے اور یہی وہ مقام ہے جو اب بھی مسجد عمر کے نام سے مشہور ہے۔ خلفائے امویہ کے عہد میں حرم شریف کی موجودہ شکل وجود میں آئی وہ جزیرۃ العرب پر قابض نہ تھے اس لئے انہوں نے یروشلم کے تقدس کو سیاسی اصول پر بڑھانے کی بے حد کوشش بھی کی۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے موجودہ حرم شریف کی تعمیر کی۔ بہت سے انقلابات سے یہ عمارت دوچار ہوچکی ہے۔ لیکن اس کے تقدس اور رعنائی میں مطلقاً کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ۱۰۹۹ء میں اس کو مسیحی محاربین نے بولین کی قیادت میں فتح کرلیا۔ لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۷ء میں اس کو مسیحی اقتدار سے رہا کیا۔ اور ۱۹۱۷ء تک یہ مقدس مقام اسلامی توجہات کا مرکز اصلی بنا رہا۔ ۱۹۱۷ء میں سلاطین عثمانیہ سے لارڈ النبی نے فتح کیا۔ اور اب بیت الیہود بنانے کا قدیم خیال پھر پیدا ہوگیا ہے۔

حضرات آپ نے فلسطین اور اہل فلسطین کی تاریخ داستان شباب و زوال ملاحظہ کی۔ اب اس کو بالفور اعلان کہئے یا برطانوی اقتدار مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو اس مرکز اصلی۔ اس قبلہ اول کی رہائی کا خیال پیدا ہوگیا ہے۔ مسلمانوں کو برطانوی مدبرین کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ ان کو دوبارہ کسی مرکز خیال پر توجہ قائم کرنے کا موقعہ مل گیا ہے اور اگر آج مصطفےٰ کمال اتاترک کی عنایت سے قسطنطنیہ کی جانب عام مسلمانوں کو اطمینان قلب نصیب ہوگیا ہے تو اب تمام مسلمانان عالم کو اپنے مرکز اصلی کے تحفظ کا خیال بحمدہ پیدا ہوگیا ہے۔ یہ خیال کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تحریک صیہونیت کی پشت پناہی پر تلی ہوئی ہے۔ یقیناً غلط ہے۔ برطانوی مدبرین کیلئے مسلمانان ہند اسی سے زیادہ عزیز ہیں۔ جس قدر کہ یہودی۔

مسلمانان ہند کو کسی بیرونی خبر پر اس وقت تک یقین نہیں کرنا چاہئے۔ جب تک حکومت ہند کے محکمہ نشر و اشاعت سے اس کی تصدیق نہ ہوجائے۔ اسوقت فلسطین کا مسئلہ حکومت کی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور امید ہے کہ انشاء اللہ مسلمانان ہند کی خدمات کی ہمنوائی میں اس اہم مسئلہ کا فیصلہ ہوگا۔

(قادری)

اس مقالہ میں مجھ کو ادیب سحر طراز منشی امیر احمد صاحب علوی کی داستان زوال سے امداد ملی ہے۔ اور جن لوگوں کو اس مسئلہ سے دلچسپی ہوا ؤں کو داستانِ زوال کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہ نایاب کتاب افسانہ کا افسانہ اور تاریخ کی تاریخ مسلمانان ہند کو اس کتاب کو دیکھ کر اپنی قوم مرحوم کے لئے کسی آخری فیصلہ کا بھیجنا چاہئے۔ یہ نایاب کتاب نواب ذکی احمد صاحب علوی القادری آنریری لائبریرین۔ امیر محل لائبریری۔ نصیر باغ۔ کاکوری (اودھ) لکھنؤ سے دو روپیہ قیمت پر مل سکتی ہے۔
(قادری)

نیرنگ خیال کے ہر معمولی پرچے میں پانچ تصاویر اور ۸۰ صفحات کے مضامین ہوا کریں گے۔

عربی زبان اور دَورِ جاہلیت

(از جناب سید محمد یوسف صاحب فاضل ادب بھوپال)

ماہرین علم الالسنہ نے دنیا کی بے شمار زبانوں کو تین اصولوں میں منقسم کیا ہے

السنہ آریہ (یا ہندو یورپی زبانیں) ہندی انگریزی وغیرہ

السنہ تورانیہ (یا منغولیہ) چینی تورانی وغیرہ

السنہ سامیہ عربی سریانی عبرانی وغیرہ

السنہ سامیہ کا اطلاق ان زبانوں پر ہوتا ہے جو سامی اقوام کی زبانیں ہیں۔ سامی اقوام وہ قومیں ہیں جو آرمینیہ سے لے کر بحر عرب تک اور خلیج فارس سے لے کر بحر احمر تک آباد تھیں +

تقریباً دو ڈھائی ہزار برس قبل مسیح بابلی زبان کا پتہ ملتا ہے۔ اس زمانہ میں قوم عاد کا بابل پر تسلط تھا۔ قوم عاد عرب تھی اور اس کی زبان بھی عربی ہی تھی۔ عربی زبان بھی انہیں عربوں کے ساتھ ساتھ بابل میں پہونچی۔ اور وہاں کی قدیم زبان سے مل جل کر بابلی کی شکل اختیار کی۔ اس نظریہ کے مطابق بابلی حقیقتہً عربی ہی کی ایک شاخ تھی۔ جس طرح عربی اور ہندی کی آمیزش سے ایک نئی زبان سندھی پیدا ہوگئی۔ لیکن اس نظریہ سے بعض مستشرقین یورپ مختلف نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بابلی عربی کی شاخ نہیں بلکہ بابلی سے عربی نکلی ہے۔ تاہم یہ بات متفق علیہ ہے کہ عربی اگر السنہ سامیہ کی ماں نہیں تو کم از کم ان کی سب سے بڑی بہن تو ضرور ہے۔ اور بابلی کے بعد سب سے قدیم زبان ہے +

موجودہ عربی زبان کا اطلاق اس زبان پر ہوتا ہے جو ۵۰۰ء کے بعد کی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عربی زبان نے اپنی موجودہ شکل میں ۵۰۰ء کے بعد ہی اختیار کی ہے۔ تدریجی ارتقا کے عالمگیر اصول سے زبان کی نشوونما بھی مستثنےٰ نہیں۔ ایک ارتقا پذیر سلسلہ کی قریبی اگلی اور پچھلی کڑیاں بہت ہی کم مختلف ہوا کرتی ہیں۔ البتہ ۵۰۰ء سے قبل کی زبان اوراق و نیز حافظہ میں محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے ہم تک نہیں پہونچ سکی اسوجہ سے ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ موجودہ شکل ۵۰۰ء سے اختیار کی ہے +

عربی زبان کے پانچ دور قرار دیئے گئے ہیں۔ اول دورِ جاہلیت۔ دوم دورِ اسلامی۔ سوم دورِ امویہ۔ چہارم دورِ عباسیہ۔ پنجم از آخر دولت عباسیہ تا زمانہ حال +

دورِ جاہلیت کی مدت ۵۰۰ء سے ابتدائے اسلام یعنی ۶۲۲ء تک قرار دی گئی ہے۔ اس دور کی ادبیات کا کثیر حصہ مکتوب نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہوگیا۔ کیونکہ اس دور تک عرب لکھنے پڑھنے سے بے بہرہ تھے۔ ٹھیک اس وقت جب آفتاب اسلام طلوع ہوا۔ عرب میں کل ۱۷ شخص ایسے تھے جو لکھنا جانتے ہوں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں تحریر و کتابت کا سوال ہی نہ تھا۔ لیکن اگر ایک طرف عرب لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے تو دوسری طرف احفظ الامم ہونے کا امتیاز بھی رکھتے تھے۔ یہ بڑے بڑے قصائد اور خطبات صرف ایک دفعہ سن کر یاد کرلیا کرتے تھے۔ اس دور کی ادبیات کے متعلق ہم کو جو کچھ بھی معلومات ہیں وہ ان کے اسی خداداد حافظہ کی مرہون ہیں۔ اس دور کی جو ادبیات ہم تک پہونچی ہیں وہ وہی ہیں جو سینہ بہ سینہ نقل ہوتی ہوئی دورِ امویہ تک پہونچیں جبکہ علوم کی تدوین و تالیف ہوئی +

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ فطرتاً انسان نظم کو بہ نسبت نثر کے زیادہ اور جلد تر یاد کرسکتا ہے۔ اس لئے اس دور کی جو ادبیات ہم تک پہونچی ہیں وہ زیادہ تر نظم ہیں۔ نثر کا صرف بہت تھوڑا حصہ ہے جو چند خطبات اور کچھ وصیات دینی پر مشتمل ہے۔ لیکن نظم عربی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے

کہ وہ بجا طور پر دیوانِ عرب کہلانے کی مستحق ہے۔ یہ نظم عرب کی تمام تاریخ جنگ کے واقعات - اجتماعی و تمدنی حالات - معاشرتی رسوم - عقائد - خیالات و رواج و نیز خانگی زندگی کا آئینہ ہے - اس میں ہم کو عرب کے تمام سچے سچے جذبات اپنے بالکل فطری رنگ میں نظر آتے ہیں - ان کے اہم ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس دور کی شاعری تصنع و تکلف سے بالکل پاک و مبرا ہے - اس زمانہ میں بدویت کا غلبہ تھا اور عرب ان تکلفات سے جو حضریت کے لئے لازمی ہیں بالکل ناآشنا تھے - وہ تمام اصناف شعر - مدح - ہجو - غزل - مرثیہ وغیرہ میں صرف اپنے سچے جذبات کا اظہار کرتے اور اس میں تصنع کا کبھی شائبہ تک نہ آنے دیتے ؛

وہ اگر غزل یا نسیب کہتے تو اس میں اپنے سچے جذبات عشق کا اظہار کرتے - وہ اگر کھنڈرات پر کھڑے ہو کر آنسو بہاتے تو اس کا محرک اپنے حبیب کی سچی یاد ہوتی - وہ اگر مرثیہ کہتے تو اپنے جذبات حزن و ملال سے مجبور ہو کر - وہ اگر قصیدہ کہتے تو اپنے ممدوح کے اخلاق و صفات سے متاثر ہو کر - وہ اگر ہجو کہتے - تو واقعی اخلاق ذمیمہ کی اور اس میں بھی فحش اور جہل سے پرہیز کرتے - غرض یہ وہ نمایاں خصوصیت ہے جو اس دور کی شاعری میں سب سے زیادہ نظر آتی ہے ؛

عربی ادب کی تہذیب میں قریش کا دور سب سے اہم ہے - یوں تو ملک عرب کی وسعت کے لحاظ سے عربی زبان مختلف حصوں اور مختلف قبائل میں مختلف لہجوں کے ساتھ بولی جاتی تھی - لیکن ان سب میں معیار فصاحت قریش کی زبان قرار دی گئی اور رفتہ رفتہ تمام قبائل اپنی زبان کو قریش کی زبان کی سطح پر لانے کی کوشش کرتے رہے - وجہ یہ تھی کہ قریش حجاز مکہ کے ارد گرد آباد تھے - مکہ زمانہ قدیم سے ایک مقدس شہر مانا جاتا تھا - اور حقیقتاً وہ "دنیا کے بتکدوں میں" سب سے پہلا گھر ہے - تمام عرب دور دور سے ہر سال موسم حج میں جمع ہوتے ان اجتماعات کے موقعوں پر فصاحت و لعب کی بڑی بڑی مجالس منعقد ہوتیں اور وہاں تم قبیلوں کے شعراء و خطبا شعر خوانی و نغمہ سنجی کرتے اور فصاحت و بلاغت کے بڑے بڑے معرکے قائم ہوتے - عرب ان مواقع پر مختلف قبائل کی زبان سے فصیح ترین الفاظ و محاورات کا انتخاب کر لیتے اور جو الفاظ و محاورات قریش کے اشعار و گفتگو میں آتے وہ تمام قبائل میں رائج ہو جاتے - اسی دور جاہلیت میں عربی زبان نے ایک ادبی زبان کی حیثیت اختیار کی اسی وجہ سے یہ دور اسقدر اہم خیال کیا جاتا ہے - نیز قریش کی زبان بالکل خالص سمجھی جاتی تھی - اس وجہ سے کہ ان پر بدویت کامل طور سے غالب تھی - اور دوسری قوموں سے اختلاط نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زبان خراب نہ ہونے پائی تھی - برخلاف ان کے شمال کی وہ اقوام جو روم یا ایران کے ماتحت تھیں یا یمن کے باشندے جو تمدن اور تہذیب میں پیش پیش تھے - دوسری عجمی اقوام سے میل جول کے سبب اپنی زبان کی خصوصیت کھو چکی تھیں اور درحقیقت ان کی زبان خالص عربی کہلانے کی مستحق نہ تھی

اس دور کی عشقیہ شاعری سمجھنے کے لئے ضروری ہے - کہ پہلے عرب کے ان خاص حالات سے واقفیت ہو جن میں وہ ریگستان کے عرب جن کے دل فطری عشق سے معمور تھے - زندگی بسر کیا کرتے تھے - دور جاہلیت تک عرب کے صرف چند مخصوص حصوں میں تمدن نے قدم رکھا تھا - باقی اکثر حصہ خانہ بدوش تھا - اور خالص بدویت میں زندگی بسر کرتا تھا - یہ لوگ آب و گیاہ کی تلاش میں اپنے اونٹوں کو لئے دور دور مارے پھرتے تھے جہاں پانی اور گھاس ملتا وہیں مقیم ہو جاتے - اور جب تک پانی اور گھاس باقی رہتا وہیں خیمہ زن رہتے جب پانی اور گھاس ختم ہو جاتا خیمہ اٹھاتے اور کوچ کر جاتے - یہ لوگ عموماً خیموں میں رہا کرتے تھے اسی وجہ سے انہیں اہل وبر بھی کہا جاتا ہے - بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کسی پانی کے کنارے مختلف گھرانے اور قبائل آباد ہوتے - ایک عرصہ وہاں ساتھ رہتے - اسی عرصہ میں باہمی عشق و محبت کے رابطہ پیدا ہو جاتے اور اس کے بعد جب پانی گھاس کے ختم ہونے پر کوچ کرتے تو عاشق و معشوق دونوں مختلف سمتوں میں چلے جاتے اور لق و دق صحرا ان کے درمیان حائل ہو جاتے - اگر پھر کبھی ان مقامات سے گذر ہوتا جہاں وہ اپنے محبوب کے رہا کرتے تھے - تو یکایک ان کے جذبات کو ٹھیس لگتی - اور دلسوز اشعار انکی زبان سے نکل جاتے - جو ان کے سچے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے - زمانہ فراق میں اپنے معشوق کی صحبتیں یاد کر کے ان پر آنسو بہاتے اور اس کے حسن و جمال کا ذکر کرتے - اور اپنی بےبسی و بےچارگی کو نہایت موثر پیرایہ میں ظاہر کرتے

معشوق کی پرانی ملاقات گاہوں پر آنسو بہانا عربی شاعری کی ایک خصوصیت ہے - عرب اکثر اپنے قصائد کی ابتدا اسی طرح کیا کرتے تھے - امراء القیس نے خاص طور پر اس طرز کو آسمانِ کمال پر پہونچا دیا ؛

(سید محمد یوسف)

اسلامی خواتین سے خطاب

اے گرامی عورت تو اسلام کی
تم سے کچھ کہنا ہیں باتیں کام کی

رنگِ مغرب اور تم حیرت ہے یہ
صبحِ مشرق پر سیاہی شام کی

آفتابِ مشرقِ عزت ہو تم
سوئے مغرب کیا امیدیں نام کی

بلبلِ شیدا کے حق میں ہے ستم
یہ نمائش چہرۂ گلفام کی

وہ اٹھی چہرے سے زلفِ مشکبار
جھلملائی لو چراغِ شام کی

کیوں نہ لو چشمِ حیا پرور سے کام
کیا ضرورت خنجر و صمصام کی

گھومتی ہو پارکوں میں ننگے سر
بن کے صورت گردشِ ایام کی

دیکھ کر کہتی ہے دنیا دیکھئے
بیٹیاں ہیں باحیا اسلام کی

گل بداماں ہیں سرِ دامن کے داغ
کچھ خبر ہے جامۂ احرام کی

دیویاں ہو دین کے مندر کی تم
چاہئے ہر وقت پوجا رام کی

ہار ہو مخصوص شوہر کے لئے
کیوں بنو زینت گلوئے عام کی

اپنی قسمت دوسروں کے ہاتھ میں
خوبیاں ہیں بختِ نافرجام کی

اب تمہارے ہاتھ میں ہے آبرو
دخترِ پیغمبرِ اسلام کی

(شمیم کرہانی)

چچا چھکّن نے روزہ رکھّا

(از جناب مفتی بشیر الدین احمد بشر بی اے علیگ رامپوری)

خدا معلوم وہ کونسی گھڑی تھی جو رمضان کا چاند نمودار ہوا۔ چچا چھکن کا چہرہ اچھا خاصہ جمعتہ الوداع بن گیا۔ پاندان۔ حقہ۔ چائے کی کیتلی۔ گولی والی ڈبیا۔ سب پر مایوسانہ نظر ڈالی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "مبارک ہو۔ مگر مدّو تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا سنی سنائی کہہ رہے ہو۔ مجھے تو کہیں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ذرا میری عینک لانا"۔

اتفاق سے مطلع بھی صاف تھا اور عینک کے شیشے بھی ناک پر کمانی چڑھاتے ہی چچا نے نظامِ شمسی کے اس ٹکڑے کو آسمان کی وسعتوں میں تلاش کرنا شروع کیا اور چیں بجبیں ہو کر بولے "بکتا ہے جھوٹے۔ خواہ مخواہ گھبرا دیا۔ مگر مدّو کمبخت فوراً ہی بول اٹھا۔ "حضور مغرب کی طرف دیکھئے۔ مغرب کی طرف۔ آپ تو اُلٹی طرف دیکھ رہے ہیں"

چچا کو غصہ آنا لازمی تھا۔ کیونکہ ایک طرف تو واقعی انکی پیٹھ کعبے کو ہو رہی تھی۔ دوسرے ایک ہی جنبش میں رہی سہی امید کی جھلک ختم ہونے کا اندیشہ تھا۔ مگر چچا کو خدا نے خاص دل و دماغ عطا فرمایا ہے وہ ایسے موقعوں کبھی کھسیانے نہیں ہوتے۔ کیا مجال جو ذرا بھی گھبرائے ہوں۔ کڑک کر بولے "ہاں ہاں میں بھی جانتا ہوں چاند کدھر سے نکلتا ہے"۔ اور بیک جنبش 'اباؤٹ ٹرن' ہوگئے۔ قریب تھا کہ چچا آرکمڈیس کی طرح یوریکا۔ یوریکا چلانے لگیں مگر بوکھلاہٹ میں عینک مع کمانیوں کے چچا کی ناک کی سطح سے ہٹ کر زمین کی سطح پر آرہی۔ اور ضربات کی وجہ سے شیشے بجائے دو کے چار ہوگئے۔

کون ہے جو ایسے موقع پر برانگیختہ نہ ہو جائے۔ چچا بھی تو آخر آدمی ہی تھے۔ جوتی اتار کے آٹھ دس مدّو کے ایسی تڑاخ پڑاخ رسید کیں کہ یاد ہی تو کرتا ہوگا۔ "کمبخت کھڑا کھڑا منہ تک رہا ہے۔ ہر وقت باتیں۔ ہر وقت باتیں۔ سوائے باتوں کے کچھ نہیں۔ اور تو نے میرے جوتوں پر پالش کی۔ تو کیا کرتا جب تک پچاس مرتبہ (چچا کا غصہ پھر تیز ہو گیا اور نعلین کی ضربات شیشے کی ضربات سے سہ چند ہوگئیں) پچاس مرتبہ نہ کہا جائے۔ یاد تھوڑی آتا ہے۔ جاہٹ۔ دور ہو سامنے سے"

مدّو ہٹنے کو تو ہٹ گیا۔ لیکن ایک ہی گز جا کر کہنے لگا۔ "میں نے کیا کیا تھا۔ رمضان آگئے تو میں کیا کروں۔ عینک میں نے گرائی تھی"۔

چچا کو سامع ازل نے ایسے کچے کان عطا نہیں کئے ہیں جو اتنے فاصلے سے کوئی لفظ سن لیں۔ سمجھ گئے کہ معافی مانگ رہا ہے۔ بس پھر کیا تھا رحم و عفو کا دریا موجیں مارنے لگا۔ اور چچا سعدی کا مقولہ۔

"خطا در گذار و ثوابم نما"

کانوں میں گونجنے لگا۔ نرم لہجے سے آواز دی۔ "مدّو۔ لے یہاں آ۔ زنانے میں خبر کر دے کل ہمارا روزہ ہوگا۔ اور لے یہ جیب میں ڈال لے"

چچی پہلے ہی سے گھبرا رہی تھیں یہ سنتے ہی گرج پڑیں۔ "روزہ رکھیں گے تو مجھ پر کیا احسان۔ کل مردانے ہی میں رہیں۔ ایک تو کریلا اسپر نیم چڑھا۔ دیکھئے کیا رنگ لائیں گے"

بدقسمتی سے چچا کو کھانسی کی پرانی شکایت ہے۔ یہ موذی مرض بھی انکی جان کو ایسا لگ گیا ہے کہ دس گز کے فاصلے پر ہوں۔ چپ چاپ بیٹھے ہوں مگر اس آلۂ نشرِ صوت کے ذریعے انکی موجودگی کا علم دور دور ہو جاتا ہے اسوقت بھی چچی کو انکی آمد کا علم دو منٹ پیشتر ہی ہو گیا ——

بچوں نے بھی کان کھڑے کئے —— آخر چچا آ ہی گئے ——" وہ سنا" چچا نے کہا "مدّو نے کچھ تم سے کہا —— کل روزہ ہو گا —— میں نے خود چاند دیکھا ہے (مدّو سے) ارے ابھی باہر ہی کھڑا ہے۔ بازار نہیں گیا۔ ایسا کاہل آدمی بھی ہمارے دیکھنے میں نہیں آیا ——"

مدّو چلا ہی تھا کہ چچا نے آواز دی —" عینک بھی لیتے جانا۔ شیشے لگوانے ہیں —— اور ہاں سُن (پاس جا کر کان میں) افیون کی گولیاں ختم ہو گئی ہیں۔ ڈبیا بھروا لانا۔ رات بھر کاٹنی ہے۔ کل دن میں تو اللہ ہی اللہ ہے ——" چچا گھر میں قدم رکھتے ہی پھر لوٹ پڑے۔" ارے بلانا اسے —— یہاں آ۔ خدا جانے کمبخت کو کیا جلدی ہے۔ رمضان آتے ہی اس کی تو عقل کٹ گئی ——" مدّو لوٹ کر آیا تو چچا نے حکم دیا۔" وہ ہمارا حقہ بھی درست ہو گا۔ پرانا نیچا بدل دینا —— جا جلدی جا"

خدا خدا کر کے چچا گھر میں آئے اور اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے جو "عینکِ گم گشتہ" کے باعث "زندان —" کی کوٹھریاں بن گئی تھیں۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ مگر چند ہی منٹ بعد پھر اُلٹے پاؤں سرپٹ دوڑے اور لگے آوازیں لگانے۔" مدّو —— مدّو —— ارے کیا مر گیا۔ خدا سمجھے اسے مینہہ آرہا تھا۔ اولے پڑ رہے تھے —— بھاگڑ پڑ رہی تھی —— جو یہ کمبخت اتنی جلدی چلدیا —— صبح کو بٹیریں کیا کھائیں گی —— کیا یہ بھی روزہ رکھیں گی ——"

چچا یہ چلاتے ہوئے اور ہانپتے کانپتے ہوئے پھر گھر میں وارد ہوئے چچی نے فوراً پنکھا جھلنا شروع کیا۔ اور آخر کار وہ ان شعلوں کے بجھانے میں کامیاب ہو گئیں —— پھر کیا تھا۔ خوب روزے کا فلسفہ سمجھانا شروع کیا۔ اور چچا کو پورے آدھے گھنٹے اس موضوع پر لکچر سننا پڑا۔ چچی نے یہ آخری فقرہ بہت سمجھا کر کہا کہ "روزے میں کسی قسم کا غصہ کرنا یا لڑنا بھڑنا سخت گناہ ہے۔ روزہ مکروہ ہو جاتا ہے"

چچا نے اس قسم کے فقرے رمضان سے پہلے بھی سنے ہیں۔ وہ ایسے موقعوں پر تبسم فرمایا کرتے ہیں۔ فوراً ہی کہنے لگے" ہاں۔ یہ تو بتاؤ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے اور حرارت آج بڑھی تو نہیں ——"

چچا صبح کو اٹھے تو حسب معمول تکئے کے نیچے سے ڈبیا نکال کر ایک گولی منہ میں ڈال لی۔ اور دل ہی دل میں خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے لگے ان لوگوں کی بدنصیبی پر افسوس کرنے لگے۔ جو ابھی تک اِن لذات سے ناآشنا ہیں۔ کچھ دیر بعد چچا پورے "نونِ غنہ" بن گئے۔ اور اسی عالم میں مدّو کو (جو باضافۂ نونِ مندّو ہو گیا تھا) حکم فرمایا کہ چلم پر آگ لے آ۔

مدّو یہ بانگِ صبح سنتے ہی چونک کر بولا۔" حضور آج تو آپ کا روزہ ہے" اب تو چچا کے بھی ہوش ٹھکانے ہو گئے۔ گھبرا کر بستر سے کھڑے ہو گئے۔

"ہیں —— ارے آج تو روزہ تھا —— اور میں نے تو —— ابھی —— —— ارے جا کلّی کو پانی لا —— نالائق شیطان —— ہر کام دیر سے کرتا ہے

مسلسل پندرہ منٹ کی "گلو خیز" آواز کے ساتھ چچا نے حلق اور منہ کا غسل کیا۔ اور اس عرصہ میں اکثر بیٹھنے نما آوازیں بھی نکالیں —— مگر گولی نہ نکلنا تھی نہ نکلی —— ناچار صبر کر کے مدّو کی طرف گھور کر کہا۔ دیکھتا کیا ہے حقّہ لا —— بس روزہ تو ختم ہوا"

مرزا جی بھی گھڑی کی سوئی کی طرح وقت پر آتے ہیں۔ سات بجے اور وہ چچا کے پاس موجود —— بندۂ خدا آج تو کچھ دیر سے آئے ہوتے۔ ٹھیک اُس وقت جب چچا نے سکون و اطمینان کا سانس لے کر حقے کی نے ہاتھ میں اٹھائی تھی کہ گھڑی نے سات بجائے اور مرزا جی آدھمکے۔ چچا کو دیکھتے ہی چلانے لگے —" ہیں —ہیں —ہیں — یہ کیا حرکت — رمضان میں —— مردِ خدا آج تو صبر کیا ہوتا ——"

چچا تو جب شرماتے جب ان کا قصور ہوتا یا قصداً نہ رکھا ہوتا۔ چند ہی جملوں میں ساری واردات الف سے لے کر ی تک سنا دی اور مدّو پر اس سلسلے میں خوب بوچھاڑ کی ——" اگر اس کو ذرا بھی عقل ہوتی تو یہ ڈبیا یہاں ہرگز نہ رکھتا۔ یا کم از کم صبح ہی یاد دلا دیتا —— مگر اسے تو سوائے اپنے عیش کے کوئی فکر نہیں ہے —— مرد وہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں —— اس کی بلا سے"

مرزا جی نے کچھ دیر تامل کیا لیکن پھر فوراً ہی بہت قرأت کے ساتھ فرمانے لگے۔" حضرت یہ کیا مضائقہ ہے —— روزہ ہرگز ساقط نہیں ہوا —— اگر

کوئی چیز سہواً یا نادانستہ طور پر زیر حلق پہونچ جائے تو ساقط ہرگز نہیں ہوگا"

چچا یہ شرعی حکم سنکر خاموش ہو گئے - حقے کی گرفت بھی ڈھیلی کر دی ـــــ مگر دل سے خدا ہی جانتا تھا ـــــ آخر مدہ کو حکم دیا "حقہ اٹھالے - اب دن بھر اسے سامنے نہ لانا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا"۔

چچا کی شرعی معلومات محدود تھی مگر دنیاوی تجربات اور عام معلومات میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں - جملہ واقعات اور اپنے حسن انتظام کا ایسا خاکہ پیش کیا کہ مرزا جی بھی لوہا مان گئے کہ واقعی منتظم ہو تو ایسا ہو- ہنڈیا چولہے سے لے کر گاندھی جی کی سول نافرمانی تک کے واقعات چند گھنٹوں میں بیان کر دینا ان کا ادنےٰ کرشمہ ہے - مرزا جی پر ان کی قابلیت اور خداداد ذہانت کا سکہ پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا - اسوقت کی گفتگو نے مزید مہر تصدیق ثبت کر دی -

لیکن آفتاب اب نصف النہار تک پہونچ چکا تھا - اور مرزا جی کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو چکا تھا - کئی مرتبہ دروازے سے باہر ادھر اُدھر دیکھا جمائیاں بھی لیں لیکن چچا کی تقریر پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا - بدقت تمام مرزا جی نے امور خانہ داری کا عذر کر کے رخصت چاہی مگر چچا نے اسی عنوان پر ایسا لکچر دیا کہ مرزا جی کو بیٹھتے ہی بنی - وہ تو مقرر پر خود رمضانی خشکی غالب ہونے لگی - ورنہ مرزا جی کی قید با مشقت پورے بارہ گھنٹے سے کم نہ ہوتی ٭

ادھر مرزا جی رخصت ہوئے اُدھر چچا زنانے میں پہونچ ہی گئے چچی نے چپکے ہی چپکے "جل تو جلال تو" کا وظیفہ شروع کر دیا - روزے کی خشکی حقے کی جدائی - ڈبیا والی گولی کی یاد - کھانسی کا حملہ اور اکیلی چچا کی جان ـــــ مگر واہ رے چچا اب بھی ہنستے ہوئے داخل ہوئے - بچوں سے مخاطب ہو کر فرمایا "کہو - آج اماں جان نے کیا کیا سامان کئے ہیں ـــ شاباش (کھانسی کا مسلسل حملہ) شاباش - اب تک کتنے سوال نکالے - سلیٹ میرے پاس لے آؤ"

چچا کا نام بدنام ہے ورنہ ایسے خوش مزاج انسان دنیا میں کم ہیں - بچوں سے پورے دس منٹ ایسی دل خوش کن اور ہمت افزا باتیں کیں کہ بیک وقت پدرانہ - استادانہ اور مشفقانہ شانیں پوری آب و تاب سے جلوہ گر تھیں -

چچا نے روسو اور فروبل کے اصول تعلیم مطالعہ نہیں کئے ہیں - مگر ہم سچ کہتے ہیں - یہ سب کے سب ان کے سامنے طفل مکتب ہیں - دو لفظوں میں بچوں کے دل میں تعلیم کی خوبی اور فوائد اس دلچسپ پیرائے میں بیان کئے کہ چھوٹے میاں جھٹ پٹ اپنی تختی لکھ مع قلم و دوات کے چچا کے سامنے بغرض "اصلاح" حاضر ہو گئے -

جس نے اقلیدس کی تیسری جلد اور چچا کے ہاتھ کے بنائے ہوئے جیم کے دائرے دیکھے ہیں - خدا کو حاضر ناظر جان کر کہدے کہ کون سے زیادہ دیدہ زیب ہیں - بغیر پرکار کے اس خوبی سے جیم کا پیٹ مدوّر بنا دینا چچا ہی کا حصہ ہے ـــ قلم - روشنائی دونوں خراب اور پھر "اصلاح اول" کا تقاضہ - چچا کب تک چپ رہتے -

"نامعقول - کبھی دوات قلم ٹھیک نہیں رہتا" چچا نے گرج گرج کر کہا - روشنائی ایسی گاڑھی کہ قلم تک نہیں گرتا ـــــ جا - پانی ڈال"

چھوٹے میاں نے بموجب تعمیل حکم دوات پوری پوری پانی سے بھر دی - اور چچا نے جونہی نوک قلم کو روشنائی میں جھٹکا دیا - ساری اچکن پر چھینٹیں ہی چھینٹیں پڑ گئیں - آخر کب تک خون کا سا گھونٹ پیتے - تن بدن میں چنگاری سی لگ گئی اور برس ہی تو پڑے -

"گدھے کے بچے ـــ نامعقول ـــــ رکا تو رہو - (چچا پیچھے پیچھے اور چھوٹے میاں آگے آگے بھاگ رہے تھے)

آخر چچی کو اٹھنا ہی پڑا اور چچا اور چھوٹے میاں کے درمیان ہمالیہ کی طرح حائل ہو گئیں - مگر چچا اس آسانی سے ہتھیار ڈالنے والے نہ تھے ـــــ تختی اٹھا کر چھوٹے میاں پر جو وار کرنا چاہا تو رستم کے گرز کی داستان بے حقیقت معلوم ہونے لگی - چھوٹے میاں تو ایک ہی جست میں آنگن سے نکل کر کوٹھری میں پلنگ کے نیچے محفوظ ہو گئے - مگر چچا شیر کی طرح برابر گرجتے رہے - آخر چچی نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا - اچکن کے خراب ہو جانے پر اظہار تعزیت کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ دھوبیوں کی مسیحا نفسی کے واقعات بھی سنائے اور چچا کو یقین آ گیا کہ یہ داغ ضرور مٹ جائیں گے ٭

چچا کو غصہ روکنے کے بہت سے نسخے یاد ہیں لیکن سب سے زیادہ مجرب یہ ہے کہ وہ سخت سے سخت غصے کے وقت بھی فوراً ایک گھونٹ - آب خنک پی لیتے ہیں اور ساری حرارت فُرّو ہو جاتی ہے - چچا کی یہ عادت سب کو

معلوم ہے اور اس لئے ایسے مواقع پر ان کے سامنے پانی کا گلاس ضرور پہونچ جاتا ہے۔ چچا نے حسب معمول اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کہیں چلّو بھر بھی نہ دکھائی دیا۔ آخر خود ہی بڑھ کر پانی اُنڈیل گلاس منہ کو لگایا ۔۔ کہ چچی پیچھے سے بھاگیں اور گلاس ہاتھ میں پکڑ لیا ۔۔ "ہیں ۔ ہیں ۔۔ ذرا صبر کرو۔ آخر ایسی بھی کیا بھول ۔۔۔۔۔ تم تو بچوں سے بھی گئے گذرے ہو"

چچا نے گلاس تو زمین پر مارا اور ڈانٹ کر بولے ۔۔ "روزہ تو تمہارا ہی ہے ۔۔۔ میں کیا جانوں ۔۔۔ میرے تکئے کا غلاف سِل گیا ۔۔۔ ابھی کیوں سلا ہوگا ۔۔۔ میں بھی ابھی سارے گھر کو آگ لگادونگا ۔۔۔ "

سامنے ہی باورچیخانہ تھا ۔۔ چچا نے پھکنی۔ دست پناہ ۔۔ اور کرچھا باری باری پھینکنا شروع کیا۔ اور اب دیگچی کی باری آئی ۔۔ ماماہٹ کر ایک طرف کو کھڑی ہوگئی۔ اور چچا نے بسم اللہ کہکر بھری دیگچی کا وزن کرنا شروع کیا۔ چچی بھر دوڑیں اور دور ہی سے ایک کی بجائے دو دو غلاف ہاتھ میں لئے ہوئے اور ہوا میں لہراتے ہوئے دکھا رہی تھیں"۔ لو دونوں غلاف کل ہی تیار ہوگئے تھے۔ بس کمرے میں سے لینے گئی تھی کہ یہاں یہ .... شروع ہوگیا"

چچا کے غصہ کا اسٹیم لاکھ تیز سہی لیکن بیک وقت دو جھنڈیاں ہلتے دیکھ کر آخر انہیں رُکنا ہی پڑا دوسرے وہ "دیگچی کے معاملے" میں کچھ احتیاط بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ ہماری یاد میں ایسا واقعہ صرف دو ہی مرتبہ پیش آیا ہے جبکہ چچا نے دیگچی بالکل ہی اُلٹ دی ہے۔ ایک تو کئی سال ہوئے اس موقع پر جبکہ چچا کی چہیتی جنائی بٹیر کا رحمت خاں کے بٹیر کی ایک ہی لات میں فرار ہوگئی تھی۔ اور چچا نے دو روز کھانا نہ کھایا تھا یا ابھی دو ڈیڑھ برس ہوئے جب کانگرس اور جمعیۃ العلماء ہند کے رضاکاروں نے تمام مسکراٹ کی دوکانوں پر پکٹنگ لگادیا تھا اور چچا کو پورے تین روز تک "ڈبیا والی گولی" میسر نہیں ہوئی تھی۔

مؤذن نے عصر کی اذان دی اور چچا ان دنیا کے دھندوں کو چھوڑ سیدھے مسجد کی طرف ہولئے۔ ادھر چچا زنانے سے باہر گئے۔ اُدھر چھوٹے میاں اپنی جائے پناہ سے باہر نکلے اور ماما اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔

نماز اور رمضان کے اس لطف کا تو کوئی چچا ہی کے دل سے پوچھے جس خشوع و خضوع کے ساتھ انہوں نے آج نماز ادا کی مستقل نمازیوں کو یہ شان کہاں نصیب ہوتی ہے۔ ہر چند کہ مسجد نمازیوں سے خالی ہوگئی اور ہر شخص چار فرض ادا کرکے اپنے اپنے کام کو واپس چلا گیا مگر چچا ایسے کچے نمازی نہ تھے جو مسجد میں آکر اتنی جلد واپس ہو جائیں۔ چچا یا تو مسجد میں آنے کا نام نہیں لیتے ہیں اور جب آجاتے ہیں تو مشکل سے جایا کرتے ہیں اور آج تو گھر پر جانا بھی بے سود۔ سوائے افطار کی تیاریوں کے وہاں کیا رکھا تھا۔

چچا نے بعد نماز وظیفہ جو شروع کیا تو اٹھنے کا نام نہ لیا۔ کئی مرتبہ مدّو بھی آیا مگر چچا نے نگاہ بھی اٹھا کر نہ دیکھا بلکہ منہ پھیر پھیر لیا۔ آخر کچھ دیر مدّو نے آواز دی "حضور افطار میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ تشریف لے چلئے۔ بیگم صاحبہ نے سامان باہر مردانے ہی میں بھیجدیا ہے۔"

چچا کے وقت کے قریب آنے سے دل میں خوش ہوئے اور چچی کے اس موقع پر "سامان رسد" کی "انتقال مکانی" کر نیکا مقصد بھی سمجھ گئے لیکن تسبیح پڑھتے وقت بولنا مکروہ ہے اور چچا سے زیادہ اس مستحب فعل کا عامل کون ہو سکتا ہے فوراً ہی مدّو کی طرف گھورتے ہوئے اس زور سے "ہوں۔ ہوں" کہا کہ الٹے پاؤں ہی لوٹتے بنی۔

غرض وظیفہ ختم ہوا اور چچا اٹھ کھڑے ہوئے۔ مدّو نے سامان خورونوش بہت قرینے سے لگادیا تھا۔ ایک جھوڑ دو دو حقے بھر کر رکھدیئے تھے۔ ڈبیا بھی تپائی پر موجود تھی۔ چچا کا چہرہ "بقعۂ نور" ہو رہا تھا۔ دل ہی دل میں مدّو کے حسن انتظام کی داد دیرہے تھے۔ ملازم ہو تو ایسا ہو۔ باوفا۔ موقع شناس۔ اور پھر اس پر سلیقہ مند آخر فرما ہی اٹھے "شاباش میاں مدّو۔ شاباش۔ ذرا مرزاجی کو اور بلا لاؤ تو اچھی صحبت رہے گی"۔

مدّو مرزاجی کو بلانے چلا گیا اور چچا تخت پر آبیٹھے۔ ایک ہی نظر میں سب چیزوں کا جائزہ لے لیا۔ کھانے کی لطیف خوشبوئیں اور انواع و اقسام کی افطاری دلخوش کن چیزیں تھیں اور چچی کی استعداد و خانہ داری پر صاد کر رہی تھیں۔ چچا بھی دل ہی دل میں اس کے قائل تھے۔ لیکن انکی نظر زیادہ تر حقے اور ڈبیا پر پڑ رہی تھی اور کان موذن کی آواز پر تھے۔

یکایک چچا کو آواز آہی گئی اور بسم اللہ کہکر حقے کا دم لگانا شروع کیا۔ دن بھر کے بعد اس رفیق کو اب منہ لگایا تھا۔ چچا کا دل ہرگز چھوڑنے کو نہ چاہتا تھا لیکن پھر بھی سنت ادا کرنے کے لئے چند کھجوریں بھی کھائیں اور افطاری بھی نوش فرمائی۔ چند منٹ بعد مدّو بھی بھاگتا ہوا اور دروازہ کے باہر ہی سے چلّاتا ہوا آرہا تھا۔۔ "مرزاجی بعد افطار تشریف لائیں گے ۔۔ اذان میں بھی شاید منٹ دو منٹ ہی باقی ہیں"۔ فوراً ہی پاس کی مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں .....

کیا آپ کے مدرسے نے ابھی تک نیرنگ خیال نہیں خریدا؟ امید ہے کہ محکمہ تعلیم کے سرکلر کے بعد آپ اسے فی الفور طلب فرمائیں گے۔

افسانہ

عرب کی مہمان نوازی

(از جناب کوثر چاندپوری)

شریف مکہ کھجور کے ایک پُر فضا باغ میں چند عرب شیوخ کے ہمراہ بیٹھا ہوا قہوہ پی رہا تھا۔ بلور کے سفید چمکدار فنجانوں میں قہوے کی سرخ رنگت یوں جھلک رہی تھی جیسے گورے چٹے آدمیوں کے رخساروں میں خون اپنی تمام شوخیوں کے ساتھ جھلکا کرتا ہے:

شریف کا بڑا بیٹا ادب سے باپ کے سامنے دو زانو بیٹھا ہوا گھوڑوں کے حالات بیان کر رہا تھا۔ شریف کے اصطبل میں سیکڑوں عربی اور ترکی گھوڑے تھے۔ اسے گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا۔ اس لئے وہ عرب و عراق اور دوسرے ممالک کے قوم دار گھوڑوں کے خریدنے پر بیشمار روپیہ صرف کیا کرتا تھا۔ گھوڑوں کی نگرانی اس کے بڑے بیٹے کے سپرد تھی۔ جو شہسواری میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ قہوہ کا ایک دور..... ہو چکا تھا دوسرا شروع ہونیوالا تھا کہ شمال کی طرف سے ایک ادھیڑ عمر کا بدو گھٹی ہوئی سیاہ رنگ کی عبا پہنے مشکی گھوڑے پر سوار آیا۔ اور گھوڑے سے کود کر اپنا طویل موزہ زمین میں گاڑ دیا پھر باگ کو نیزے میں الجھا کر مجلس قہوہ میں شرکت کرنے کی غرض سے قریب آیا۔ اور نہایت بیباکی کے ساتھ جس میں عربی حریت و شجاعت کی خاص شان تھی۔ بلند آواز میں کہا ——

السلام وعلیکم!

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ کی بہت سی آوازیں ایک دم فضا میں گونج گئیں اور برادرانہ جوش و مساوات سے نووارد کا خیر مقدم کیا گیا۔ بدو، رومی قالین کا سرا الٹ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ شریف نے مزاج پرسی کے بعد قہوہ کی فنجان اسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا —— کس لئے تکلیف فرمائی۔ کوئی حاجت ہو تو بیان فرمائیے!

بدو نے اپنے نیزے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔ اسے بیچنا چاہتا ہوں آپ کو اچھے جانوروں سے دلچسپی ہے۔ پسند ہو تو خرید لیجئے!

شریف نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ گھوڑے پر ڈالی اور پوچھا کیا لوگے؟

"مجھے پانچسو روپے کی ضرورت ہے"

لیکن جانور اتنے کا نہیں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو روپے دے سکتا ہوں!

اتنے میں نہیں لوں گا۔

بدو نے ذرا تند لہجہ میں کہا۔ اور فوراً سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک کامل خاموشی طاری رہی پھر ایک بوڑھا عرب جس کی پلکیں اور بھنویں تک سفید تھیں۔ اور آواز میں لرزہ تھا بولا۔ غضب کیا شریف تم نے۔ جانتے ہو یہ گھوڑا کس نسل کا ہے —— یہ وہ گھوڑا ہے جس کے ایک کم عمر بچھڑے پر بنو ہاشم اور بنی امیہ میں عرصہ تک خونریزی کا بازار گرم رہا تھا۔ عرب میں اس سے بہتر نسل کا گھوڑا دستیاب نہیں ہو سکتا۔ پانچسو روپے میں اس کی ایال کے دو بال بھی سستے ہیں!۔

شریف سنبھل کر بیٹھ گیا اور غور سے عرب کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ آپ نے اسی وقت کیوں نہ کہا؟

میں سمجھتا تھا تم گھوڑوں کو پہچانتے ہو۔ اس کے انکار پر قیمت بڑھا دو گے مگر تمہیں اس پر آمادہ نہ پایا اور بدو بھی قیمت سنکر سیدھا چلا ہی گیا۔ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو مجھے خیال ہوا کہ تم نے گھوڑے کی اصلیت کو نہیں سمجھا اور اب تمہیں آگاہ نہ کیا گیا تو ایک اچھی چیز ہاتھ سے نکل جائے گی +

پھر اب کیونکر اُسے واپس بلایا جائے۔ معلوم نہیں وہ کس گاؤں کا رہنے والا ہے؟ اس کا پتہ چلا لینا کچھ دشوار نہیں ہے۔ وہ کوئی ہوا نہیں ہے کہ اڑ کر نکل جائے۔ یقیناً کسی دوکان پر جائے پیتا ہوا مل جائے گا۔ ورنہ اس کی جائے سکونت معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ شریف کے حکم سے متعدد آدمی بدو کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ اور مکہ کے تمام بازاروں اور سراؤں کو چھان ڈالا۔ لیکن بدو نہ ملا۔ شہر کے ایک دروازہ پر کسی نے کہا کہ چند گھنٹہ قبل ایک بدو سوار ادھر سے گذرا ہے۔

شریف کو اس اطلاع ہوئی تو سخت ملال ہوا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن بن عبداللہ سے کہا۔ تم بدوی قبائل اور ان کے قریوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے چلے جاؤ۔ اور جس قیمت میں ملے وہ گھوڑا خرید لاؤ۔ رحمٰن نے اول وقت حرم شریف میں نماز ادا کی اور اپنے سرخ رنگ کے گھوڑے پر بیٹھ کر چل دیا۔

آفتاب افق مشرق سے دو تین نیزہ بلند ہو چکا تھا۔ اور اس کی گرم گرم شعاعیں کھجوروں کے اونچے درختوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ریگ زار عرب میں جہاں پانی عنقا کا حکم رکھتا ہے بدوی قبائل کے چھوٹے چھوٹے لڑکے کھجوروں کی لمبی کمر پر بیٹھے ہوئے پانی کی طرف اس طرح دوڑے جاتے تھے جیسے مرغابیوں کے غول نالابوں کی تلاش میں آسمان پر منڈلایا کرتے ہیں۔

یہ وقت گھوڑوں کو پانی پلانے کا تھا اور لڑکوں کو روزانہ اس کام کے لئے دس بار دکوس دوڑنا پڑتا تھا۔ آج بھی وہ اسی دوڑ دھوپ میں مصروف تھے۔ رحمٰن نے انہیں روک کر عربی زبان میں کچھ دریافت کیا ——— دور ——— پیڑوں کے جھنڈ میں کھجور کی چٹائی سے بنا ہوا ایک مکان نظر آ رہا تھا ——— لڑکوں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ چنانچہ رحمٰن نے گھوڑے کا رخ اُسی طرف پھیر دیا۔ یہ ایک بدو کا مکان تھا۔ اور معلوم ہو چکا تھا۔ کہ احمد بن عمر جو کل شریف سے ملا تھا یہیں سکونت رکھتا ہے۔ رحمٰن نے دروازے کے قریب آ کر آواز دی۔ یا اخی ——— باہر آؤ!

احمد بن عمر وہی کل والا بدو جو شریف کے دربار میں صدور جہ جنگجو اور خونریز معلوم ہو رہا تھا۔ آواز سنتے ہی سراپا خلوص و انکسار بنا ہوا گھر سے نکلا اور مرحبا ——— مرحبا! کی مسلسل اور محبت آفریں آوازوں میں اس نے مہمان سے معانقہ کیا۔ مزاج پوچھا۔ پھر باہر ایک ٹاٹ سے بورئیے پر اس کو بٹھا کر اندر چلا گیا۔ اور عربی اخلاق کے موافق اجنبی مہمان سے آنے کا مقصد دریافت کرنے سے پہلے گھر میں جا کر اس کے کھانے کا بندوبست کیا۔

دو گھنٹہ بعد احمد نے رحمٰن سے کہا۔ کھانا تناول فرما لیجئے۔ یہ کہکر اُسنے ہاتھ دھلائے اور کھانا لینے چلا گیا۔ پہلے دو بڑی سینیوں میں شہد آیا اور ادب سے مہمان کے سامنے رکھدیا گیا۔ پھر چند کھجوریں۔ چار پانچ چھوارے اور جو کی روٹی کے دو سوکھے ہوئے ٹکڑے آئے یہ سب چیزیں چمڑے کے دسترخوان پر چنی گئیں۔ آخر میں ابن عمر بڑی سی قاب میں گوشت کے بڑے بڑے پارچے لے کر آیا جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ابن عمر نے نہایت عاجزی سے دریافت کیا۔

کس لئے تکلیف فرمائی؟

رحمٰن نے جواب دیا۔ کل آپ شریف کے پاس کوئی گھوڑا لے کر گئے تھے؟

ہاں گیا تھا! مگر اس نے گھوڑے کو بیچا نا نہیں۔

بیشک اس وقت شریف نے غلطی کی۔ لیکن اب وہ آپ کی بتائی ہوئی قیمت دینے پر آمادہ ہے۔ اسی لئے مجھے بھیجا ہے۔ لیجئے یہ اس کی قیمت! یہ کہکر رحمٰن نے اپنے میزبان کے آگے گنیوں کا ڈھیر لگا دیا۔

احمد نے نفرت کے ساتھ منہ پھیر کر کہا ——— گھوڑا اب میرے پاس نہیں ہے!

رحمٰن جانتا تھا۔ بدو یا وجود ضرور تمند ہونے کے اپنی غیرت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ کل شریف کی بے اعتنائی سے اس کو صدمہ پہونچا ہے۔ اس لئے اس کی عربی حمیت گوارا نہیں کرتی کہ گھوڑا اس کے ہاتھ فروخت کرے۔ اس نے کہا۔ یا اخی معاف فرمائیے۔ شریف نے گھوڑے کی قیمت بہت کم بتائی تھی۔ اسی وجہ سے غالباً آپ کو ناگوار ہوئی مگر آپ جانتے ہیں مسلمانوں میں خرید و فروخت کے وقت کسقدر احتیاط ملحوظ رکھی جاتی ہے اور سودا چکانے کے متعلق کتنے سخت احکام ہیں۔ مجھے امید ہے کہ شریف کا احترام کرتے ہوئے آپ شریف کو معاف کر دیں گے۔ اور گھوڑا مجھے دیدیں گے۔ میں شریف سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ شام تک گھوڑا لے آؤنگا۔ یوں

خالی ہاتھ کیونکر جاسکتا ہوں؟

ابن عمر کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا جو اس کے میزبان نے سمجھا۔ اس کا چہرہ جوش تہور سے سرخ ہوگا اور یقین دلانے کے لئے اس نے کہا۔

واللہ! میرے پاس وہ گھوڑا اب نہیں ہے آپ جائیے اور شریف سے کہدیجئے کہ وہ گھوڑا کسی طرح نہیں نہیں مل سکتا۔

رحمٰن کو یقین ہوگیا کہ گھوڑا احمد کے پاس اب نہیں ہے۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہاں گیا اور اس نے کسی کو فروخت کردیا۔

رحمٰن نے کہا۔ آپ مجھے اتنا بتا دیجئے کہ آپ نے گھوڑا کس کے ہاتھ بیچا ہے۔ میں دوچار گنی زیادہ دے کر اس سے لے لوں گا۔

افسوس ہے —— بھائی رحمٰن گھوڑا کسی طرح بھی آپ کے ہاتھ نہیں آسکتا وہ بیچا نہیں گیا!

پھر کیا ہوا اور کیوں نہیں مل سکتا؟

رحمٰن نے تعجب کے ساتھ دریافت کیا۔

احمد اپنے راز کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور نہ چاہتا تھا کہ اصل واقعہ سے رحمٰن کو آگاہ کرے مگر وہ پختہ ارادہ کرکے آیا تھا کہ کچھ بھی ہو گھوڑا لے کر آؤنگا۔ اس لئے اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ اور پورا قصہ رحمٰن کو سنانا پڑا۔ احمد نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

برادر عزیز۔ اُسے آپ کی تشریف آوری کی تقریب میں ذبح کردیا گیا۔ میرے پاس آپ کی دعوت کا اس سے بہتر سامان موجود نہ تھا۔

رحمٰن یہ سنتے ہی فرطِ حیرت و استعجاب سے اچھل پڑا اسے سخت ملال ہوا۔ کہ ایسا قیمتی اور صحیح النسل گھوڑا یوں ضائع ہوگیا۔ وہ متاسفانہ لہجہ میں بولا۔

آپ نے گھوڑا کیوں ذبح کیا؟ میں تو شہد اور روٹی سے بھی پیٹ بھر سکتا تھا۔

بیشک روٹی سے آپ پیٹ بھر لیتے مگر دو سوکھے ٹکڑوں کے علاوہ اور روٹی بھی گھر میں نہ تھی —— یہ بھی میرے بھوکے بچوں کا حق تھا جو میں ان سے چھین کر لے آیا تھا۔

رحمٰن کی عجیب حالت ہوگئی۔ وہ دیوانہ وار ٹکٹکی باندھے احمد کو دیکھ رہا تھا۔ احمد اس کے جذبات سے بے خبر تھا اور اپنی دھن میں مسلسل بول رہا تھا:

دو تین وقت سے بچوں نے کچھ نہ کھایا تھا۔ گھر میں چند کھجوروں کے علاوہ تھا ہی کیا جو کھاتے۔ خوش قسمتی سے آج صبح ایک دوست ادھر سے گذرا تھا اور تھوڑا سا شہد کچھ روٹی کے ٹکڑے دیتا گیا تھا۔ شہد کا زیادہ حصہ صرف ہوگیا۔ بچے مکھیوں کی طرح اسے لپٹ گئے۔ سوکھے ٹکڑوں کو البتہ وہ نہ چبا سکے۔ ارادہ تھا کہ پانی لاکر انہیں بھگو دیا جائے گا۔ اور نرم ہونے پر بچے کھالیں گے۔ اتنے میں آپ آگئے۔ اور میری حمیت نے گوارا نہ کیا کہ ایک عزیز مہمان کی تواضع سے بچا کر بچوں کو کھلاؤں جو فاقہ کی تکلیف برداشت کرنے کے عادی ہیں۔ مجھ پر قرض بھی بہت ہوگیا تھا۔ موسیٰ یہودی نے تنگ کر رکھا تھا۔ ایک طرف بچے کھانے کو مانگتے تھے۔ دوسری طرف موسیٰ مکہ کا مشہور ساہوکار اپنا قرض طلب کرتا تھا۔ موسم حج میں اس سال میرا اونٹ مر گیا تھا۔ اور حاجیوں سے جو آمدنی ہوا کرتی تھی جس کے بھروسہ پر ہم لوگ سال بھر تک قرض لیتے رہتے ہیں۔ غیر متوقع طور پر اونٹ کے مرجانے سے بالکل بند ہوگئی اور فاقہ کشی تک نوبت پہونچ گئی۔ میں گھوڑے کو کسی قیمت پر بھی الگ کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ نہ یہ ممکن تھا کہ حج سے پہلے گھوڑا بیچ کر اونٹ خرید لیتا مگر جب بچوں کا بھوک سے بلبلانا دیکھا نہ گیا اور موسیٰ کے غیر شریفانہ تقاضوں نے میری اسلامی حمیت سے کھیلنا شروع کیا تو میں نے سوچا کسی امیر کو گھوڑا دیدوں۔ میں نے سنا تھا کہ شریف مکہ گھوڑوں سے بہت دلچسپی رکھتا ہے۔ اسی لئے میں اس کے پاس گیا تھا کہ ایک اچھے گھوڑے کو اسی کے یہاں میرے گھر کا سا آرام حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ شریف کی آنکھوں میں بصارت نہیں ہے۔ نفوس کی کثرت اور دنیا کی چربی نے اسے اندھا کردیا ہے۔ مجھے پانچسو روپے کی ضرورت تھی اسی وجہ سے میں نے یہ قیمت بتائی تھی ورنہ ممکن تھا کہ اس سے زیادہ دام مل جاتے صبح تک گھوڑا گھر پر موجود تھا۔ ارادہ تھا کہ مکہ کے کسی اور امیر کے پاس لیجاؤں۔ خوش قسمتی سے اس وقت آپ تشریف لے آئے اور میں نے جو چیز اپنے بھوکے بچوں کی آہ و بکا سے بچا رکھی تھی اُسے آپ پر قربان کرنے کی عزت حاصل کر لی۔ آپ جاکر شریف سے کہدیجئے کہ اچھے گھوڑے اگر مل جائیں اور مجھ جیسا کوئی غریب بدو انہیں الگ کرنے پر مجبور ہو جائے تو پانچسو روپے میں بھی سستے ہیں!

رحمٰن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بوندیں جھلک آئیں۔ اس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ بھائی احمد گھوڑا تو اب واپس نہیں آسکتا۔ البتہ اس کی قیمت حاضر ہے۔ قبول کرلو۔ میں یہ روپیہ اب واپس نہ لے جاؤں گا۔

قبول کرلوں! یعنی گوشت کی ایک قاب کے معاوضہ میں پانچسو روپئے کی کثیر رقم قبول کرلوں؟!

استغفر اللہ! ـــــ گوشت کے معاوضہ میں اس احسان اور اخوت کے بدلے میں جو آپ نے میرے مقابلہ میں ظاہر کی۔ شریف اس نقصان کا ذمہ دار ہے۔ اور اسی کے خزانہ پر اس کا بوجھ پڑنا چاہئے۔ اگر وہ اس پر راضی نہ ہوگا تو میں اپنے پاس سے یہ رقم اس کو ادا کردوں گا۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ آپ کو موسے کے مکروہ تقاضوں سے نجات نہ دلاؤں آپ اپنا کام کر چکے اب میرا فرض ہے کہ آپ کی تکلیف کو محسوس کروں!

لیکن اتنی بڑی رقم فرض کر لیجئے کہ شریف نہ دے سکا تو آپ . . . .

کیا واقعی اپنے پاس سے ادا کردیں گے!

ـــــ یقیناً ـــــ اسی وقت دیدوں گا۔ جب شریف اس کو تسلیم کرنے سے انکار کرے گا۔

میرے لئے یہ امر بہت ہی مکروہ ہے کہ آپ کو اتنی سخت دشواری میں مبتلا کروں!

میں شریف کا چھوٹا بھائی ہوں۔ اور بڑے بھائی کی غلطی کا خمیازہ قاعدے سے چھوٹے بھائی کو بھگتنا چاہئے!

آپ شریف کے بھائی ہیں؟

جی ہاں میں اس کا بھائی عبدالرحمٰن بن عبداللہ ہوں!

احمد سر سے پیر تک کانپ گیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک بادشاہ یا ایک امیر کے سامنے کھڑا تھا بلکہ اس لئے کہ رحمٰن نے ابتک اس کے ساتھ جس طرح گفتگو کی تھی اس میں امارت و نخوت کا کوئی شائبہ تک نہ تھا یا غالباً اس بنا پر کہ وہ ایک زبردست مذہبی پیشوا کے سامنے کھڑا تھا ـــــ بالآخر اس نے رحمٰن کے اصرار سے مجبور ہوکر روپیہ قبول کرلیا!

(کوثر چاندپوری)

اے چاند! ـــــ

اشعارِ منثور

ایک چاندنی میں

(از جناب ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ حیدرآبادی)

اے چاند ـــــ!!!

!ـــ میں تجھے دیکھ رہا ہوں اور تو . . . . ؟

شاید اُن کو ـــــ!!! وہ تجھے دیکھ رہے ہیں اور تو مجھ کو! ـــــ

ـــــ مگر حیف! کاش ایسا ہوتا ـــــ!!!

ہم ایک دوسرے کے راز سے واقف نہیں ـــــ!!!

تو میری مجبوری پر ـــــ بے بسی پر ـــــ اے چاند ـــ تو ـــ آسمانی سطوت سے ہنستا ہے۔ میرا مذاق اُڑاتا ہے اور اپنے پر نور حسن کے غرور میں ـــ جو چاندنی بن کر دنیا کو پرنور کر رہا ہے۔ مجھ کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے!!!

مگر افسوس ـــــ!!! تو اس راز سے قطعاً ناواقف ہے ـــــ!!!

میری لیستی کا زینہ ـــ تیرے بام سطوت سے کہیں زیادہ بلند ہے ـــ اور میرے دل کی گہرائی لامحدود! تیری حسین شعاعیں میرے دل میں داخل نہیں ـــ ہاں ـــ بیشک ـــ داخل نہیں ہوسکیں ـــ جب تک تو ـــ اُن کا عکس میرے پُر انتظار و شبنم ریز آنکھوں کو نہ دکھلائے گا! اور اُن کا راز مجھ پر افشا نہ کرے گا ـــ

میں تیری حسین شعاعوں کو ہرگز ہرگز ہرگز اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا ـــ اور ـــ تیری مضحکہ خیز خندہ زنی سے ہرگز ہرگز متاثر نہیں ہوسکتا!!!

(ڈاکٹر محمد عباس علیخاں لمعہ)

ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کی علمی ترقیاں

(از جناب مالک رام صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی)

اس امر میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ کہ ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں نے دنیا کے تہذیب وتمدن میں بہت زبردست حصہ لیا ہے۔ اسلام نے عہد وسطیٰ کے عیسائیوں کی طرح علم وفن کی ترقی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ بلکہ اس لئے آزاد خیالی اور علمی تحقیق وتفتیش کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے ان چیزوں کو مذہب کا جزو قرار دیدیا۔ مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ ارض وسما پر خداوند تعالےٰ کی صفات کے مظہر کی حیثیت سے نگاہ ڈالے۔ اس پر غور وتدبر کرکے انہیں بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے استعمال کرے۔ اور یہ بھی عبادت الٰہی کا حصہ ہے۔ مذہب کی یہی ترغیب تھی۔ جس نے ابتدائی مسلمانوں کو علم وفن میں اتنی زبردست اور حیرتناک ترقی کرنے کے قابل بنا دیا۔ اگر ان کے کارناموں پر تفصیل سے نظر ڈالی جائے تو اس کے لئے دفتروں کی ضرورت ہے۔ دنیا جسقدر تہذیب میں ترقی کرتی جائے گی۔ اتنا ہی اُسے خدمات بنی آدم کا احساس زیادہ ہوگا۔ اور انہیں نگاہ قدر ومنزلت سے دیکھا جائے گا:

دنیا کی ترقی

تاریخ شاہد ہے کہ اسلام نے بعض نہایت پست اور غیر ترقی یافتہ اقوام کو اخلاقی اور مادی ترقی کے معراج کمال تک پہنچا دیا۔ جس ملک کو بھی انہوں نے فتح کیا۔ پرانے اسرائیلیوں کیطرح وہاں کے باشندوں کو تلوار کے گھاٹ نہیں اُتارا۔ بلکہ انہیں ایک نئی زندگی دی۔ جس کا نصب العین بلند تھا۔ اور انہیں تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچایا اس طرح کئی وحشی قومیں مہذب اور متمدن ہوگئیں۔ عرب جس ملک میں بھی پہنچے انہوں نے اسے اپنا وطن بنالیا۔ انہوں نے مفتوح علاقے کی تہذیب کو اپنا لیا اور اپنے اس نئے وطن کی ذہنی۔ اخلاقی اور مادی ترقی کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور لطف یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں اسلام کی علمی و ذہنی ترقیاں جن اشخاص کی مرہون منت ہیں۔ وہ عرب نہیں تھے۔ بلکہ ان لوگوں کی اولاد تھے۔ جنہوں نے ابتدائی زمانہ میں عرب چھوڑ کر دوسرے ملکوں کا اپنا وطن بنالیا تھا۔ جہاں کہیں بھی ..... اسلام پہنچا۔ وہ جگہ مرکز علم وفن بن گئی۔ اور علم وادب۔ فنون لطیفہ۔ سائنس اور صنعت وحرفت میں مشاہیر پیدا ہوئے۔ دمشق۔ قرطبہ۔ غرناطہ۔ بغداد اور قاہرہ وقتاً فوقتاً اسلامی تہذیب کے مرکز بنے رہے۔ اور ایشیا۔ یورپ اور افریقہ میں اس وقت علم کے مشعل بردار تھے۔ جب مغرب توہمات اور جہالت کے چاہ ضلالت میں غوطے کھا رہا تھا:

یورپ پر اسلام کے احسانات

یورپ اپنی ترقی کے لئے اسلام کا اس سے سوا مرہون منت ہے جتنا اسے اعتراف ہے۔ جب تک وہ کلیسا کے زیر اقتدار رہا۔ اس میں کسی طرح کی ترقی کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ نہ صرف یہ بلکہ عیسائیت کے ظلم کے نتیجہ میں رومن اور یونانی ترقیوں کے آثار بھی محو ہوگئے۔ یورپ کے اس اخلاقی و ذہنی جمود کے زمانے میں یہ مسلمان ہی تھے۔ جنہوں نے دنیا کی شاہراہ ترقی پر مقدمۃ الجیش کا کام دیا۔ ایک زمانہ تھا جب یورپ میں علم صرف عربی زبان کے واسطے سے ہی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اس کی نشاۃ ثانیہ تک جس نے اسے طویل خواب غفلت سے بیدار کیا۔ اسلامی تعلق واثر کا نتیجہ تھی۔ اگر مسلمان اسپین کو فتح نہ کرتے۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ یورپ کتنی مدت اور اسی وحشیانہ حالت میں رہتا۔ دنیا نے سائنس اور علوم وفنون کی تمام ترقیاں اسلامی اندلس کی منت پذیر ہیں۔ جہاں سے سارے براعظم یورپ نے روشنی حاصل کی۔ تمام علوم خواہ وہ ہیئت کا ہو یا ریاضی کا طبیعیات کا یا فلسفہ کا اسلامی اسکولوں سے لیا گیا تھا۔ مارٹن لوتھ سے لے کر

لنین کے زمانہ تک کوئی ہندی - اخلاقی یا سیاسی اصلاح ایسی نہیں ہوئی جس پر اسلامی اثر کی مہر نہ لگی ہو - ڈریپر نے سچ کہا ہے - جس طرف بھی ہم دیکھتے ہیں - ہمیں جنگ وامن اور علم وفن کے میدان میں اسلامی اثرات نظر آتے ہیں

ڈاکٹر کیمبل نے جو ایک مشہور انگریز سائنسدان ہیں - اپنی کتاب "عربی طب" میں لکھتا ہے "جب یورپ عہد ظلمہ میں دماغی ظلمت کی گہرائیوں میں غوطے لگا رہا تھا - خلفائے بغداد و قرطبہ کی سرپرستی میں دنیائے اسلام تہذیب وتمدن کی بلندیوں پر صعود کر رہا تھا - اور ایک ایسے زمانہ میں جب عہد وسطیٰ کے بیرن اور اعلےٰ خاندانوں کی خاتونیں اپنے دستخط تک نہیں کرسکتی تھیں - مسلمانوں کا قریبًا ہر نوجوان مرد اور عورت آسانی سے لکھ پڑھ سکتا تھا:۔

کنیاس یونیورسٹی کے پروفیسر فرانک بلیک مور نے اپنی مشہور کتاب انسان کی اجتماعی تاریخ میں لکھا ہے:۔

"جو ملک بھی فتح ہوا - وہاں پہلا کام ایک مسجد کی تعمیر کا ہوتا تھا - جہاں اللہ کی عبادت ہو اور اس کے رسول (صلعم) پر درود بھیجا جائے اس مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ہوتا تھا - جس میں قرآن کے پڑھنے اور لکھنے کی تعلیم دی جاتی تھی - اسی بنیاد سے سائنس اور علم وادب کی عمارت اٹھائی جاتی تھی - اور ان کے بعد وہ دنیا جہان کے خزائن علم وفن کو حاصل کرنے میں لگ جاتے تھے - نقل کے بعد وہ ایجاد کے میدان میں تگ ودو کرتے تھے اور اس طرح انہوں نے دنیا کے علم میں قابل قدر اضافہ کیا - مدرسوں کی بنیادیں رکھی گئیں - اور کتب خانے تعمیر ہوئے جن سے علم کے مستقل چشمے پھوٹ نکلے"۔

سائنس میں ترقیات

مسلمانوں نے بہت تھوڑے عرصہ میں سائنس کے میدان میں حیرتناک ترقی کی - آج سے تیرہ سو سال پہلے انہوں نے کئی ایسی چیزوں کا خیال کیا - جو آج دریافت ہو رہی ہیں - انہوں نے ان اشیا کے خواص اور صلاحیتوں کا مطالعہ کیا - جو آفرینش سے نہ کسی نے دیکھی تھیں - اور نہ ان پر غور کیا تھا - درحقیقت انہوں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس پر سنجیدگی سے غور نہ کیا ہو - انہوں نے کیمسٹری - ہیئت - ریاضی - طب میں نہایت اہم تحقیقات کی - انہوں نے تاریخ اور جغرافیہ میں خاص مہارت پیدا کی - انہوں نے سیاست علم الطبیعہ - علم طبقات الارض اور علم نباتات میں نہایت قیمتی اضافہ کیا - مسلمان طالب علم مصوروں کی معیت میں دور دراز کا سفر کرتے تھے - مختلف طرح کی نباتات کا نہایت وقت نظر سے مطالعہ کیا جاتا تھا - قلم اور برش سے اس کی تصویر کاغذ پر کھینچی جاتی تھی - الجیرن ایک ماہر علم نباتات چالیس برس تک ہندوستان کے طول وعرض میں پھر کر مسالہ جمع کرتا رہا - اس کے علاوہ مسلمانوں نے اور کئی علوم میں تحقیقات کر کے کتابیں لکھیں - مثلاً جہاز رانی - زراعت - فلاحت اعداد وشمار - علم الانساب اور جغرافیہ میں ان کا قابل قدر کارنامے موجود ہیں یہاں تک کہ جدید ترین ایجاد ہوائی جہاز سے بھی وہ ناواقف نہیں - - - -

. . . . خلیفہ المامون کے عہد میں ایک انجینیر عبدالقاسم نے ایک طیارہ تیار کیا - لیکن وہ پرواز میں گر کر ٹوٹ گیا اور انجینیر کی جان علم کی بھینٹ ہو گئی -

آٹھویں صدی میں خلفائے عباسیہ نے بغداد کا مشہور دارالفنون قائم کیا - جہاں مشہور ریاضی دانوں اقلیدس - ارشمیدس اور اپالونیس - ہیئت دان بطلیموس اور ماہرین نباتیات ہیپوکرٹیس اور ڈائیموڈس کی کتب کے ترجمے کئے گئے - اس جگہ اور دوسری علمی درسگاہوں میں اسوقت یونانی تہذیب کو قائم رکھا گیا - جب بازنطینیہ کے باہر غیر مسلم دنیا میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی - خلیفہ ہارون الرشید کے قائم کردہ بیت الحکمت کے کتب خانہ میں سنسکرت - یونانی - قبطی - کلدانی - اور فارسی زبان کی سیکڑوں ہزاروں کتابیں تھیں - عربی کی کتابوں کا تو کہنا ہی کیا - خلیفہ الحاکم کا کتب خانہ اتنا عظیم الشان تھا کہ اس کی فہرست ۲۰ جلدوں میں مرتب ہوئی تھی:۔

کیمسٹری

حالیہ کیمسٹری جیسا کہ ہمبولٹ کی رائے ہے "متفقہ طور پر مسلمانوں کی ایجاد ہے" - اس میدان میں ان کی کامیابی نہایت دلچسپ ہے - انہوں نے سیماب سکہ - تانبہ - چاندی اور سونے کے خواص کی تحقیقات کی - وہ ان کے شگفتہ اور کشتے تیار کرنے کے طریقوں سے واقف تھے - کئی الفاظ مثلاً المبک اور الکلی وغیرہ عربی سے نکلے ہیں - جبیر ابن حیان (جو مغرب میں جیبر کے نام سے مشہور ہے) قریبًا پانچسو کتابیں کیمسٹری کے موضوع پر لکھی ہیں اس نے پہلی بار گندھک کا تیزاب - چاندی اور پارہ کا مرکب اور کئی دوسرے

مرکب پہلی بار دریافت کئے۔ مسلمانوں نے ہی دنیا کو پہلی دفعہ تقطیر۔ فلٹر کرنے اور بلور بنانے کا طریقہ .... ظاہر کیا۔ وہ مائع کو بخارات میں تبدیل کرنے کا گُر جانتے تھے۔ یورپ میں سب سے پہلے اسلامی اندلس میں کیمسٹری کی بنیاد رکھی گئی۔ اور اگر مسلمانوں کو پائیٹرز کے مقام پر افسوسناک شکست نہ ہوتی۔ تو یہ اپنے عروج پہنچ جاتی۔ جلد کی آخری مسلمان کیمسٹری دان تھا۔ اس کی وفات ۱۳۶۱ء میں ہوئی۔

علم ہیئت

کہا جاسکتا ہے۔ کہ مسلمانوں نے اپنا نام آسمان پر لکھ دیا۔ انہوں نے اپنی رصدگاہوں میں کئی نئے ستارے دریافت کئے اور انہوں نے شعبے بنائے انہوں نے نظام شمسی کی حرکات اور دوسرے اجرام فلکی کے متعلق بیسیوں دریافتیں کیں۔ انہوں نے زمین کا حجم اور چاند کی گردش اور بروج کی تبدیلیوں وغیرہ کی تحقیقات کی۔ ابن رشد نے سورج کے داغ معلوم کئے۔ ابوالحسن نے فضا کا انعکاس معلوم کیا۔ المیمون نے محور کا جھکاؤ معلوم کیا۔ ابن یونس نصیر الدین یوسی اور البیرونی اور نہایت اعلےٰ ہیئتی نقشے تیار کئے۔ البیرونی نے نقشے تیار کئے۔ البیرونی کے نقشے لاطینی میں ترجمہ ہوئے۔ اور یہیں سے یورپ میں علم ہیئت کی بنیاد پڑی۔ یورپ میں محمد فرغانی کی کتابیں ترجمہ ہو کر پہنچیں ابو یونس اور ابتان مسلمانوں کے عظیم ترین ہیئت دانوں میں سے ہوئے ہیں۔ یہ مسلمان ہی تھے۔ جنہوں نے یورپ میں سب سے پہلے رصدگاہیں تعمیر کیں اور دوربین قطب نما۔ پنڈولم اور گھڑی اور دیگر مفید چیزیں ایجاد کیں۔ اسلامی سلطنت کی سب سے مشہور رصدگاہ مرغانہ میں ۱۲۵۹ء میں تعمیر ہوئی۔ جو طرطوس کے قریب ہے۔

علم ریاضی

ریاضی کی اعلےٰ شاخیں قریبًا ساری کی ساری مسلمانوں کی قابلیت کی آئینہ دار ہیں۔ اس اہم مضمون میں مسلمانوں نے متعدد مقامات پر ترقی کی عربی ہندسے۔ طریقہ اعشاریہ اور تحویل نے جو یورپ نے مسلمانوں سے حاصل کیں علوم کی ترقی میں بہت مدد دی۔ ان کے زمانہ میں مسلمانوں نے دنیا کی ہیئت مکانیات اور ریاضی۔ الجبرا۔ اعداد و شمار۔ شعبہ مخروطیہ میں دنیا کی رہنمائی کی۔

اس کے علاوہ دوسرے شعبہ جات میں مسلمانوں کی ایجادیں قابل فخر ہیں۔ جیومیٹری میں یہ مسلمان ہی تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے اقلیدس کا ترجمہ کیا۔ اور اسے استعمال میں لائے۔ یہ سولھویں صدی تک کسی یورپی زبان میں ٹھیک طرح ترجمہ تک نہیں ہوا تھا۔ مسلمانوں نے ہی پہلی بار الجبرا کو جیومیٹری میں استعمال کیا۔ انہوں نے دوسری طاقت کی مساوات دریافت کیں۔ اور اسی سے چار طاقت کی مساوات اور بائینومیل تھیورم (
) تک ترقی کی۔ انہوں نے کروی علم زوایاءِ ثلاثہ کو ایجاد کیا۔ اور سائین و کوسائین کو داخل کر کے انہوں نے پیمائش اور علم ہیئت کی ترقی میں بہت حصہ لیا۔ پنڈولم کی ایجاد سے وقت کی درستی اور اصطرلاب کی ایجاد سے اجرام سماوی کی گردش کی صحیح دریافت بھی مسلمانوں کی ممنونِ احسان ہے۔

علم طب

موجودہ یورپی علم طب کا بانی ابن سینا تھا۔ جو مشہور زمان مسلمان طبیب تھا جس کا علم المفردات ابتک متداول ہے۔ حالیہ دواخانے بھی مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ ابن زہر دواخانوں کا بہت زبردست نقاد تھا۔ اس نے دوسروں کے ساتھ دنیا کے مختلف حصص سے جمع کردہ ادویہ کا اثر انسانی جسم پر معلوم کیا۔ اور اس طرح کئی دریافتیں کیں۔ مسلمان طبیبوں نے سب سے پہلے بیہوش کرنے والے طریقوں کا استعمال کیا۔ قرطبہ کی AL Bucasis دنیا کا مشہور سرجن (جراح) گذرا ہے۔ مشہور جراحوں۔ ماہرین امراض چشم۔ دنداں سازوں اور امراض مستورات کے ماہرین کی بھی کمی نہ تھی۔ ان میں کئی ایسے تھے جو کسی ایک مرض میں خاص دسترس رکھتے تھے۔ آنکھوں کے امراض کا علاج بہت حد تک مسلمانوں کا معلوم کردہ ہے۔ ابوالحسن منصف الموصلین نے ہوا کا وزن دریافت کیا۔ اور بصارت کے متعلق یونانیوں کی کئی اغلاط کی تصحیح کی۔ اور جس نے پہلی بار تاریخ میں دکھایا۔ کہ آنکھوں میں روشنی کی شعاعیں باہر سے آتی ہیں۔ نہ کہ آنکھ سے نکلتی ہیں۔ اور ثابت کیا۔ کہ اس پر جو اثر ہوتا ہے وہ اعصاب کے ذریعہ دماغ تک پہنچتا ہے۔ اس نے معلوم کیا۔ کہ روشنی کا انعکاس فضا کی حالت وغیرہ سے تبدیل ہو جاتا ہے۔

بغداد میں جو ایک وقت اسلامی دنیا کا مرکز تھا۔ مختلف شعبوں کے ۸۶۰ ڈاکٹر تھے۔ جو اپنی اپنی صنعت کے ماہر تھے۔ ڈاکٹروں اور کیمسٹوں کو

نیرنگِ خیال میں چند ایسے مضمون نگار بھی لکھتے ہیں جو کسی دوسرے رسالے میں لکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔

کام شروع کرنے سے پہلے ایک امتحان میں بیٹھنا اور لائسنس لینا پڑتا تھا۔ ساری اسلامی دنیا میں شفاخانے تھے۔ جہاں مختلف بیماریوں کے مریضوں کی رہائش کا علیحدہ علیحدہ انتظام تھا۔ بلا امتیاز مذہب وملت اور نسل ورنگ مریضوں کو ان شفاخانوں میں داخل کیا جاتا تھا۔

تاریخ وجغرافیہ

عربی میں کئی ایک ایسی لاثانی کتابیں ہیں۔ جن میں علوم طبیعیہ کا نہایت تفصیلی ذکر ہے۔ مسلمانوں نے اس وقت زمین کے کروی ہونے کا اعلان کیا جب پادریوں سے مرعوب یورپ ببانگ دہل اعلان کر رہا تھا۔ کہ زمین چپٹی ہے۔ تاریخ کے میدان میں مسلمانوں کے کارنامے اتنے مشہور ہیں کہ ان کا تفصیلی ذکر تحصیل حاصل سے کم نہیں۔ انہوں نے ہزارہا کتابیں اس موضوع پر لکھیں۔ جن میں بعض کی ضخامت اسی اسی جلدوں تک ہے خلاصہ یوں سمجھئے۔ کہ ایک ہزار برس تک مسلمان تاریخ کے مالک ہیں۔ وہ علم وفن کے مشعل بردار رہے۔ اور انہوں نے دنیا میں تہذیب وتمدن کی روشنی پھیلائی۔ اگر وہ بھی مغرب کے لئے یہ علمی ورثہ نہ چھوڑ جاتے۔ تو آج ہرطرف جو ترقی وہاں نظر آرہی ہے۔ یہ ناممکن ہوجاتی۔ مسلمان دنیا کی ترقی کے مقدمۃ الجیش تھے۔ لیکن یہ اسی وقت تک رہا کہ وہ صحیح معنوں میں مسلمان اور قرآن وشریعت اسلام پر عامل رہے۔ جونہی انہوں نے اسلام کے بلند نصب العین کو آنکھ سے اوجھل کردیا۔ ان کا تنزل شروع ہوگیا۔ مغرب کے ساتھ اس کے الٹ ہوا۔ جب تک وہ لوگ پکے عیسائی رہے۔ انہوں نے کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کی۔ جونہی انہوں نے کلیسا کا بھاری جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔ انہوں نے تہذیب وتمدن اور دیگر علوم میں قابل قدر ترقی کی۔ ایک صورت میں ایک پرانے اور ترقی پذیر مذہب کا اثر اور دوسری صورت میں مذہبی روح کا فقدان اور مادی اسپرٹ کی موجودگی ان دونوں کی تاریخ عروج میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اسلام سے پہلے سارے مذاہب نے انسان کی اخلاقی ترقی تک اپنے آپ کو محدود رکھا اور قریباً اس کے دنیوی پہلو کو بالکل نظرانداز کردیا۔ اسلام کے اثر کے ماتحت جس کا سب سے بڑا مقصد خدمت بنی نوع انسان ہے۔ مسلمانوں نے ان چیزوں کی طرف توجہ کی جو مخلوق مادی منفعت کا ذریعہ ہوسکتی ہیں انہوں نے دیکھا کہ انسان کی مادی ترقی کا انحصار اس کا قوائے فطرت کو مغلوب کرلینے پر ہے۔ پس وہ علوم مفیدہ مثلاً کیمسٹری۔ ہیئت۔ طب زراعت۔ گلہ رانی۔ جہازرانی وغیرہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اگر پیغمبر اسلام کی بعثت سے پہلے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسان قوائے فطریہ پر قابو پاکے ان کو بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے استعمال کرسکتا ہے۔ تو اسلام کے ظہور سے صدیوں پہلے یہ چیزیں مفید ثابت ہوسکتی تھیں۔

اسلام عیسائیت اور تہذیب

جن لوگوں پر مذہب کا کچھ زیادہ اثر نہیں۔ اور جو خدا سے زیادہ مخلوق سے ڈرتے ہیں۔ ان کی نمایاں ایجادیں۔ اسلحہ اور سامان جنگ۔ بھک سے اڑ جانے والے مواد۔ زہر وغیرہ وہ اشیاء جو امن اور تعمیر سے زیادہ تباہی اور تخریب کا سامان ہیں۔ ایسی چیزیں ہیں۔ اگر ان کے مذہب کا ان پر کافی اثر ہوتا۔ تو حضرت عیسےٰ کے پیرو (جن کی تعلیم یہ ہے۔ کہ اگر تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال سامنے کردو) کبھی ان تباہی کے آلات کی ایجاد میں اتنا شغف نہ دکھاتے۔

ایک ہزار برس کی عظمت۔ دولت اور غلبہ کے بعد مسلمانوں میں تعیش اور آرام پسندی کی عادات آنے لگیں۔ اور ان کا تنزل شروع ہوگیا۔ روحانی بےحسی اور دماغی جمود اس کے قدرتی نتائج تھے۔ یہی حال دوسری مذہبی جماعتوں کا بھی ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس کے لئے اسلام ذمہ دار نہیں۔ بلکہ یہ سب کچھ مسلمانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اسلام سے پہلے اور بعد کی دنیا پر ایک نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ اس میں کیا کیا صلاحیتیں ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کا زوال اسلام سے منسوب نہیں کیا جاسکتا یہ سخت ناانصافی ہوگی۔ کہ آج کل کے مسلمانوں سے اسلام کا اندازہ لگایا جائے حقیقی اسلام جو حیات اور نور ہے۔ اس چیز سے بہت مختلف ہے۔ جو اسوقت اسلام کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تو مردہ رسوم اور بےمعنی رواجات کا مجموعہ ہے لیکن اسلام کی نہضت ثانیہ کے آثار نمایاں ہیں۔ ترکی۔ ایران۔ عرب مصر۔ افغانستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں ترقی کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ اور کام شروع ہوچکا ہے۔

مالک رام

سُہاگ کا دان

(سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے کے فلمی افسانہ کی ایک جھلک)

(۱) راج بھون کے سنہری کلس اور اونچی ممٹیاں غروب ہوتے ہوئے سورج کے سامنے اندھیری اور اُداس نظر آ رہی تھیں ۔

دور بلندی پر لگا ہوا جھنڈا اُداسی سے لٹک رہا تھا ۔

سامنے ایک ممٹی پر بیٹھی ہوئی چیل نوحۂ روز روشن چلچلا رہی تھی ۔

اندر دربار کا کمرہ ویران پڑا تھا۔ سنگھاسن ایک کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا ۔

نیچے پاؤں رکھنے کی چوکی پر ایک مرجھایا ہوا پھول پڑا تھا ۔

انواسی میں سنگ مرمر کی ایک چوکی پر ایک بیش قیمت کھرل رکھی تھی۔ دو زنانہ ہاتھ اس میں ایک دوا پیس رہے تھے ۔

ایک دوسرے زنانہ ہاتھ نے ایک جڑاؤ پیالہ چوکی پر رکھ دیا جو ریشم کے رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ چھاننے کی غرض سے کھرل کی دوا ریشم کے رومال میں اُلٹ دی گئی ۔

ایک ہاتھ نے دوسری دوا کا شیشہ چھنے ہوئے عرق کے پیالے میں اُلٹ دیا ۔

دو ہاتھوں نے ایک ننھی سی خوشنما طشتری بڑھائی۔ جس میں دوا کا جڑاؤ پیالہ رکھ دیا گیا۔ طشتری والے ہاتھ اونچے ہونے شروع ہوئے ۔

(۲) جمنا طشتری میں دوا کا پیالہ لئے راج بھون کے صحن میں سے گزر کر اندر دالان میں جا رہی تھی ۔

راج بھون کے صحن پر حسرت اور اُداسی برس رہی تھی۔ ملول و متفکر داسیوں کی ٹولیاں جگہ جگہ کھڑی تھیں۔ جمنا ان کے پاس سے گزرتی۔ تو اسے دیکھ کر وہ فکرمندی کی سرگوشیاں کرتی کرتی رک جاتیں سر آہستہ سے موڑ کر جمنا کو دیکھتیں اور جیسے پھر سرگوشیاں کرنے کو سر موڑ لیتیں جمنا خاموش ان کے پاس سے گزرتی چلی گئی ۔

صحن سے تین سیڑھیاں دالان میں جاتی تھیں۔ سیڑھیوں پر چند اور داسیاں سست سست اور سر تھامے بیٹھی تھیں۔ جمنا کو دوا لاتے دیکھ کر ایک نے ہلکی سی آہ بھری۔ سب جمنا کو تکنے لگیں۔ جمنا نے ان پر ایک نظر ڈالی اور چپ چاپ گزرتی چلی گئی ۔

(۳) جمنا ایک لمبے اور خالی دالان میں سے گزر رہی تھی۔ سارے دالان میں ستونوں کے مدھم اور لمبے لمبے سائے پھیلے ہوئے تھے ۔

ایک ستون کا سہارا لئے نوجوان وکرم خاموش کھڑا تھا۔ سر پیچھے کو ڈالے بے پرواہ انداز میں اوپر کو تک رہا تھا۔ جمنا کے قریب آنے پر وہ چونکا اور سیدھے کھڑے ہو کر دلچسپی کی نظریں اس پر ڈالیں۔ جمنا نے اسے دیکھا۔ دوپٹے کی اوٹ کر کے بڑھتی چلی گئی اور موڑ مڑ گئی۔ وکرم آہستہ آہستہ اس کے پیچھے بڑھا اور موڑ پر پہنچ کر رک گیا ۔

(۴) ایک بند دروازے پر پہنچ کر جمنا نے ہلکی سی دستک دی۔ دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے کھلا اور بوڑھا وید چوکھٹ میں آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر غم اور ناامیدی لکھی تھی ۔

جمنا نے اس کا چہرہ تکتے تکتے طشتری اس کی طرف بڑھا دی ۔

وید ذرا دیر کھوئی ہوئی نظر سے طشتری کو دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ ہلکے سے واپس لے جانے کو ہلا دیا۔ جمنا کی آنکھوں میں خوف جھلکنے لگا ۔

وید نے ایک آہ بھری۔ واپس اندر جانا چاہتا تھا۔ کہ نظر وکرم پر پڑ

وکرم وید کو تکتا ہوا دروازے کے قریب آرہا تھا۔ قریب پہنچ کر آہستہ سے بولا۔ "وید جی!"

وید نے مایوسانہ انداز میں وکرم کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وکرم نے پوچھا۔

"کیسے ہیں بھائی؟"

وید نے سر پھیر کر ایک نظر اندر ڈالی۔ وکرم نے بھی ایڑیاں اُٹھا کر اندر دیکھنا چاہا۔ وید نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ وکرم نے سر جھکا لیا۔

وید نے پوچھا۔ "رانی جی کہاں ہیں؟"

وکرم نے جواب دیا۔ "چڑھاوے لے کر مندر گئی ہوئی ہیں"

وید آہ بھر کر بولا۔ جاؤ۔ انہیں بلوا لو۔ اب پرارتھناؤں کا سمے نہیں رہا۔"

یہ کہہ کر وید اندر چلا گیا۔ جمنا سن سی کھڑی رہ گئی۔ وکرم ایک پل کے توقف کے بعد جلدی جلدی واپس چلا گیا۔

(۵) دالان میں سے گزر کر وہ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔

(۶) کمرے میں وکرم کا دوست سورج مل فرش پر آلتی پالتی مارے پانسہ پھینکنے کی مشق کر رہا تھا۔ وکرم داخل ہو کر دروازے کے قریب رُک گیا۔ سورج نے اُسے دیکھا اور بھنووں کو یوں ہلایا۔ گویا معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جواب میں وکرم نے تردد کا چہرہ بنا کر سر ہلا دیا۔ سورج کھڑا ہو گیا۔" تو پھر چنتا کاہے کی ہے۔ راج پاٹ کا مالک بن جائے گا۔"

وکرم نے یوں سر ہلایا۔ گویا سورج نے ایک نامناسب بات کہی ہے۔

سورج بڑھ کر وکرم کے پاس آ گیا۔ "وید جی کیا کہتے ہیں؟"

وکرم نے آہ بھر کر کہا۔ "کہتے ہیں۔ پرارتھناؤں کا سمے نہیں رہا۔ رانی جی کو مندر سے بلوا لو۔"

سورج نے مصنوعی غم سے ایک آہ بھری۔

وکرم بولا۔ "سورج۔ میں یہیں ٹھہرتا ہوں۔ تم جلدی سے مندر میں جا کر بھابی کو خبر پہنچاؤ۔"

سورج مستعد ہو کر بولا۔ "ابھی لو"

(۷) مندر میں رانی مورتی کے سامنے سیڑھیوں پر سر رکھے پڑی تھی۔

مندر سنسان تھا۔ چپ چاپ صرف رانی کی ہلکی ہلکی آہوں اور سسکیوں سے ٹوٹ رہی تھی۔ اس نے اپنا اشک آلود چہرہ اٹھا کر مورتی کو دیکھا۔ اور دکھ سے بولی:۔

"پربھو۔ مجھ ابھاگی پر دیا کیجئے۔ مجھ دکھی پر دیا کیجئے۔"

وہ اپنے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے کے آنچل سے پونچھ رہی تھی۔ تو جیسے رانی کی پرارتھنا کے جواب میں ایک ہلکا ہلکا گیت سنائی دینے لگا جو کہیں دور سے آرہا تھا۔ ایک ایسی آواز کا گیت جس کے گہرے سروں کے سوز میں کوئی غیب کی آواز تلقین کرتی معلوم ہوتی تھی۔

تیرے دُکھ کی دوا دنیا میں نہیں ؛ تیرا سکھ پربھو کے چرن میں ہے

رانی کا ہاتھ آنسو پونچھتے پونچھتے رُک گیا۔ اس نے آنچل چہرے پر سے ہٹا کر غم کی کھوئی ہوئی نظروں کے ساتھ کان گیت پر لگا دیئے۔ جو آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا اور واضح ہوتا جارہا تھا۔ سنتے سنتے آنسو اس کی آنکھوں میں اُبل پڑے۔ اور وہ مورتی کی طرف بیقراری سے ہاتھ پھیلا کر بولی۔" تمہارے چرن میں۔ پربھو تمہارے چرن میں۔ میں اپنا دکھ لے کر تمہارے چرن میں آئی ہوں۔ **میرے سہاگ پر مرتیو کی چھایا** کانپ رہی ہے۔ مجھ پر دیا کیجئے۔ مجھ پر دیا کیجئے۔"

(۸) وشنو بھگت۔ مندر کا بڈھا پجاری گاتا ہوا مندر کی طرف بڑھ رہا تھا!

تیرے دُکھ کی دوا دنیا میں نہیں ؛ تیرا سکھ پربھو کے چرن میں ہے

(۹) مندر کے باہر چبوترے پر رانی کی داسیاں موجود تھیں۔ ایک دو یہاں کھڑی تھیں۔ ایک دو وہاں۔ کوئی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی کسی نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ سب کی سب اُداس اور مضمحل نظر آتی تھیں۔ نظریں پجاری پر گڑی ہوئی تھیں۔

بھگت سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر آیا۔ تو ایک نے جھک کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ باقی داسیاں بھی جہاں کھڑی تھیں بے اختیار وہیں دو زانو ہو گئیں۔ وشنو بھگت گاتا ہوا اُن کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ اس نے آہستہ سے مندر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

داسیاں کھڑی ہو گئیں۔ کنچنی بولی۔ "گیت تمام ہو کر بھی میرے نس نس میں

کانپ رہا ہے۔"

داسیاں عقیدت کی نظروں سے مندر کے دروازے کو تکنے لگیں۔

ایک داسی نے کہا۔ "بھگت جی کی آواز میں اثر ہے۔ ان کی دعا بھی بے اثر نہ ہو گی۔"

دوسری بولی۔ "بھگوان کرے ان کی دعا مہاراج کو چنگا کر دے"

تیسری نے آہ بھر کر کہا۔ "ان میں اب رہا کیا ہے"

چوتھی بولی۔ ہائے بھری جوانی میں ایسے بھیانک روگ کے پنجے میں پھنس جانا۔"

اندر رانی مورتی کے سامنے کہہ رہی تھی۔ "ہے پربھو۔ میرے سہاگ پر نہیں۔ تو ان کی جوانی پر ترس کھائیے۔"

پجاری جوت جگا چکا تھا۔ اور مشعل ہاتھ میں لئے مندر کے چراغدان روشن کر رہا تھا۔ چراغوں کی بڑھتی ہوئی روشنی میں مندر کی جڑاؤ دیواریں اور فرش پر تھالوں میں سجے ہوئے نذرانے جھلک جھلک کر رہے تھے۔ بھگت مشعل ہاتھ میں لئے ایک چراغدان روشن کرتے کرتے رُک گیا۔ اور چڑھاووں کو دیکھ کر بولا۔ "رانی۔ تیرے چڑھاوے انمول ہیں۔ پر دیوتا صرف چڑھاووں کے مول ہی کو نہیں دیکھتے۔"

رانی نے دُکھ بھری نظروں سے بھگت کو دیکھا۔ "میں اپنے پتی پر سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔ مانگو مجھ سے کیا مانگتے ہو۔"

بھگت نے کہا۔ "رانی دیوتا دھن کے بھوکے نہیں۔ انہیں دھن کا لالچ ہوتا تو سنسار میں کسی کنگال کی آشا پوری نہ ہوا کرتی۔"

بھگت نے مڑ کر پھر چراغدان روشن کرنا شروع کر دیا۔

رانی غمگین فکر کے بعد بولی۔ "پھر میں کیا چیز پیش کر سکتی ہوں۔"

بھگت نے مشعل ایک برتن میں کھڑی کر دی۔ "رانی نچھاور مول سے نہیں پرکھا جاتا۔ اس بات سے پرکھا جاتا ہے۔ کہ دینے والے بلیدان کتنا بڑا کیا ہے۔"

رانی بھگت کا منہ تکتے تکتے بولی۔ "میں نہیں سمجھی"

بھگت آہستہ آہستہ چلتا ہوا مورتی کے سامنے سیڑھیوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ رانی کی نظریں اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ بھگت نے پوچھا۔ "سنسار میں کیا چیز تجھے سب سے پیاری ہے؟"

رانی اندیشہ ناک نظروں سے بولی۔ "پتی پریم"

بھگت ذرا دیر چپ چاپ سامنے دیکھتا رہا۔ "رانی یہ سمے اپنی سب سے پیاری چیز نچھاور کر دینے کا ہے۔"

رانی کی آنکھیں خوف سے زیادہ کھل گئیں۔ "کیا پتی پریم!" وہ کھڑی ہو گئی۔ "پتی کو تیاگ دوں؟"

بھگت آہستہ سے سر ہلا کر بولا۔ "تیرا سوال بھی کچھ چھوٹا نہیں۔ راجہ پر موت اپنا منہ کھول چکی ہے۔"

رانی ہاتھ سینے پر رکھے کھڑی تھی۔ رحم انگیز انداز میں بولی۔ "تو پھر میرے لئے کیا رہ جائے گا؟"

بھگت مورتی پر عقیدت کی نظریں ڈال کر بولا۔ "شاید یہی سوچ کر بھگوان تجھ پر ترس کھا جائیں۔ اور مہاراج کو چنگا کر دیں۔"

رانی نے بیقرار ہو کر کہا۔ "جس پریم کے لئے سوال کیا جا رہا ہو۔ اسی پریم کو تیاگ کون سکتا ہے؟"

بھگت پل بھر خاموش رہا۔ "مجھے دیکھ۔ میری بھی
آٹھ سال کی بچی کھوئی گئی تھی اسے دکھوں سے
بچائے رکھنے کی کامنا میں میں نے اس کو ڈھونڈھنا
چھوڑ دیا۔ اپنا دکھ بھرا جیون لا کر وشنو کی مورتی کے
آگے سمرپن کر دیا۔ وہ اب میری نہیں ہو سکتی میں
اس کا نہیں ہو سکتا۔ مگر دکھ میرے ہردے میں سے
نکل گیا ہے۔ مجھے شانتی ہے۔ کہ میری بچی جہاں
کہیں بھی ہے۔ وشنو آپ اس کا رکشک ہے۔"

رانی نے بیچارگی سے منہ موڑ لیا۔ پل بھر چپکی کھڑی رہی۔ پھر پلٹ کر بیقراری سے بولی۔ "بھگت جی۔ کوئی اور نچھاور۔ کوئی اور نچھاور"

بھگت نے اسے رحم کی نظروں سے دیکھا۔ اور آہ بھر کر بولا۔ "پتری جو تیرا جی چاہے۔ نچھاور دینا اپنی اپنی شکتی پر موقوف ہے۔ تیرا اطمینان کوئی چھوٹا نچھاور دے کر ہو سکتا ہے۔ تو تجھے اختیار ہے۔"

رانی نے ذرا سے تامل کے بعد بیتابی سے سر موڑ لیا۔

بھگت قریب آ کر بولا۔ "لیکن اگر وہ نچھاور بس نہ ہوا؟"

رانی کا سر بے بسی سے جھک گیا۔

"اور دوسرا انچا و رلانے کا سمے بھی نہ رہا؟"

رانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"پتری وید نراس ہو چکے ہیں"۔

رانی سسکیاں بھرنے لگی۔

"اور کیا پتہ۔ راجہ کے بیہوش جسم میں گنتی کے سانس رہ گئے ہوں اسی پل آخری سانس اس کے ہونٹ پر چلا آرہا ہو؟"

رانی تڑپ کر مڑی۔ "چپ ہو جاؤ۔ چپ ہو جاؤ"۔

(۱۱) سورج مندر کے باہر آکر رکا۔ گھوڑے کو چھوڑ کر وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ داسیاں فکرمندی سے اس کی طرف بڑھیں مگر وہ سیدھا مندر کے دروازے کی طرف لپکا۔

(۱۲) بھگت مڑ کر مورتی کے سامنے چلا گیا تھا۔ اور پوجا کی تیاریاں کر رہا تھا۔ رانی سر جھکائے کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ یکلخت دروازہ کھلا اور سورج نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا۔ "رانی جی۔ وید جی نے آپ کو بلایا ہے۔ مہاراج کی حالت بہت نازک ہے"

رانی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ سورج باہر چلا گیا تھا۔ ہیبت کے مارے وہ سن سی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ کان شائیں شائیں کر رہے تھے۔ ذرا دیر یونہی کھڑی رہی۔ پھر بھاگ کر مورتی کے سامنے گئی اور دو زانو ہو کر بولی۔ "بھگوان دیا۔ دیا۔ میں اپنا سب کچھ ارپن کرتی ہوں۔ میں بچن دیتی ہوں کہ اگر میرا پتی تندرست ہو گیا تو میں تمہاری بھگت بن کر اپنا جیون تمہارے چرنوں میں گزار دوں گی"۔

یہ کہکر شدتِ عقیدت سے وہ مورتی کے سامنے دوہری ہو گئی بھگت اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھدیا "پتری تیرا کلیان ہو"۔

(۱۳) وکرم بے چینی سے اس کمرے کے باہر ٹہل رہا تھا۔ جس میں راجہ بیمار پڑا تھا۔ بار بار دروازے کی طرف تکتا اور اندر کی کسی آواز پر کان لگا دیتا۔ لیکن اندر سے کوئی آواز باہر نہ آرہی تھی۔

(۱۴) راج بھون کے دروازے پر سپاہی کھڑے تھے۔ رانی اپنی داسیوں سمیت جلدی جلدی بڑھتی ہوئی آئی۔ ذرا دیر دروازے کے سامنے تھمی۔ پریشان نظروں سے سپاہیوں کے چہروں کو دیکھا۔ باہر وہی حالت تھی جو وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ زیادہ اطمینان حاصل کرنے کو وہ بیقراری سے اندر چلی گئی۔

(۱۵) راج بھون کے صحن میں سے گذر کر رانی گھبرائی گھبرائی دالان میں چلی گئی۔ داسیاں پیچھے پیچھے تھیں۔

(۱۶) آخری دالان میں پہنچ کر اس کی نظر وکرم پر پڑی۔ وہ دالان کے پرلی طرف کھڑا تھا۔ رانی تھم گئی۔ وکرم بڑھ کر رانی کے قریب آگیا۔ دوسری داسیاں دالان کے موڑ پر رک گئیں۔ اور بیتابی سے سر بڑھا بڑھا کر راجہ کے کمرے کے دروازے کو تکنے لگیں۔

رانی نے اندیشہ سے وکرم کے چہرے کو دیکھا۔ وکرم کو دروازے کی طرف متوجہ دیکھ کر وہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھی۔ وکرم نے دروازے پر دستک دی اور پیچھے ہٹ گیا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ بوڑھا وید چوکھٹ میں آکھڑا ہوا۔ رانی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

وید جوش کی بیتابی سے بولا۔ "رانی جی! مہاراج نے آنکھیں کھول دی ہیں"۔

رانی نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ "حالت؟"

وید کے چہرے پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ "ایکا ایکی سنبھل گئی ہے"۔

رانی نے آہ بھر کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے اپنے بیقراری سے ابھرتے ہوئے سینے کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ وکرم اس ایکا ایکی تغیر پر حیران تھا۔ رانی نے احسانمندی کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائیں۔

(۱۷) آسمان پر بادل پھٹ رہے تھے۔ اور ان میں سے چاند نمودار ہو رہا تھا۔ بہتی ہوئی ندی میں چاند منعکس ہو رہا تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ جھومتی ہوئی ٹہنیوں سے کلیاں زمین پر برس رہی تھیں۔

افسانہ

خوش قسمت لڑکا

(از جناب علی عباس حسینی ایم اے)

بوڑھی رحیمن ننھے حمید کا ہاتھ پکڑے گھر سے نکلی ۔

دادی کے سوکھے ہاتھوں میں پوتے کی نرم نرم انگلیاں بالکل اس طرح تھیں۔ جیسے خزاں دیدہ پتوں میں نو دمیدہ کوپل

رحیمن کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ چہرے پر جھرّیاں پڑی تھیں۔ آنکھوں کے گرد باریک باریک نشانات تھے۔ گال دانتوں کے نہ ہونے سے پچکے ہوئے تھے۔ ٹھوڑی قریب قریب ندارد تھی۔ پاؤں کانپتے ہوئے پڑتے تھے۔ عصا کا سہارا لینا ضروری محسوس ہوتا تھا۔ پھٹا سا برقعہ جسم پر تھا۔ اس کا نچلا حصہ کیچڑ میں اٹا ہوا تھا۔ پاؤں میں پرانی وضع کی پیوند دار جوتی تھی۔

ننھا حمید سر جھکائے ساتھ تھا۔ آواز بھرّائی ہوئی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی اور چہرے اور پھٹے کپڑوں سے بلا کی حسرت برستی ہوئی!

ضعیفہ نے کہا۔ "بیٹے آٹھ نو برس کے سن میں نوکری بڑی قسمتوں سے ملتی ہے۔ خدا کا شکر کرو کہ اس نے مجھ بڑھیا کی فریاد سن لی۔ دیکھو خدا کا شکر ضرور ادا کرنا"

حمید نے گردن جھکائے ہوئے کہا۔ "جی ہاں دادی اماں"۔ ضعیفہ بولی۔ "اور بیٹا اب کے میلے میں تم اپنے لئے چار پیسے والی ٹوپی خرید لینا۔ تم ماشاء اللہ اب نوکر ہو گئے ہو!"

حمید نے پچھلے ہی انداز سے کہا۔ "بہت اچھا دادی اماں!"

بڑھیا بولی۔ "اور دیکھو بیٹے یہ جو تم کھٹ پٹی اس وقت پہنے ہوئے ہو اسے اتار کے رکھ لینا۔ اسے عید بقر عید میں پہننا۔ اب تم سمجھدار ہو۔ "اُگم" کا خیال رکھنا چاہئے۔ ایسے ویسے دنوں میں ننگے پاؤں چلنے میں کوئی ہرج نہیں۔ کھٹ پٹی رہے گی تو تیج تیوہار کے دنوں سب کے ساتھ تم بھی کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتے چلو گے"۔

حمید کی جھکی ہوئی گردن اور جھک گئی۔ وہ بھرّائی آواز میں بولا۔

"بہت خوب دادی اماں"۔

صبح کا وقت تھا۔ پو پھٹ چکی تھی۔ مرغ بانگ دینا بند کر چلے تھے۔ مسجدوں سے تہلیل و تسبیح اور مندروں سے ناقوس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دیہاتی عورتیں دو دو چار چار کی ٹولیوں میں ہاتھوں میں لوٹا لئے گھونگھٹ نکالے گھروں کی طرف پلٹی راہ میں ملتی جاتی تھیں۔ ہر ایک رحیمن اور اس کے پوتے کو جاتا دیکھتی۔ مگر راستہ کھوٹا ہونے کے وہم سے منہ سے نہ کچھ بولتی۔ ہاں ان دونوں پر بار بار پلٹ کے حسرت کی نظر ضرور ڈالتی۔

یہ دونوں کھیتوں کے کنارے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ بوڑھی رحیمن چھوٹے حمید کو ملازمت کے فرائض۔ آقا و ملازم کے تعلقات۔ خدا کے اپنے بندوں پر احسانات۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں سمجھا کے خاموش ہو چکی تھی۔ حمید نے سب کچھ سن لیا تھا۔ اور دادی کے ہر سوال پر یہی جواب دیا تھا۔ "جی ہاں دادی اماں۔ بہت خوب دادی اماں"۔ لیکن جب وہ ساری باتوں کو سننے کے بعد گردن اُٹھا کر دیکھتا تو راستہ سامنے ویسا ہی چمکتا ہوا دکھائی دیتا۔ اور منزل کا کوسوں پتہ نشان نہ ملتا!

آفتاب نے اپنے سنہری سہرے کے اندر سے جھانکنا شروع کیا۔ دیہاتی بیلوں کی جوڑی ہنکاتے۔ ہل کندھے پر رکھے کھیتوں میں دکھائی دینے لگے۔ کوئی گاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کوئی بیلوں کو ہنکاتا ہوا اور کوئی جنگل سے پلٹتی ہوئی دیویوں سے ہنسی ٹھٹھول کرتا ہوا۔ اہیر کے لڑکے گاؤں بھر کے مویشی میدانوں میں چرائی کے لئے

اکٹھا کر رہے تھے۔ گنڈریری بھیڑوں کا گلا ہنکالتے۔ "ہرے! ہرے! اُر! آر! کرتے چلے جا رہے تھے........ ضعیفہ اور حمید بھی چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے سامنے راستہ دور تک زرد زرد چمک رہا تھا۔ لیکن منزل کا دھندلا خاکہ بھی نہ دکھائی دیتا!

سامنے منگلو چمار آتا ہوا دکھائی دیا۔ کاندھے پر لاٹھی تھی اور اس میں نیا جوتہ لٹکا ہوا تھا۔ سر پر چھوٹی سی پگڑی تھی جسم میں ایک مارکین کا کرتا۔ اور ٹانگوں میں زرد رنگی ہوئی دھوتی۔ گنگناتا مسکراتا چلا آرہا تھا۔ بڑی بی کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ بولا "کہاں جات ہو کھالا؟"

ضعیفہ بولی "گسائیں پور۔ بھیا۔ وہاں حمید کا کام لگ گیا ہے"۔

وہ سادگی سے بولا "ارے کھالا۔ اِہ سن ماں اور کام! اے کھیلے کا بن ہے کی کام کا؟"

ضعیفہ نے اس کے سوال کے جواب میں صرف اتنا کہا "ہاں بھیا میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی مرد نہیں۔ پھر پوچھا۔ تم کہاں سے آرہے ہو؟"

وہ کچھ شرماتا ہوا مسکرایا "سسرال سے!"

حمید نے دادی کی انگلیاں کھینچیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ راستہ سامنے تھا۔ گسائیں پور کوسوں دور۔ بس چلنے لگے!...... چلے جا رہے تھے۔ اور منزل کا پتہ نہیں!

آگے بڑھ کے مولوی صاحب ملے۔ فینس نیم کے درخت کے نیچے رکھی تھی۔ آٹھ کہار قریب ہی ذرا سستا رہے تھے۔ خانصاحب کے بیٹے کا مکتب تھا۔ مولوی صاحب بسم اللہ پڑھانے جا رہے تھے۔ بڑی بی کو دیکھ کے بولے۔

"ایں رحیمن یہ تم کہاں اتنے سویرے جا رہی ہو؟"

ضعیفہ نے سلام کرکے کہا "جی اس بچے کو کام پر لگانے جا رہی ہوں!"

مولوی صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "ہوں ماشاءاللہ اتنے سے سن میں کمانے جا رہا ہے۔ خوب! بہت خوب! مگر تم نے اسے نماز سکھادی ہے؟"

ضعیفہ کے زرد چہرے پر سرخی آگئی۔ بولی "جی ہاں مولوی صاحب میں نے اسے نماز خود سکھائی ہے۔ ہم غریب بھی خدا کا نام لینا جانتے ہیں!

مولوی صاحب نے سٹ پٹا کے "نہیں! نہیں! ہاں! ہاں! ماشاء اللہ" کہا اور دونوں مسافر آگے بڑھ گئے۔ ایک بوڑھا۔ ایک بالا۔ ایک عمر کی حدیں ختم کئے ہوئے۔ دوسرا زندگی میں قدم رکھتا ہوا۔ دونوں کے پاؤں میں رعشہ۔ دونوں کے گھٹنے کمزور۔ ایک کا کثرتِ کار سے۔ دوسرے کا ناکردہ کاری سے۔ لیکن معذور و مجبور چلے جا رہے تھے۔ آفتاب کی حدت بڑھتی جاتی تھی۔ منزل کوسوں دور تھی۔ لاپتہ تھی۔ مگر قدم نہ رُکتے تھے!

گسائیں پور کے مفصلات شروع ہوئے۔ پختہ مکانات۔ سربفلک عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔ شہر کے پھاٹک سے ملا ہوا آموں کے درخت کے قریب ایک اندھا فقیر بیٹھا تھا۔ "ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا۔ ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا"۔ "اندھے فقیر کا سوال۔ اندھے فقیر کا سوال" کی رٹ لگی تھی۔ اس کے زرد زرد دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس کی میلی داڑھی کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں دیدوں کی جگہ کیچڑ بھری ہوئی تھی۔ اس نے تھکے مسافروں کے پاؤں کی چاپ سنتے ہی ان کی طرف رخ کیا۔ اپنا سوکھا ہوا زرد ہاتھ پھیلا دیا۔ "بابا بھلا ہوگا! اندھے سور کا سوال۔ ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا!"

ضعیفہ نے پوتے کا ہاتھ مضبوط تھام لیا۔ فقیر کے قریب جا کر بولی "بابا ہم نے سنا تھا تمہیں ایک لڑکا نوکر چاہئے!"

فقیر کے لب و لہجہ میں فرق آگیا۔ پہلے عاجزی تھی اب حکومت بولا "تم لائی ہو؟" اور اس نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ بڑھیا نے حمید کو اس کے قریب کرکے کہا "ہاں۔ دیکھو ماشاء اللہ نواں سال ہے!"

اندھے بھکاری نے حمید کو سر سے پاؤں تک اس طرح ٹٹولا جس طرح قصاب بکری کو دام کرتے وقت ٹٹولتا ہے۔ پھر بولا "ہاں مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ کیا نام ہے؟"

بچے نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "حمید!"

اندھے نے پوچھا "تم مجھے سہارا دے کر گاؤں گاؤں لے چلوگے؟"

ننھے حمید نے گرفتہ آواز میں کہا "جی ہاں"

اندھے نے پوچھا "تم میرے ساتھ گا سکو گے؟"

لڑکے نے چھوٹی سی زبان سوکھے ہونٹوں پر پھرا کے کہا "جی۔ آپ اگر سکھا دیں گے"۔

اندھے نے جھولی سمیٹی اور لکڑی اٹھائی۔ وہ بچے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا "آؤ۔ چلیں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے کچھ نہیں ملتا چلو پھیری لگائیں!"

حمید نے دادی کو حسرت سے دیکھا۔ پھر سڑک پر نظر کی بہت دور تک سپید سپید چمکتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ نہ رُکنے کا موقع۔ نہ ٹھہرنے کی جگہ۔ اور نہ پناہ کا مقام! منزل کوسوں دور تھی! بالکل لاپتہ تھی!

....

وہ اندھے کے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کا ایک سوکھا ہاتھ بچے کے کاندھے پر تھا اور وہ اس کے ساتھ صدا لگا رہا تھا "دیدے بابا دیدے! ...."

ایک ہے اندھا ایک ہے بچہ۔ ایک ہی پیسہ پاؤ پھر آٹا۔ دیدے بابا دیدے بابا"

ایک کی آواز میں خشونت تھی دوسرے کی آواز میں رقت تھی! ایک اپنا حق مانگ رہا تھا۔ دوسرا اپنی حق تلفی کا ماتم کر رہا تھا!"

رحیمن دیر تک اپنی کمزور آنکھوں سے پوتے کی غائب ہوتی ہوئی صورت دیکھتی رہی۔ پھر اپنے دامن سے آنسو پونچھتی ہوئی آسمان کی طرف دیکھ کر بولی۔ تیرا شکر ہے میرے مالک! تو نے میرے بچے کو اتنا خوش قسمت بنایا کہ وہ نویں ہی برس کام پر لگ گیا!

(ماخوذ)

شیکسپیر اور حقیقت شناسی

(از جناب علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری ڈپٹی ڈائریکٹر انفرمیشن بیورو دہلی)

ہندوستان کے مشہور ڈرامہ نویس آغا حشر ہم سے رخصت ہوگئے وہ مردہ قوم کے فرد تھے۔ اس لئے شاید ہم لوگ ہمیشہ کے لئے اُن کو بھول جائیں لیکن انگریزوں کا خدائے سخن شیکسپیر آج تک زندہ ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل میں وہ زندہ نہیں رہے گا۔ انگلستان کے اس جلیل القدر ڈرامہ نویس نے ایسی غیر فانی ناموری اور شہرت حاصل کی ہے۔ جو حکومت برطانیہ کی عظمت اور وقار سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ ہماری زبان کے جاننے والے بھی آغا حشر اور دیگر ادیبوں کے ذریعہ شیکسپیر سے بہت کچھ واقف ہو چکے ہیں۔ اس لئے آج ہم انگلستان کے اس خدائے سخن کے ادبی کارناموں کے ایک مخصوص پہلو پر مجملاً بحث کرنا چاہتے ہیں۔

شیکسپیر کے ادبی کارنامے تحصیل علم و ادب۔ اخلاقی تعلیم و تعلم اور انسانی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرنے کے لئے نہ ختم ہونے والے خزانے ہیں۔ ان کی روشنی میں ہم دنیا کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کے قابل بن سکتے ہیں۔ یہ کچھ آسان کام نہیں ہے کہ انسان کی ہر لحظہ تبدیل ہو جانیوالی طبیعت کی ہر رنگ میں صحیح صحیح تصویر کھینچدی جائے۔ اس مضمون میں میرا مبحث بھی یہی ہے کہ شیکسپیر کے نقطۂ نظر سے معرفت انسانی یعنی Heuman ism (ہیومن اِزم) سے کیا مراد ہے۔ شعرا کے کلام میں اس موضوع کی جانچ پڑتال خاص طور پر نشاۃ الثانیہ سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانہ سے اس تخیل کو اس قدر اہمیت دی گئی کہ لوگوں کے دلوں میں آزادی کا خیال اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور اس نے یہاں تک ترقی کی کہ موجودہ زمانہ میں بھی یہی خیال پیش پیش نظر آتا ہے۔

شیکسپیر کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں۔ کہ اس نے اپنے زمانہ کے خیالات کو حقیقت شناسی کا جامہ پہنانے کے لئے شاعری اور ڈرامہ کے فن سے کس قدر کام لیا ہے۔ شیکسپیر کے اسی طرز نے نفسی فلسفے کو شاعری کے تابع فرمان بنا دیا۔ اہل انگلستان کے دماغی پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے اپنی قوت متخیلہ کی امداد سے عوام کے جذبات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ شیکسپیر اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے معاصرین غیر مادی اور خارق العادۃ قوتوں پر ایمان رکھتے ہیں چنانچہ اس نے اپنے اکثر ڈراموں میں جان بوجھ کر چڑیلوں بھوت پریتوں بلاؤں اور دیگر خارق العادۃ اور خوفناک قوتوں سے کام لیا ہے اس لئے نہیں کہ وہ ان اعتقادات کو قوت دے بلکہ اس لئے کہ ان کا اثر انفرادیت اور ذمہ داری کے خیالات کی تبلیغ کے ذریعہ سے دھیما کیا جائے۔ شیکسپیر نے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کرنے کی کوشش کی کہ توہم پرستی کا انجام ہمیشہ المناک ہوتا ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک اس کی یہی خواہش رہی کہ عوام محسوس کرنے لگیں کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اور اس میں توہم پرستی کو دخل نہیں۔ اس قسم کے خیالات پیدا کرنے سے شیکسپیر کا مقصد یہ تھا کہ عوام میں زندگی کی بد مزگیوں اور ناخوشگواریوں کا ہمت اور دلیری سے مقابلہ کرنے کی قابلیت پیدا ہو سکے۔ چنانچہ اس کو اپنے مقصد میں کامیابی نصیب ہوئی۔ اور اس کے ڈراموں نے نہایت موثر طریقے سے عوام کے دل و دماغ سے تباہ کن توہمات دور کر کے انکی جگہ خود اعتمادی اور قانون و آئین کی محبت پیدا کر دی۔ یہ بھی اسی کی مبارک سعی کا

نتیجہ تھا۔ کہ عوام کے دل سے یہ خیال دور ہو گیا کہ شہنشاہیت الٰہیت کی مظہر ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ خود عضوی نظام کی حقیقت پر ایمان رکھتا تھا۔ اور انہی کی خوبیوں کی تبلیغ کرتا تھا۔ اس کے نزدیک نظام اور نظم "قدرت کی وسیع قوت کے آئینہ دار ہیں۔ اس اصول کی تائید میں اس کی تصنیفات میں سے "ٹرائلس اینڈ کرسیڈا" اور ان دلائل کو جو اس نے سرٹامس مور کی زبان سے ادا کئے ہیں۔ پیش کیا جاسکتا ہے۔ گوتم بدھ کی طرح اس کا بھی یہی خیال ہے۔ کہ زندگی بذاتِ خود انسان کو گناہوں سے پاک کرنے والی ہے۔ اور اس تزکیہ کے لئے کسی ایسی قوت کی ضرورت نہیں جو ماورائے فطرت ہو۔ شیکسپیر کا یہ بھی خیال ہے کہ انسانی سوسائٹی کی ترقی و توسیع کے لئے فطرت اور تربیت میں مطابقت ہونی لازمی ہے۔ اس نے اس نظریہ کا اظہار اپنی تصنیف "ٹیمپسٹ" میں پراس پیرو کے کردار میں کیا ہے۔ یہ ڈرامہ سرتاپا غیر فطری مذاہب کی نکتہ چینی پر مشتمل ہے۔

شیکسپیر کے اصلی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ان جذباتی اور اقتصادی حالات سے کسی قدر واقف ہونا ضروری ہے۔ جنہوں نے زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کے متعلق اس کے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ مختصر طور پر ذیل میں اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

شیکسپیر کی خانگی زندگی کا ایک دور بہت تاریک تھا۔ اس کے والد نے اس کو محروم الارث کرکے دنیاوی دولت سے اُسے بالکل محروم کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ "ارل ساوتھمپٹن" نے بھی جس پر اس کی معیشت کا دارومدار تھا۔ اسے بالکل بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ سچ ہے مصیبت تنہا نہیں آتی۔ اسی زمانہ میں طاعون نے انگلستان کی فضا کو اور زیادہ مکدر بنا دیا۔ ان پے درپے مصائب سے شیکسپیر کا دل ٹوٹ رہا تھا کہ اس کی حوصلہ افزا طبیعت نے اس کی معاونت کی۔ جس سے ثابت ہو گیا کہ اگر یہ یہ افتادیں نہ پڑتیں تو یقیناً اس کی زندگی کا معاشرتی پہلو ہمیشہ کے لئے تاریک ہو جاتا۔ اور بجائے اس کے کہ وہ تہذیب و تمدن کے رہنما کی حیثیت اختیار کرتا وہ ایک عامیانہ اور غلامانہ ذہنیت کا شکار ہو جاتا۔ اس دَور ابتلا کے بعد سے ہی شیکسپیر کی زندگی کا عظیم الشان دَور شروع ہوتا ہے۔ اسی زمانہ سے اس نے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنی شروع کی۔ تجربے نے اس پر ثابت کر دیا کہ اس کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اور دوسروں کے رحم و کرم پر بھروسہ رکھنا سخت نادانی ہے۔ انہی ٹھوکروں نے زندگی کی اصلیت کو اس کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ اور وہ پبلک کا آدمی بن گیا۔ یہ کہنا بیجا نہیں کہ پبلک ہی کی سرپرستی نے اسے غیر فانی شہرت کا مالک بنایا۔ شیکسپیر کے ڈرامے اس زمانہ کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ابتدائی کارناموں میں اس کے اصلی جوہر اسقدر تاباں نہیں جیسے کہ ان شاہکاروں میں ہیں جو اس نے بعد میں لکھے ہیں۔ جبکہ اسے انسان کا خاصہ تجربہ ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم کو یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ شیکسپیر کی شہرت کو غیر فانی بنانے میں اس کے قدر دانوں کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے۔ کہ شیکسپیر کے ڈراموں کے پلاٹ جدید نہیں ہیں۔ بلکہ پرانے ڈراموں کے پلاٹوں سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اس نے پرانے پلاٹوں کو اپنی قابلیت سے اسقدر بلند اور دلچسپ کر دیا ہے۔ کہ وہ اس کے اپنے بن گئے ہیں۔

"وار آف روزاز (War of Roses) نے شیکسپیر کے دل میں امن و نظم کا جذبہ پیدا کیا۔ اور اس کے جذبۂ قومی کو بھی ابھارا شیکسپیر کو اگر اس زمانہ کا مجسمہ اور حاصل کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اسنے اپنے زمانہ کی تمام کمزوریوں کا مطالعہ کیا اور ان سب کے خلاف بڑی حکمت سے جہاد کیا۔

ادبی دنیا کی ایک اور شخصیت میں بھی جسکو عوام گوئٹے کے نام سے جانتے ہیں۔ یہی خوبیاں موجود ہیں۔ ادبی شخصیتوں سے ہٹ کر سیاست دانوں میں سے بھی ایک شخصیت کا یہاں پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔ میری مراد لائڈ جارج سے ہے۔ اس کا مورخ لکھتا ہے کہ باوجود اپنی کمزوریوں کے لائڈ جارج بچپن ہی سے موروثی حقوق کی مراعات کے عیوب اور غریبوں اور امیروں کی مروجہ تفریق کے خلاف تھا۔ اس لئے آگے چل کر اس کے بعض کارنامے اس کی اس رائے کے آئینہ دار ہیں۔

اگر شیکسپیر کے ادبی کارناموں کو معروضی نظریئے سے جانچنے کی بجائے موضوعی نظریئے سے پرکھا جائے۔ یعنی جس طرح عموماً کسی ادبی

کارنامے کو نفسِ مضمون اور طرزِ بیان کے لحاظ سے تنقید کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے - تو ہم کو شیکسپیر کے ادبی کارناموں میں حقیقی انسان کا پرتو نظر آئے گا - اور بجائے اس کے کہ مخصوص انداز میں کہیں کہیں انسانی فطرت کی تصویر نظر آئے - ہمیں ہر رنگ میں عام طور پر انسان کا حقیقی جلوہ دکھائی دے گا - اس حقیقت سے اس عام علمی نظریہ کی تائید ہوتی ہے - کہ انسانی اجتماعیت آپس کے میل جول اور مختلف قسم کی شخصیتوں کے ربط ضبط یا تضاد اور اثر انگیز واقعات سے ظہور میں آتی ہے - ان مسلمات پر ہم شیکسپیر کی زندگی کو چار دوروں میں تقسیم کرسکتے ہیں -

(۱) ابتدائی دور - جبکہ وہ زعمِ شباب میں عام نوجوانوں کی طرح ہر مشکل شے کو آسان سمجھتا تھا ؛

(۲) ساؤتھمپٹن کا دور - جبکہ وہ اس فریب میں مبتلا تھا کہ زندگی مزے سے گزر رہی ہے - اور گزر جائے گی ؛

(۳) ساؤتھمپٹن سے علیحدگی کا دور - جبکہ وہ مایوسی اور تذبذب کی پُرخار وادیوں میں بھٹک رہا تھا -

(۴) آخری دور - جبکہ اس نے خام خیالیوں سے نجات حاصل کرلی تھی - اور اسے یقین ہوگیا تھا کہ تھیٹر اس کی زندگی بنا دے گا -

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے - شیکسپیر کے بہت سے ڈرامے خود اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ اس کی زندگی کے کسی دور میں لکھے گئے ہیں - اس کے علاوہ اس کی تحریروں میں ایک اور نمایاں خصوصیت موجود ہے - جو اس کے رتبہ کو عوام سے بہت بلند کر دیتی ہے - جب ساؤتھمپٹن نے اس سے اپنے تعلقات منقطع کرلئے اور اس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں تو عوام کی طرح اس نے کہیں بھی اپنے ممدوح کے خلاف نفرت یا دشمنی کا اظہار نہیں کیا - برخلاف اس کے ایران کے شاعرِ اعظم فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنے کا صلہ اپنی امیدوں کے مطابق سلطان محمود غزنوی سے نہ پایا تو اس نے سلطان کے خلاف بہت کچھ زہر اُگلا - چنانچہ محمود کی ہجو میں جو اشعار اس نے لکھے ہیں - وہ آج تک زبان زدِ خاص و عام ہیں -

شیکسپیر کی تحریروں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے انسانی کمزوریوں اور خامیوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی بجائے انہیں پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے - اور انسانیت کو معقولیت پسند بنانے اور جذبات کو حقیقت اور معرفت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے ڈرامہ کو حقیقت کا صحیح ترجمان بنا دیا - جب وہ اپنے کرداروں کے ذریعہ حقیقت کا سبق دینا چاہتا ہے تو ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ وہ کرداروں اور ان کے کارناموں کے تضاد کو اس طرح نمایاں کرتا ہے - کہ دماغ اور قلب کو ایک دھکا سا لگتا ہے جس سے دونوں چوکنے ہو جاتے ہیں - اس قسم کی مثال کے لئے میک بیتھ اور اوتھیلو کو پیش کیا جاسکتا ہے - اوتھیلو میں مور کے اخلاقی اور عملی پہلوؤں میں کافی تضاد ہے - اسی طرح میک بیتھ میں - میک بیتھ اور لیڈی میک بیتھ کے کردار اور اعمال میں صاف اختلاف نظر آتا ہے - حافظ شیرازی بھی اسی طرح اپنے زمانے کے لوگوں کے کردار اور اعمال پر نکتہ چینی کرکے عوام کو متاثر کرنا چاہتے ہیں -

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کارِ دیگر می کنند

شیکسپیر کے ڈراموں میں ہملٹ ایک امتیازی خصوصیت رکھتا ہے - اس کے مطالعہ سے ہمیں شیکسپیر کی بعض خصوصیات کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے - اس ڈرامے کے خاص کردار "پرنس ہملٹ" اور "ہوریشو" ہیں - اس ڈرامے کو لکھنے سے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں فتوحات یا کامیابیاں ان لوگوں کا حصہ ہوتی ہیں جو عمل پر ایمان رکھتے ہیں اور موت کے خوف پر غالب آجاتے ہیں - دوسرے الفاظ میں وہ "ہمتِ مرداں مددِ خدا" یا "السعی منّی والاتمام من اللہ" کے اسلامی اصول کی اس کیریکٹر کے ذریعے تبلیغ کرتا ہے - ہملٹ کے کریکٹر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیکسپیر اس اسلامی اصول کو بھی سامنے لانا چاہتا ہے جس کی رو سے انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ نقصان کی حد تک اپنا بدلہ لے لے - جیسا کہ قرآن مجید میں ہے - وکتبنا علیہم النفس بالنفس والعین بالعین ..... الخ -

اس ڈرامہ میں اس نے نہایت خوبی سے عیسائیت کے اس اصول کہ "آفات کا مقابلہ نہ کرو" اور اس عملی اصول کہ "آفات کا مقابلہ مردانگی سے کرنا چاہئیے" کا تقابل کیا ہے اور موخر الذکر کی تبلیغ کی ہے -

غرض غور کیا جائے تو ہملٹ موجودہ زمانے کے ایک سچے ہیرو کی تصویر ہے ہملٹ کی فتح موت کے خوف اور نامعلوم مستقبل پر غالب آنے پر منحصر رکھی گئی ہے - شاید آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ایورسٹ پر چڑھنے کی کوشش یا کرۂ ہوائی میں پرواز یا کرۂ آبی میں جانے کی مہموں میں بھی وہی جذبہ کارفرما ہے جو ہملٹ میں موجود ہے -

ڈاکٹر سمارٹ جیسے ناقدوں کا خیال ہے کہ تقدیر اور ذمہ داری کو شیکسپیر کی تحریروں میں نہایت موزوں جگہ دی گئی ہے - لیکن میرا خیال ہے کہ شیکسپیر نے انفرادی ذمہ داری اور تدبیر پر زیادہ زور دیا ہے - اور تقدیر کا وہی پہلو ہے جو "السعی منی والاتمام من اللہ" میں ہے - لیکن چونکہ اس کے دَور کا عقیدہ تھا کہ ؎

سب کام اپنے کرلیں تقدیر کے حوالے
نزدیک عاقلوں کے تدبیر ہے تو یہ ہے

اس لئے مجبوراً اسے تقدیر کو ایسی جگہ دینی پڑی کہ جس سے وہ نظریہ جس کو وہ پیش کرنا چاہتا تھا مافوق نہ سمجھا جائے - اور عوام اسے قبول نہ کرسکیں - اس نے بار بار اپنے ڈراموں میں زور دیا ہے کہ کامیاب زندگی وہ لوگ بسر کرتے ہیں جو صاحبِ عمل ہوتے ہیں - اور ماحول اور زمانہ کی رفتار کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل کرسکتے ہیں شیکسپیر کے نزدیک محروم القسمت وہ لوگ ہیں جو زمانہ کی ہوا کے مطابق اپنے آپ کو بدل نہیں سکتے - گویا شیکسپیر کا عمل اس مصرعہ پر تھا -

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

ایک اور جگہ وہ کہتا ہے "اگر اتفاقات زمانہ مجھے بادشاہ بنادیں گے کیوں؟ اتفاقاتِ زمانہ میری ہمت کے بغیر مجھے بادشاہ بناسکتے ہیں"۔

شیکسپیر کے نزدیک انسان کی قوت استدلال خدا کی دی ہوئی ایک غیر مترقبہ نعمت ہے - چنانچہ وہ ہملٹ میں کہتا ہے:-

"وہ آدمی ہی کیا ہوا جس کا سب سے بڑا مقصد اور اس کے وقت کی قدر و قیمت محض کھانا اور سونا ہے ایسا آدمی حیوان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا یقیناً

....

....

وہ ہستی (خدا) جس نے ہم کو انتہائی غور و خوض اور پس و پیش دیکھ کر پیدا کیا - اس نے ہم کو قوت استدلال جیسا عطیہ بیکار رکھنے کے لئے نہیں دیا"

اسی طرح انصاف کا وہ نصب العین جس کو رحم سے گداز کرکے "مرچنٹ آف وینس" میں شیکسپیر نے پورشیا کی زبانی پیش کیا ہے - کوئی اور مغربی شاعر ویسی مثال پیش نہیں کرسکا - حقیقت میں یہ الفاظ دنیا کے لئے ایک بیش بہا عطیہ ہیں - اور اس سے زیادہ بلند خیالی کا نمونہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے :-

"رحم کا وصف زبردستی پیدا نہیں کیا جاسکتا - رحم آسمان سے ہلکی ہلکی بارش کی طرح برستا ہے - اس میں دوگونہ رحمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں - اول تو اس پر رحمت ہوتی ہے جو رحم کرتا ہے - دوسرے اس شخص پر بھی رحمت ہوتی ہے جو اس سے بہرہ ور ہوتا ہے - رحم ایسی خوبی ہے جو ہمت والوں میں سب سے زیادہ ہوتی ہے"

کالرج کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ "مرچنٹ آف وینس کا ڈرامہ" ہر حیثیت سے شیکسپیر کے ماہر انسانیت ہونے پر دلالت کرتا ہے -

آخر میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ شیکسپیر نے اپنے ملک والوں کے دلوں میں اولیت اور ہمت کی اہمیت کو محسوس کرنے کا جذبہ اس طرح بیدار کیا ہے - کہ آج انگلستان کو جس قدر حیثیت حاصل ہے وہ ایسے ہی جذبات کا نتیجہ ہے - وہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ بنی نوع انسان کی ترقی کا دار و مدار قدیمی روایات اور ازلی احساسات کو از سرِ نو زندہ کرنے پر نہیں ہے - بلکہ اس کا انحصار مستقبل میں فطرت کے ساتھ ساتھ چل کر کیمیائے زندگی کو فطرت انسانی میں تبدیل کرنے پر ہے مختصر یہ کہ عضوی نظام و آئین کی وقعت - آزادخیالی کی عظمت اور سچے انصاف کی قدر و قیمت جس قدر برٹش پبلک میں پائی جاتی ہے - اس میں شیکسپیر جیسے ادیبوں کا بہت کچھ حصہ ہے - مجھے امید ہے کہ وہ حضرات جو شیکسپیر کی تصنیفات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں - اسکی تحریروں سے حق شناسی کا سبق حاصل کرکے اپنے آپ کو اس کارزارِ حیات میں بہترین انسان بنانے کی کوشش کریں گے ؛

افسانہ

حسنِ اتفاق

(از جناب الفرے۔ سہاوری)

برکھا کی آخری بہار تھی۔ سورج بدلی سے نکلا تو سارے سنسار کو تپا دیا۔

یاور ایک چوکھٹے میں جڑی ہوئی تصویر بغل میں دبائے ہوئے گھر کے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ راستہ کم کرنے کے لئے اس نے چال کو تیز کر دیا۔ مگر پسینے کا کیا علاج کہ جس نے تھوڑی ہی دیر میں اس کے کپڑے شرابور کر دیئے۔ اسوقت اس کی پریشانی کا کوئی اندازہ لگاتا! مکان کی دوری اسے پلِ صراط طے کرنے سے کم نہ تھی۔

گھر کی سنسان گلی کے موڑ پر ایک بھکارن لڑکی نے "رام بھلا کرے" کہکر عاجزی سے اپنا ہاتھ اس کے آگے بڑھا دیا۔ یاور نے تصویر والی بغل کو ذرا سخت کیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے جیب کو بھکارن لڑکی کی امداد کا ذریعہ بنانا چاہا۔ سورج کی تپش۔ تصویر کا بوجھ اور پسینے کی بے پناہ آمد نے اُسے گھبرا دیا تھا۔ اس وقت اُس کی دلی آرزو بھکارن سے چھٹکارا پا کر مکان پہنچنے کی تھی۔ "جلدی کام شیطان کا" اُس نے جلدی اور گھبراہٹ میں پیسے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مگر وہ تھے کہ دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے زاہد کی طرح باہر آنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

یاور کا ایک ہاتھ جیب میں اور دوسرا تصویر کے تھامنے میں تھا۔ نگہ نیچے اور گردن آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی کہ وہ دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ مشکل سے وہ ایک چونی ———— تصویر کی اُجرت کے بعد بچی ہوئی گدا گر لڑکی کو دے کر مکان میں پہونچا۔ اس نے خیال بھی نہ کیا کہ بھکارن اس کی نیت سے سولہ گنا دام زیادہ لے گئی۔

برآمدے کی محرابوں پر دوڑی ہوئی عشق پیچاں کی بیلوں اور مکان کی بناوٹ نے یاور کا خون خشک کر دیا۔ سامنے پیازی رنگ کے کپڑے پہنے کوئی خاتون پنجوں کے بل کھڑی تھی اور ہاتھوں کو اوپر اٹھائے ہوئے کپڑے اٹکانے کی کھونٹی کو دیوار سے جدا کر رہی تھی۔ گویا پریم کی پری آکاس جانے کے لئے پر تول رہی تھی۔ یاور کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اور کے مکان میں بیباکی سے گھس آنا اس کے لئے قیامت نہیں تو اور کیا تھی۔ وہ اُلٹے پاؤں لوٹا۔ مگر اڑ۔ ڑا۔ دھڑام!!! کھڑکھڑا، سٹ اور دھما کا تمام صحن میں گونج گیا۔

عورت نے مڑ کر دیکھا تو دروازے کی چوکھٹ پر کوئی ———— ایک مرد گھٹنوں کے بل زمین پر گرتا اور گرتے ہی سنبھلتا نظر آیا۔ آن کی آن میں زمین پر پڑے ہوئے ایک بڑے چوکھٹے کے سوا اب اس کی نظر کے سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ دم بخود برآمدے میں کھڑی تھی۔ جیسے اس کے مُنہ میں زبان گلے میں آواز اور پاؤں میں سکت ہی نہ تھی۔ وہ کسی بھیانک چیز سے ایک ساتھ ڈر جانے والے کمسن بچے کی طرح دروازے کے اُن کواڑوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ جو ڈراؤنے درندے کی طرح مُنہ پھاڑے چوپٹ کُھلے پڑے تھے

(۲)

(اُچھل کر) الٰہی خیر کیجیو!! او بدنصیبو ذرا تو دم مارنے دیا کرو۔ ہر دم اپنی ہی تو تو۔ میں میں رکھتے ہو۔ اے اللہ! مجھ جرم جلی کو تو ساری عمر سے ایسے ہی جنجال میں پھنسا رکھا تھا۔ اے مالک! تو اولاد دے تو نیک صالح اور چین کل کی دیجیئے نہیں تو ایسی اولاد سے تو میں بے اولادی بھلی! یاور کی بھاوج نے اپنے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر

ماما سے کہا۔

"رعنا! دیکھ تو ہمسائے کے گھر میں دھماکا سا ہوا۔ میں جانوں کوئی گرا۔"

"بیگم! تمہیں تو یونہی وہم ہے۔ نہ کہیں کوئی گرا ہو۔ ذرا پتا کھڑکا اور تمہارے کان کھڑے ہوئے۔ بیچارے پڑوسی آج مکان خالی کر رہے ہیں۔ سامان کسنے باندھنے میں کوئی چیز گر گرا گئی ہوگی"

ماما رعنا جو بیگم کی منہ چڑھی تھی جواب دے کر پھر سالن نکالنے میں لگ گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

بھاوج کی اس چھان بین سے یاور کے رہے سہے ہوش اور بھی گم ہوگئے۔ جس نے گھر کے غسل خانے میں آکر پناہ لی تھی۔ مگر رعنا کے بیباکی اور لاپروائی کے جواب سے اُس کے جی میں جی آگیا۔ ندامت خوف اور رسوائی۔ اُسے اب بھی گھیرے ہوئے تھے۔ اُسے اپنے زخمی گھٹنوں اور ابتر کپڑوں سے زیادہ اپنی رسوائی کا پورا ثبوت قلمی تصویر اُس گھر میں رہ جانا تھا — اور یہی بات اُسے رہ رہ کر ستا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے اپنی بھاوج سے یہ بات بتا دینی کہاں تک مناسب تھی۔ یقین کریں گی یا نہیں اور اگر بتا کر بات کو نہ دبایا جائے تو کہیں پڑوسی رنگ نہ لائیں۔ . . . . مگر نہیں عورت میں اتنی جرات نہیں ہوئی۔ رسوائی کے خیال سے اب بھی اس کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ دو چار ہی منٹ کے بعد اس نے اپنی آنکھوں کو حلقوں میں اوپر کی طرف گھمایا۔ ماتھے پر بل ڈالے جیسے کسی کٹھن مسئلے پر غور کیا ہو۔ اور پھر اطمینان سے انگڑائی لی۔ جیسے کوئی سونے والا کسی خوفناک خواب سے چونک کر اور یہ جان کر کہ جو کچھ دیکھا خواب تھا۔ جی کو تسلی دے یا کسی بات کو سوچ کر کھٹے کرے۔

ہاں یہ سچ ہے کہ وہ اس قصے کو کسی سے نہ دہرانے پر تُل گیا تھا

(۳)

آج صبح سے تازہ دھیمی دھیمی ہوا میں نرمی تھی۔ یاور وقت سے بہت پہلے دفتر میں پہونچ جاتا تھا ——— یہ اس کا معمول تھا۔ اور ایمان کی بات بھی یہ ہے کہ اُس کی ایسی ہی چستیوں نے آج اُسے کہیں سے کہیں پہونچا دیا تھا۔ لوگ جو کل اُسے بے فکرا کہہ کر پکارتے تھے۔ آج اس کی دن دونی ترقی دیکھ دیکھ کر رشک کرتے تھے۔

ہوا کی لطافت اور رت کی مناسبت آج یاور کو بہت ہی بھائی۔ آج اس نے سواری میں بیٹھ کر دفتر جانا سخی داتا اور رمولے کی دی ہوئی نعمتوں کو ٹھکرا دینے کے برابر جانا۔ وہ آہستہ آہستہ نگاہ سامنے کئے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ سڑک پر چڑیا بھی تھی۔ دفتر زیادہ سے زیادہ سو گز کے فاصلے پر ہوگا۔ کہ زمین پر پڑا ہوا ایک لانبا چوڑا تختہ اُسے نظر پڑا۔ اوندھا پڑا ہوا یہ تختہ کسی تصویر کا چوکھٹا معلوم ہوتا تھا۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ لاوارث چیز سے دلچسپی لئے بغیر نہیں رہتا۔ رہانیت کا سوال وہ کچھ بھی ہو۔ یاور بھی انسان تھا وہ اس کی طرف لپکا اور جھک کر اُٹھا لیا۔ یہ ایک تصویر تھی۔ جس کا سینے سے لگائے رکھنے والا نگہبان شیشہ اس کی حفاظت کرتا ہوا چور چور ہو چکا تھا۔ اب تصویر کی حالت پہلی رات کی لُٹی ہوئی دُلھن جیسی تھی۔ گرد میں اٹی ہوئی تصویر کو اس نے رومال سے صاف کیا۔ نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں خوشی اور چنبھے سے چمک اُٹھیں۔ ایک پل میں اُس کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔ کیوں؟ چوکھٹے میں یہ خود یاور ہی کی تصویر تھی۔ پچھلی برسات کا وہ دن اُس کے سامنے آگیا۔ بے دھیانی میں پڑوسی کے مکان میں اُس کا چلا جانا۔ پلٹنا۔ گر پڑنا اور تصویر کا وہیں رہ جانا ایسی باتیں تھیں جن کی یاد ایک پل میں تازہ ہو گئی۔ گہری نظر سے دیکھنے پر بھی تصویر اسے اپنی ہی معلوم ہوئی۔ چوکھٹا وہی تھا۔ اُس پر سنہری اور مومی نقش و نگار بھی وہی۔ پھر تصویر کو پہچاننے میں چوک کے کیا معنی۔

سامنے ٹھہر جانے والی کار اگر یاور کے کوٹ کی آستین نہ چھو جاتی تو شاید وہ ابھی کچھ دیر اور سوچ بچار کرتا رہتا۔ وہ سنبھلا اور تصویر کو بغل میں دبا کر اپنے دفتر کی طرف چل پڑا۔

"بندہ پرور!"

اُس نے دو قدم آگے بڑھ کر پیچھے سے آواز سُنی۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ پھر کر دیکھا تو رُکی ہوئی کار کا ڈرائیور کھڑکی کو بند کرتے ہوئے اُس کی طرف اپنے ہاتھ کا اشارہ کر رہا تھا۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ ٹھیرنا! تھوڑی ہی دیر میں اُس کی تصویر مل جانے کی خوشی

کافور ہو چکی تھی۔ اُس کے چہرے پر خجالت سی تھی۔ "اُٹھائی ہی کیوں تھی؟" اُس نے اپنے دل ہی دل میں کہا۔ "مگر اپنی ہی تو ہے۔" آپ ہی ہمت کر کے جواب بھی دے لیا۔ وہ اِسی الجھن میں تھا کہ ڈرائیور جو دوڑتا ہوا اب پاس آچکا تھا بولا۔

"معاف کیجئے گا! تصویر (یاور کی بغل کی طرف اشارہ کرکے) ابھی کار سے نکل پڑی تھی۔ یہ میری بھول تھی صاحب! وہ کچھ ہلکے ہلکے اور بے تکے پن سے کہے جا رہا تھا۔ کچھ منٹ ہوئے میری مالکہ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔ بہت دور سے اس کی تلاش میں پھرا ہوں"

یاور ابھی تک اُس کا مُنہ تک رہا تھا اور اس سوچ میں تھا کہ کیا جواب دے۔ ڈرائیور کے چپ ہوتے پر بولا۔

"بھئی! تصویر تو میری ہے۔ دیکھو!" اتنا کہکر یقین دلانے کے لئے تصویر کو ڈرائیور کے آگے بڑھا دیا جس نے اُسے ہاتھ میں لیا اور گھور کر دیکھا۔ اور پھر یاور کو اوپر نیچے دیکھا ——— صورت اور تصویر کو ملایا مگر کچھ تو یاور کا مطلب نہ سمجھ کر اور کچھ تصویر اور چہرے کے ایک ہونے پر چیز بز ہو کر بولا۔

"تو جناب اس سے کیا ہوتا ہے؟ ایک صورت اور مورت کے دسیوں آدمی ہوتے ہیں۔ جناب عالی! خود میرے ہی نام کے ہمارے مالک کے تین کرایہ دار ہیں۔"

تصویر کو جواب ڈرائیور کے ہاتھ میں تھی ——— یاور ہی کی چوک سے وہ للچائی نظروں سے تک رہا تھا اور کیوں نہیں وہ اس کی بے فکری اور فرصت کے زمانے کی ایک یادگار تھی۔ اور دوسرے وہ اس کی ایک چوک اور ندامت کی تصویر تھی اور اگر ان تمام باتوں کو بھی جانے دیا جائے تو وہ ایک ایسی چیز تھی جو اُسے پیاری تھی اور تھوڑی ہی دیر اُس کے قابو میں رہ سکی تھی۔ انسان پیاری چیز کو تو چاہتا ہی یہ ہے کہ بس چلے تو دل میں رکھ لے۔

ڈرائیور نے جو بات کہی تھی وہ بھی اپنی جگہ پر ٹھیک تھی۔ بیچارہ اصلیت سے کوسوں دور تھا۔ یاور نے بھی اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا کہ گذرے ہوئے اتفاق کو بیان کر کے یقین دلائے اور اس کے سوا صورت بھی کیا ہو سکتی تھی ڈرائیور سے کہا

یہ تصویر میری ہے جو میں نے پچھلے موسم میں پونے دس روپے میں .... وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ موٹر سے ایک عورت کی آواز آئی جیسے کوئی جھنجلا کر بولے۔

"جعفر! میرے دستخط کیوں نہیں دکھا دیتا۔"

ڈرائیور نے جلدی سے نظر دوڑا کر تصویر کے قدموں کے نیچے اشارہ کیا۔ باریک قلم سے لکھا تھا "پارس" ابھی یاور کی نگاہ دستخطوں ہی پر جمی ہوئی تھی۔ کہ جعفر نے تصویر اپنے قبضے میں کی اور چلتا بنا۔

یاور کے مُنہ سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔ وہ ڈرائیور کی اس حرکت پر ایک پل کے لئے اس طرح کھڑا رہا جیسے ایک جوانمرد سینے میں گولی کھا کر کھڑا رہے۔ اُس کی نگاہ موٹر پر جمی ہوئی تھی مگر ہر معمولی پرکھ والا بھی بتا سکتا تھا کہ اُس کی نظر میں کچھ نہ تھا یا یوں سمجھنا چاہئے کہ بے پلکوں کی دو آنکھیں ہیں اور ان کی پتلیوں میں سامنے کی نظر آنے والی تمام چیزیں سفید پہاڑ ہیں۔ اور بس اس وقت اُس کی خفت کا کوئی حد حساب نہ تھا۔ عمر بھر میں اپنی طرز کا یہ دوسرا دن تھا۔ اُس کے جی اور سمجھ کا حال اُس مسافر جیسا جیسا تھا۔ جو چلتے چلتے اُس چٹیل میدان میں آکر کھڑا ہوا اپنا راستہ سوچنے لگے۔ جہاں سے ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی سیکڑوں پگڈنڈیاں اور بٹیاں پھٹتی ہوں۔

انہی اُلجھنوں میں یاور کے کانوں میں ایک قسم کی تیز اور بے سُری بھنبھناہٹ سی آنے لگی۔ یہ موٹر کے چالو ہونے کا گھرّاٹا تھا۔ یاور چونکا۔ جس طرح کوئی گہری نیند والا بہت سی آوازوں پر کوئی ادھورا بول کہہ اُٹھے اور موٹر کو کچھ اس انداز سے دیکھا۔ جیسے ایک شیر زخم کھا کر بس آخری بار اپنے دشمن کو دیکھتا ہے۔

(۴)

فلک منزل

عزیزی!

جاہ و خیر کی دعاؤں کے بعد تمہارے خط کا جواب لکھتا ہوں

چاہیے کی تعلیم کے لئے محمد یاور انگلستان جاتے ہیں - معلوم ہوا - اس
خرچ کی وجہ سے کارج کو ٹالتے ہو؟ انہیں تو میرا بچہ ہے - اُس کے
تعلیمی خرچ کا ذمہ دار میں ہوں - تم مجھے اپنا ہی سمجھو - بھائی کے
سفر سے پہلے اُن کے نکاح کا سامان کرو - یہاں سب کام ٹھیک
ہو چکے - بس برات لانے کی تاریخ لکھ بھیجو - تمہارا اکرم جاہ

ہونے والے خسر کا خط آنے پر یاور کی برات گئی - نکاح ہو گیا
اور اس کے بعد ہی وہ انگلستان کو سدھارا -

"مشرق مشرق ہی ہے اور مغرب مغرب" یہ ایک نفسیات کے
ماہر کا نظریہ ہے نسبت اور نکاح مشرقی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی
زندگی کی کتاب کا نیا ورق شروع ہونے والے رشتے اور لگاؤ ہیں
ایک مشرقی نوجوان نسبت کے بعد ہی سے صرف اپنی ہونے اور
آنیوالی بیوی ہی کو سارے جہان کے حسن اور خوبیوں کی جان سمجھنے
لگتا ہے - یہی حالت لڑکیوں کی ہے - ہوتے ہوتے اگر نسبت ہو گئی
ہے تو نکاح تک یا نکاح ہو چکا ہے تو رخصت تک ان دونوں
(مرد اور عورت) کی باہمی دلچسپی عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے -

یہی وجہ ہے کہ پچھلے میاں بیویوں کے جوڑوں میں محبت
یہ اس حالت میں تھا جبکہ ہمدردی اور ہم خیالی پوری پوری پائی جاتی
تھی - مرد آج کل کی طرح مانگ چوٹی کے غلام تھے اور نہ مخلی اور
عورتیں نگار خانوں کی چٹک مٹک والی مالدار تھیں اور بی - اے
ایم - اے اور فرنگن نما - یاور بھی مشرقی تھا اور ہندوستانی - اُس کے
جی میں بھی یورپ کی زہریلی تتلیوں کے بسنے کو کوئی جگہ نہ تھی - اُس کے
من میں بسی اور سمائی ہوئی صرف اس کی بیوی تھی - لیکن اس کے
دوست کے ایک خط نے اُسے پریشان کر دیا -

دنیا بھر کے سادہ لوح اور جورو پرست یاور صاحب! تسلیم
کیجئے میرے پہلے ہی فقرے سے ماتھے پر بل ڈال لئے؟ توبہ کر بندے!
ذرا سی بات میں منہ لٹکا لیا -

میری بہن "چاندنی" اور تمہاری بیوی کے بہناپے کا لگاؤ تم سے
چھپا نہیں ہے - میں کل چاندنی کے گھر گیا تھا - وہ
عصر کی نماز ادا کر رہی تھی - بہت انتظار کرنا پڑا - سچ تو یہ ہے کہ ہماری
برادری کی کنواری لڑکیاں عبادت گذاری میں مردوں کو بہت پیچھے
چھوڑ چکی ہیں - ان کی نماز کی جگہ کا مرتبہ بڑے پیر صاحب کے چلے سے
کسی طرح کم نہیں - آدھ گھنٹے برابر اس کی نماز اور وظیفے کا انتظار
کرنا پڑا - اتنے میں گھر کی ماما ایک بے نام کا لفافہ لائی - بھائی صاحب!
میری عادت شک کی بہت ہے - اسی لئے شک کر کے اُس خط کو کھول
لیا - اُس میں کیا تھا؟ لو پڑھ لو -

میری من موہنی بہن چاندنی! فلک منزل

اللہ تمہاری عمر بڑی کرے - پھولو اور پھلو - پیاری بہن چاندنی کو
چاند کی ضرورت ہے - اللہ وہ مرادوں مانگا دن جلد لائے! مگر افسوس!
نہ میرا جیسا کہ ہوا اور کچھ نہ ہوا - تمنائیں مٹیں - منصوبے خواب
ہوئے - اور ارادے خاک - تصویر ہے اور میں - یہی جی کا سہارا
اک یادگار باقی ہے - رنج اور فکروں کے عذاب نے زار کر دیا ہے
اب تو یقین سا ہو گیا ہے کہ میری یہ خیالی دلچسپی جان لیوا ہو کر رہیگی
اب زندگی مجھے ایک ڈراؤنا درندہ معلوم ہوتی ہے - اور محبت
ایک مردہ شکار -

چاندنی! خدا کے واسطے میرے لئے دعا کرو - دوسروں کی
دعا قبول ہو جایا کرتی ہے - تم معصوم ہو - کنواری بھی ہو اور
نمازی بھی - بہن دعا کرو کہ مجھے اپنے مالک کا مُنہ دیکھنا نصیب نہ ہو
میری پیاری چاندنی! مجھے اُن سے محبت نہیں اور جو اپنے مالک کے
سوا کسی اور کا کلمہ پڑھے - خدا اسے زمین کا پیوند کر دے!!"

بس چاندنی بس! یہی دعا یہی الفاظ - اللہ تمہاری زبان سے مقبول
اور مبارک کرا دے - دن بھر ہلکا بخار رہتا ہے - جی چاہتا ہے کہ آخری
مرتبہ تم سے ضرور مل سکوں - چاندنی! ہو سکتا ہے؟

تمہاری غم کی ماری بہن "پارس"

لیجئے یہ ہیں اُن کی رنگا رنگ کیفیتیں جنہیں تم پیار میں "تاج
محل" کہتے ہو - بلا بیوی کے میاں جان سے جا رہے تھے - دوپٹے
یا برقعے میں لپٹی ہوئی صورت چاہے بعد میں وہ لکڑی کا صندوق ہی
کیوں نہ نکلے دیکھتے ہی آپ کی رال ٹپکتی تھی اور اب یاروں کی
سواریاں ——— ٹمٹم - کار - گھوڑا گاڑی - تانگا اور چھکڑا

بلکہ سالم ایک عدد جناب کی بیگم صاحبہ ہیں کہ کسی اور ہی کا دم بھرتی اور اُسپر جان چھڑکتی ہیں۔ جب تک دوسرا خط پہونچے تم آ چکو گے اس لئے باقی باتیں زبانی رہیں گی۔

تمہارا

محمد سعادت خاں

(۵)

پورے تین برس دیکھتے ہی دیکھتے گذر گئے۔ انیس کا انگلستان جانا کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ واپس آگیا۔ مگر اس کا چہرہ اُترا اُترا سا تھا۔ بات کرنے میں روکھاپن۔ چال میں سستی اور مستعدی سے کوسوں دور۔ دوست اور پیارے انگلستان کا حال پوچھتے کہ وہاں سماج کی کیا حالت ہے۔ عُریانی کی کیا کیفیت ہے۔ کچھ معاشرت کا طرز تو بیان کرو۔ وہاں تمہاری شام اور راتیں کیسی گذرتی تھیں؟ لوگ معنی اور بے معنی سب ہی کچھ تو پوچھتے۔ مگر وہ اللہ کا بندہ جواب بھی دیتا تو اجنبی سا اور بہت ہی متین بن کر۔ اب اُسے کسی دلی رنج اور سوچ کا شکار سمجھے جانے میں کیا کسر تھی۔ بیچارہ عجب اُلجھن میں پھنسا تھا۔

وہ کبھی کہتا کہ ان گنوں بھری بیوی کب منہ لگانے کے قابل ہے۔ ابھی میں ہی سوچ رہا ہوں کل سماج بھی ذلیل سمجھنے لگے گی پھر سوچتا کہ نہیں ابھی معاملہ اک طرفہ ہے اور گھر کی بات گھر ہی میں ہے۔ پہلے کسی طرح تہ کو پہنچ لینا اچھا ہے۔ کبھی اُس کے جی میں جنسی محبت اتنی سما جاتی کہ سمجھ بوجھ اور سوچ بچار بھی کنارہ کر جاتے اور کہتا کہ نہیں سعادت خاں بکتا ہے۔ اُمّ ہانی ——— کتنی مست آنکھوں والی۔ کیسی البیلی اور لمبے لمبے کیسوں والی۔ کسقدر پیار کے قابل بیوی ہے۔ بھلا ایسی نورس پر شبہ کرنا کون سی سمجھ داری ہے میری بھاوج نے کتنے یقین سے کہا تھا۔ کہ وہ بات کرتے وقت بھی کبھی آنکھ نہیں ملاتی۔ یہ تو شرم کی نشانی ہے۔ شرمیلی لڑکی تو پوری سماجی ہوتی ہے۔ سماج کے بندھن تو اُس کا زیور ہیں۔ اُمّ ہانی میری بیوی ہے۔ وہ مجھ سے محبت نہیں بھی کرتی تو ضرور کرے گی پھر ایک ساتھ جھنجلا کر کہتا۔ "ہونے دو! میں اُسے چاہتا ہوں اور چاہوں گا۔ اور اتنا کہ مجھ سے چاہ کی جانے لگے"۔ انہی پیچا پیچ میں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی راتوں پر راتیں کالی کئے جا رہا تھا۔ کھوج لگانے کے لئے غریب نے بہتیرے ڈورے ڈالے مگر پتہ چلنا تھا نہ چلا۔ یہاں تک کہ ہار کر بیٹھ رہا۔ اور رخصت کا انتظار کرنے لگا دن اور ہفتے مہینے کے پھیر میں آگئے۔ مگر یاور کی اُلجھنوں میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ یہاں خسر کے اس خط سے جو اُس کے بھائی نے اُسے بھیجدیا تھا پریشانی اور ہوگئی۔

فلک منزل

میرے عزیز!

مزاج پوچھوں کہ سلام کروں۔ اُمّ ہانی کی دن دونی بیماری سے سمجھ پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ کچھ نہیں سوجھتا۔ سماج کی رسموں پر اسوقت تو خاک ڈالو اور بھیّا! محمد یاور کو پرچہ دار کے ساتھ جیسے بنے فوراً بھیجدو۔ وہ بھی دیکھ جائے:

تمہارا اکرم جاہ

خسر کا بلاوا۔ بھائی کی رضا اور اپنی پریشانیاں یاور کو سسرال لے ہی پہونچیں +

(۶)

جس کمرے میں یاور نے قدم رکھا بغلی اور روشن تھا۔ تھوڑی دیر تک تو اُمّ ہانی اُسے نظر ہی نہ پڑی۔ وہ ایک پلنگ پر لیٹی تھی اور تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہی تھی۔ اُسکے زرد چہرے اور رُکے رُکے تیوروں میں ایک کشش تھی جو اثر کئے بغیر رہنے والی نہ تھی۔ بیمار پہلی ہی نظر میں یاور کو بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اس کے سنوارے ہوئے کتابی چہرے میں چھوٹی اور ستواں ناک میں۔ بچوں کے جیسے رخساروں میں بیمار نرگسی اور نیم باز آنکھوں میں اور غم و غیرت سے نڈھال حلقوں میں ایک اچھوتی ادا تھی کمزوری اس کے جسم پر چھا رہی تھی۔ یاور کو اس کی حالت پر بے انتہا ترس آیا۔ وہ اس کے پاس پہونچکر بولا۔ "لاج محل!" بیمار نے اُن آنکھوں سے جن میں حسرت اور صدمہ ملا جُلا ہو۔ یاور کے چہرے کو دیکھا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور یاور کے چہرے کو ایک مرتبہ پوری کوشش سے پلک اُٹھا کر دیکھنا چاہا مگر نہ دیکھ سکی۔ یاور نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ٹھنڈا پڑا تھا۔ کسی بے جان چیز کی طرح اس کے ہاتھ میں آپڑا۔ پھر اس نے کچھ کوشش سے اپنی گردن پھیر لی۔ یاور نے دیکھا کہ وہ ایک تصویر

دیکھ رہی تھی - حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا - اس کے ہاتھ سے اس کی بیوی کا ہاتھ چھوٹ پڑا - یہ تصویر خود اُسی کی تھی - وہی جو کھٹا تھا اور وہی تصویر اسے فوراً ایک خیال آیا اور اس نے تصویر کے ذہن کے نیچے کچھ ڈھونڈھا - وہ وہیں لکھا تھا ——— "اُمّ ہانی حرف پارس" فرق اتنا تھا کہ اب "پارس" سے پہلے اُمّ ہانی عرف اور لکھا تھا - وہ نام کو دیکھتا رہا - یہانتک کہ حروف اُس کی نگاہ کے سامنے ناچنے لگے .. یاور نے نگاہ ہٹا کر اُسے دیکھا - بیمار نہ جانے کب سے اس کی آنکھ ناک کو پڑتال رہی تھی یا تصویر سے ملا رہی تھی - اللہ ہی بہتر جانے -

پارس نے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا "معاف ......" مگر نہ کہہ سکی - اُس کے پیلے ہونٹ اس کے قابو میں نہ تھے - وہ پھر بولی "معاف کرنا .... نہیں مجھ سے بولا نہیں جاتا" - اتنا کہکر وہ چپ ہو گئی - یاور دری کے فرش پر گھٹنے ٹیک کر پلنگ کی پٹی کے پاس جھک گیا - اس نے ایسے لہجے سے جس میں رنج اور پیار دونوں ہوں کہا - "لاج محل!" اور سچ پوچھو تو وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ بھی نہ سکتا تھا - اُس کا گلا بھر آگیا تھا - بیمار نے ایک مرتبہ پھر اپنی آنکھیں آہستہ آہستہ یاور کی طرف اُٹھائیں - آہ اس نور میں لڑکی کی آنکھوں کو جسے عشق ہو کون بیان کر سکتا ہے؟ اُن میں اک التجا تھی - محبت تھی اور ستم یہ کہ درگذر کا سوال تھا - شعلے کی لپٹ جلتی ہوئی سوئیوں کی طرح یاور کے سارے بدن میں دوڑ گئی - اس کا گلا سوکھ گیا - وہ بیتاب ہو کر جھکا اور اپنے کپکپاتے ہوئے ہونٹ بیمار کے ہاتھ پر رکھ دیئے ؎

(۷)

سنتے ہیں کہ یاور کی لاج محل حکیم کی امید سے بھی بہت پہلے اچھی ہو گئیں - مگر ہمیشہ میاں اس کوشش میں رہے - کہ سعادت خاں کا خط بیوی کے ہاتھ نہ لگنے پائے اور بیوی اس تاک میں رہیں کہ کسی طرح لے اُڑیں - اور ان کے سرتاج کو اُن سے چھیڑنے کا موقعہ نہ مل سکے - اس کا حال جو افسانہ بن چکا ہے بقیہ حیات کبھی کبھی ؎

الفرے (سہاوری)

پچاس برس پہلے کی دِلّی

(از جناب افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش - دہلوی)

یادش بخیر! اب سے چالیس پچاس برس پہلے ہندو۔ مسلمان بڑے پیار اخلاص سے آپس میں نہایت خوش و خرم رہا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتا تھا۔ میل جول کا یہ عالم تھا کہ شادی بیاہ میلہ ٹھیلہ۔ ماتمی۔ غمی۔ غرض دنیا کے ہر کام میں ایک دوسرے کی شرکت لازمی تھی۔ گویا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ جو کسی طرح قطع نہ ہوتا تھا راستہ گلی یا محلّے میں بھی جب کوئی پاس پڑوسی ایک دوسرے سے مل جاتا تو کئی کئی منٹ تک آپس میں صاحب سلامت کے بعد ایک دوسرے کی خیر و عافیت بلکہ خانگی حالات کی پوچھ گچھ ہوا کرتی تھی "تمہارے گھر میں خیر صلاح ہے؟ بہن کیسی ہیں؟ پتاجی کس طرح ہیں؟ بال بچے تو اچھے ہیں؟ گذارے کی کیا شکل ہے؟" اگر خدا نخواستہ بیماری دُکھی ہوئی تو ہر طرح ہر ممکن امداد سے ہاتھ بٹاتے اور بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے کام آتے۔

مثالاً ایک ۶۶ برس کا بوڑھا موجود ہے جو خدا کو حاضر و ناظر جانکر کہتا ہے کہ یہیں دلّی ہی میں موری دروازے کے قریب ایک ٹیلوں کی گلی مشہور ہے۔ جہاں ہم رہتے تھے۔ یہ مکان ہمارا ذاتی تھا والد صاحب باہر اپنی نوکری پر تھے۔ خاصا اچھا کھاتا پیتا گھر تھا۔ مگر والد صاحب کے نہونے کی وجہ سے کچھ رشتے کنبے کی مستورات ہی سے مل جُل کر مرحومہ والدہ صاحبہ ہی گھر کا کام چلا لیا کرتی تھیں۔ مرد صورت کوئی گھر میں نہ تھا۔ باہر دو نوکر اور ماماٗیں و دائیں بھی تھیں۔ مگر نوکر پھر نوکر ہوتے ہیں۔ جو یکایک میں ۲½ برس کی جان ایسا شدید بیمار پڑا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ پردہ دار عورتیں گھر کی بیٹھنے والیاں سب کی سب گھبرا گئیں۔ اور اک پیٹک پیا مجادی کوئی سمجھدار بڑا بوڑھا تو تھا ہی نہیں۔ اس لئے دن بدن میری حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ لیکن خدا کی شان! جسکو وہ جِلائے اُسے کون مار سکتا ہے؟ ہمارے برابر ہی ایک عیسائی پادری صاحب رہتے تھے۔ جن کے گھر میں ایک ہندوستانی بی بی تھیں۔ ہماری ماما کی زبانی جو انہوں نے یہ واقعہ سُنا تو دوسرے ہی دن وہ نیکدل بی بی صبح ہی صبح خود ہمارے گھر چلی آئیں۔ اپنی گاڑی منگائی اور مجھے لیکر اُس میں بیٹھ گئیں۔ اور خاص اپنے فیملی ڈاکٹر رام سنگھ سے جا رجوع کی۔ قسمت کی خوبی! ڈاکٹر صاحب کا علاج مجھے راس آیا۔ اُنکی تشخیص دوا۔ دارو نے فوراً فائدہ کیا میم صاحبہ کی پیرد وڑی اور نگہداشت نے رفتہ رفتہ آخر میری جان بچالی۔ اور میں پھر لوٹ پیٹ کر اچھا ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن جب تک وہ نیکدل بی بی زندہ رہیں۔ میں اُن کو ماما۔ پادری صاحب کو پاپا اور اُن کے بچوں کو بھائی اور بہن کہہ کر پکارتا رہا۔ میری بہشتن والدہ صاحبہ کا تو یہ حال تھا کہ جب کبھی وہ میم صاحبہ ہمارے گھر آتیں تو وہ بیچاری ان کیلئے اپنی آنکھیں بچھانے کو تیار ہو جائیں۔ حالانکہ وہ ہندو دھرم تھیں۔ پادری صاحب عیسائی تھے۔ اور وہ ڈاکٹر رام سنگھ صاحب بھی عیسائی مذہب رکھتے تھے۔ یہ تھا اب سے چالیس پچاس برس پہلے کا میل ملاپ جبکہ ایک روپیہ کے ۳۰ سیر گیہوں پچیس سیر کا آٹا۔ من بھر کے چنے اور تین سیر کا وہ خالص گھی آتا تھا۔ جو اب قیامت تک نصیب نہیں۔ سچ مُچ ایک روپیہ کا آٹا اسوقت دو میاں بیوی پورے مہینے بیس روز تک کھا سکتے تھے۔ خالص دودھ۔ دہی۔ مکھن۔ تیل۔ لکڑی ڈنگری۔ ترترکاری اور ساگ پات تو الغاروں ملتا تھا۔ ایک پیسے میں چار سودے ملتے تھے دھیلا۔ دمڑی بلکہ کوڑیاں تک چلتی تھیں۔ ہاں مگر اب ایک دھیلا بھی

کسی دوکان پر جاکر دو تو ایک ادنےٰ کنجڑا انگ اُسے اٹھا کر پھینکدے گا
باوصفیکہ ملک پہلے سے اچھی ہے۔ آبپاشی کی بھی کثرت ہے مگر زمیندار
اور سرمایہ دار ہیں کہ غریبوں کو مارے ڈالتے ہیں۔ کسان غریب سے غریب تر
اُن کے اثاث البیت۔ مال مویشی سب نیلام۔ وہ گرمی سردی کی سخت
اذیتیں سہہ کر بھی اب دو انچ زمین اپنی ملکیت نہیں بتا سکتے۔ نہ مُٹھی
بھر غلے کو اپنا غلہ کہہ سکتے ہیں۔ قرضے کا بار ان لوگوں کی جانیں لئے
لیتا ہے۔ باوصفیکہ ریلیں جاری ہیں۔ ڈاک۔ تار۔ ہوائی جہاز
بجلی۔ ہزاروں قسم کے محکمے۔ ترقی پر ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن
خدا جانے یہ کیا فقیر کی دعا ہے۔ کہ ایک کروڑ پتی سے لے کر ایک ادنےٰ
گھسیارا تک پریشان اور دل گرفتہ نظر آتا ہے۔ دستکار ہاتھ پر ہاتھ
رکھے بیٹھے ہیں۔ سیکڑوں بندگانِ خدا سڑکوں پر کیچڑ میں دو طرفہ فٹ
پاتھ پر درختوں کے نیچے۔ کمپنی باغ وغیرہ میں جگہ جگہ راتیں گذارتے
ہیں۔ اور کسی غریب کو پیٹ بھر کر چنے تک میسر نہیں۔ اسی دلی میں
چشمدید ایک وقت وہ بھی تھا۔ جبکہ برسات کا موسم اپنی البیلی شان سے
آتا تھا۔ بادل گھرتے تھے۔ جہاں ذرا گرج اور کڑک ہوئی بس مور
الاپتے۔ کویل کوکتی اور شوقین جوڑے سیر کی ٹھیرا دیتے۔ چنانچہ نگاہِ موت
یا نگمبود دروازے کے پاس اک ٹوٹا کنواں ہے۔ اکثر اس قسم کی سیریں
ہوا کرتی تھیں۔ یہاں ایک دفعہ جمنا مائی خاص ٹوٹے کنویں کے
قریب بڑے زور شور سے بہ رہی تھیں۔ عین اسی وقت بہت سے
شوقین جوڑے۔ عورت مرد۔ حسین مہ جبین صورتیں اپنے خاص
خاص ہمجولیوں کو لے کر وہیں جا براجے۔ آن کی آن میں دریا کے
کنارے جھولے پڑ گئے۔ ایک طرف دیگیں کھڑکنے لگیں۔ دوسری
طرف زمین پر فرش بچھ گیا۔ کھانے پکنے لگے۔ تر ترکاریاں چھلنے لگیں۔
میوے دانے کی بہتات تھی۔ آم۔ جامنیں پٹی پڑی تھیں۔ چرندم
خورندم ہونے لگا۔ اتنے میں یکایک کویل کی کوک کی طرح برابر سے
ملار کی تانیں اُڑنے لگیں اور کسی نے یہ گانا شروع کر دیا۔ ؎

کبھی ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں برسے
ایسا برسے میرے اللہ کہ چھاجوں برسے

یہ اک متوالی جوگن اور بیراگی صاحب تھے جو آمنے سامنے
پاؤں جوڑے نہایت خوش گلوئی کے ساتھ یہی شعر الاپ رہے تھے۔ اور
جھولا جھولتے جاتے تھے۔ سب کے سب بت بنکر کھڑے ہوگئے۔ اور
دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہی۔ آہ! آہ! یا وہ سماں تھا یا آج اُسی ٹوٹے
کنویں کے قریب کوئی جاکر دیکھے خاک اڑ رہی ہے۔ بچے۔ بوڑھے
عورت۔ مرد۔ جوانوں کی لاشیں آتی ہیں اور وہیں اُن کا کریا کرم
ہوتا ہے۔

دلی کی نہر سعادت خاں کا تذکرہ آپ نے ضرور سنا ہوگا؟
آہ! وہ نہر سعادت خاں اس اجڑی دلی کی جان تھی۔ جان۔ جس کا
اب یہاں نام ونشان بھی نہیں۔ وہ تاریخی عجوبۂ روزگار ایجاد یہیں
موری دروازے کے پاس عین ڈفرن برج کے نیچے بہتی تھی۔ پل پرسے
کبھی سایہ دار تناور درختوں پرسے اس میں دوپہر کے وقت گدائیاں
ہوتی تھیں۔ اور طرح طرح کے تیراکوں کے کمال دکھائے جاتے تھے۔
وہ نہر گرمیوں کے موسم میں غریبوں کی تفریح گاہ تھی۔ پل سے آگے بڑھ کر
ملکہ کے باغ میں ہوتی ہوئی چاندنی چوک میں دورہ کرتی دُھر لال
قلعے میں جانکلتی تھی۔ اس کے دونوں طرف چوڑی چوڑی پٹریاں تھیں
جن پر سودے والے۔ خوانچے والے۔ پھول والے۔ طرح طرح کی
آوازیں لگاتے تھے۔ مثلاً ککڑیاں بیچنے والا کہتا تھا "لیلیٰ کی انگلیاں
ہیں۔ مجنوں کی پسلیاں ہیں۔ کیا خوب ککڑیاں ہیں"۔ فالسہ والا صدا
لگاتا تھا۔ "سالونے سلونے شربتی فالسہ"۔ سردے والا کہتا تھا۔
"من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم" بہرحال ایک میلا سا لگا رہتا
تھا۔ سفید اور زرد چنبیلی۔ موتیا۔ مولسری کی لپٹیں۔ رستے چلتوں کو
مہکاتی تھیں۔ بہشتی کٹورے بجاتے تھے۔ مگر افسوس اب یہاں نہر
سعادت خاں کا نام ونشان تک بھی نہیں۔ وہ نہر پاٹ دی گئی
سایہ دار درخت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خاک سے لگ گئے۔

یہ تاریخی نہر نواب سعادت علی صوبہ دار اودھ کی ایجاد
تھی۔ جن سے تیموریہ سلطنت کا کوئی تاجدار عہد سخت ناراض ہوگیا
تھا۔ بلکہ اُس نے نواب صاحب کا حاضر دربار ہونا بھی ممنوع قرار
دے دیا تھا۔ اسپر مہینوں کی کدوکاوش کے بعد صوبیدار صاحب نے
درپردہ مقربان بارگاہ شاہی سے رُسل ورسائل پیدا کئے۔ اور یہ بھی

چاہا کہ کسی طرح میری خطا بخشی ہو جائے۔
لیکن وزرائے دربار نے ہر دفعہ انہیں یہی جواب دے کر ٹال دیا۔ کہ جہاں پناہ آپ سے سخت برہم اور ناخوش ہیں۔ تاوقتیکہ آپ کوئی نادرِ روزگار۔ نہایت قیمتی تحفہ نہ پیش کریں گے یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم۔

آخر نواب اودھ نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر بکلخت خاموشی اختیار کر لی۔ جو سالہا سال تک رہی۔ مگر اسی مدت میں انہوں نے اپنے معتمدانِ خاص اور کارکنوں کو بلا بلا کر بصرفِ زرِ کثیر نہایت خفیہ طور پر اسی نہر کو زیرِ زمین تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ جو شدہ شدہ ایک شاہی دربار سے قبل جو کسی عید کے موقع پر دلی ہی میں ہونے والا تھا۔ نہایت اخفا اور خوبی کے ساتھ آخر آخر اتمام کو پہنچ گئی۔ اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ کہتے ہیں بس جونہیں کہ وہ تہوار یا عید کا جشن قریب آیا۔ نواب سعادت علی خاں خود چپکے دم دلی آموجود ہوئے۔ اور اپنے خفیہ کارکنوں کے ذریعے وزرائے دربار سے پیام و سلام کیا۔ بلکہ یہ بھی گذارش کر دیا کہ میں اپنے وعدے پر حاضر ہوں۔ اور جہاں پناہ کے لئے وہ نادرِ روزگار تحفہ بھی ساتھ لایا ہوں۔
چنانچہ کچھ دن بعد وہ عید آئی۔ دربار بھی ہوا۔ ملکوں ملکوں کے سفرا بھی پیش ہوئے۔ عین اسی وقت جہاں پناہ سے عرض کیا گیا کہ وہ دیرینہ معتوب صوبیدار اودھ یعنی نواب سعادت علی خاں بہادر حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ وہ تحفہ بھی حاضر لائے ہیں۔ حکم ہوا حاضر کیا جائے!
چونکہ نواب کی حاضری اور نادرِ روزگار تحفے کا غلغلہ اب عام ہو چکا تھا۔ اس لئے تمام امرا۔ وزرا اور حاضر باش سب ہی مشتاق تھے۔ وزیر اعظم نے نواب کی حاضری کا ایما کیا۔ بس اُدھر نواب نے دربار میں قدم رکھا۔ اِدھر نقیب نے آواز لگائی۔

"نواب سعادت علی خاں بہادر صوبہ دار اودھ حاضر اور حضورِ جہاں پناہ صاحبقرانِ اعظم نگاہ روبرو"

مگر دیکھتے کیا ہیں کہ نواب خالی ہاتھ مُجرا گاہ پر بھی پہنچ گئے۔ سات بار تسلیم بھی بجا لائے۔ اور اُسی طرح خالی ہاتھ آگے ہی آگے بڑھے چلے آتے ہیں۔ ابتو وزیر اعظم کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ حاضرین دربار بھی ششدر رہ گئے۔ لیکن صوبیدار دلیرانہ آگے بڑھے اور پایۂ تخت کے قریب پہونچکر جہاں بادشاہ کے قدم تھے بس وہیں جُھک کر اور ایک آہنی حلقے پر ہاتھ رکھ کر بآواز بلند انہوں نے یہ لفظ ادا کئے۔

"جہاں پناہ کی عمر دراز۔ دوست شاد۔ دشمن پامال۔ یہ خطاوار گنہگار غلام حسبِ وعدہ ایک کنیز حضور کے پاؤں دُھلانے کو حاضر لایا ہے"

اتنا کہہ کر جبکہ تمام دربار حق حیران اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُنہوں نے اُسی آہنی حلقے کو زور سے اوپر کو کھینچ لیا۔ معاً فوارے کی طرح پانی اچھلا اور بادشاہ کے قدموں پر آپڑا۔ اس وقت جہاں پناہ نے مسکرا کر اپنے پاؤں وہاں سے ہٹا لئے۔ اور تمام دربار صورتِ تصویر بن گیا۔

....

(آغا شاعر)

غم نصیب

(سوویٹ حکومت کا ایک بہترین افسانہ)

(حاجی محمد صادق - صادق ایوبی جرنلسٹ ڈیرہ غازیخان)

مجھے فخر ہے کہ میں لیونڈ لینانف کو پہلی بار اردو کی بزم ادب میں متعارف کر رہا ہوں۔ لیونڈ لینانف کی ولادت ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔ آپ کا مولد و منشاء شہر ماسکو ہے۔ لینانف ایک چابکدست مصور ہے۔ جو انسانی فطرت کی تصویر اپنے تخیل کے موقلم سے کھینچ سکنے کے علاوہ جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی پر بھی کامل قدرت و دستگاہ رکھتا ہے۔ لینانف پر قدامت پسندی غالب ہے۔ اس لئے آپ کی افسانہ نگاری میں عموماً دیہات کے ادنےٰ طبقہ کی زندگی کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ اس واقعیت و حقیقت نگاری کے لئے آپ عوام میں زیادہ مقبول نہیں ہیں کیونکہ بولشویک عظمتِ حالیہ کے دلدادہ ہیں۔ اور دولتِ ماضیہ کے اعادہ و بیان کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ اب کچھ مدت سے لینانف کے آرٹ کو اُن لوگوں نے جو ذوقِ سلیم کے سچے لذت شناس سمجھتا شروع کیا ہے۔ لینانف تازہ واردانِ ادب میں سے ہے۔ ۱۹۲۲ء سے آپ نے نثر نگاری شروع کی ہے۔ اس سے قبل آپ ایک شاعر کی حیثیت سے ملک میں روشناس تھے۔ لینانف کے اسلاف کسان تھے آپ کو ڈوسٹکی اور گوگول کا حریف و ہمنوا سمجھنا غلطی ہے۔ آپ کی تصانیف میں لطافت۔ اُپج۔ ندرت۔ پائی جاتی ہے۔ یہ خوبیاں آپ کو صحیح طور پر چیخوف کا جانشین قرار دیتی ہیں ؛

(صادق ایوبی)

احسان ابھی چھوکرا تھا کہ ایک روز اُسے کھیت میں کام کرتے ہوئے بخار نے آلیا تھا۔ جس سے وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا اور سیپی سا منہ نکل آیا۔ آخر وہ ہلکان ہو کر رسان رسان گرتا پڑتا مصیبت کا مارا۔ لنگڑاتا ہوا اپنی مالکہ کے پاس جا پہنچا۔ مالکہ نے دفعیہ بخار کے لئے زیادہ مقدار میں کونین دیکر کہا کہ اس سے تم تندرست تو ہو جاؤگے مگر تمہارا بہرہ ہو جانا یقینی ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہی ہوا۔ احسان نے اس روگ اور کسالے سے چھٹکارا تو پالیا مگر کانوں کی قوت جاتی رہی۔ اِس بہرے پن نے اُسے جھگڑوں سے نجات دلادی۔ وہ آئے دن کے بکھیڑوں اور جھمیلوں سے نپٹ کر زندگی کے لٹے لٹے پٹے دن کاٹنے لگا۔

دنیا اُس کے خیال میں ساکت و صامت تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ تو در کنار اُسے بادل کی گرج تک سنائی نہ دیتی تھی۔ احسان کیلئے دنیا میں انسانیت غائب غلہ تھی۔ کیونکہ لوگ اس کی مزدوری مار لیتے تھے۔ وہ ایک بڑھئی تھا مگر فاقہ کش۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس کی عمر کا بیشتر حصہ فاقے میں بسر ہو چکا تھا۔ اس پر بھی بستی کا بے درد بے رحم مُلا اس کی مزدوری مار لیا کرتا تھا۔ بیچارہ سارا دن خونِ جگر پی کر لہو پانی ایک کرکے۔ قبریں کھودتا مگر شام کو کھوٹی کوڑی بھی پلے نہ پڑتی۔ حالانکہ گورکن کو منہ مانگی رقم دینی چاہیئے۔ ٹھیرا ناچکانا منع ہے۔ مزدوری دبالینا تو گناہ عظیم ہے۔ بستی کے شریر لڑکے صُدا دق اور

زچ کرتے تھے۔ ایذائیں دیتے تھے۔ اور تالاب میں پھینک دیتے تھے مگر کیا مجال کہ وہ اُف کرے یا موذیوں کو کوسنا دے۔

کوڑھ میں کھاج۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ نامراد احسان حسینہ پر ہزار جان سے فدا تھا۔ محبت کے اس کھٹراگ نے اس کا اور بھی پتلا حال کر رکھا تھا۔ اس ناکام محبت کے پاس حسینہ کا ایک رومال تھا۔ جب وہ تلخیٔ ایام سے گھبرا اُٹھتا تو اس نشانی سے دل بہلایا کرتا تھا۔ یہ رومال اُس کے لئے ایک ڈھارس تھی۔ بستی کے لڑکے رومال کو دیکھ کر مضحکہ اُڑاتے تھے۔ آوازے کستے تھے۔ مگر احسان ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ دنیا بھر میں اس کا کوئی نہ تھا۔ صرف ایک نگوڑی ناٹھی پھوپھی تھی جو ہمدرد و غمگسار تھی۔

اب وہ اپنا دکھڑا سنانے کے لئے اُدھر کا رُخ کر رہا تھا۔ اُسکی پھوپھی ایک بستی میں جو چند فرسخ کے فاصلہ پر واقع تھی ایک مُلاّں کے ہاں خادمہ تھی۔ وہ ایک پاکدامن و باحیا عورت تھی اس لئے لوگ اُسے "مریم" کہتے تھے۔ احسان عموماً مریم کے پاس جا نکلتا تھا۔ وہ اُس کی خوب دلدہی اور غمخواری کیا کرتی تھی۔ احسان غم غلط کر کے اپنے مسکن کو لوٹ آیا کرتا تھا۔ اسی معمول نے جان رکھ لی تھی۔ ورنہ فرطِ الم نے اُسے کب کا مٹا دیا ہوتا۔

جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے۔ دنیا پر عذاب طاری تھا۔ فوجی نقل و حرکت جاری تھی۔ ہر نیا دستۂ فوج احسان کی بستی سے گزرتا تھا۔ کیونکہ بستی برسرِ راہ واقع تھی۔ ہر روز شام کو احسان مزدوری سے فارغ ہو کر۔ تھکا ہارا۔ اوزاروں کا پشتارہ اٹھائے ہوئے فوجیوں سے دوچار ہوتا تھا۔ سپاہی اس کے لئے ہوّا نہ تھے حالانکہ فوجیوں کو دیکھ کر دیہاتیوں کے اوسان خطا ہوتے ہیں۔ فوجیوں نے لوٹ کھسوٹ شروع کر دی تھی۔ لوٹ کھسوٹ سے تو بھرے بھتولے گھر والوں کو ڈرنا چاہئیے۔ احسان کے گھر میں تو کھوٹی بھانگ بھی نہ تھی۔ اور گانٹھ گرہ میں بھی کچھ نہ تھا۔

برف باری شروع تھی۔ راستے ابھی برف سے اَٹے نہ تھے احسان کی فکرمند نگاہیں پھوپھی کی بستی پر جمی تھیں اور وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کے گھر کی جھلملاتی ہوئی روشنی اس کے خیر مقدم کے لئے تیار ہے حسینہ کا خیال رہ رہ کر چٹکیاں لے رہا تھا۔ حسینہ ایک رعنا اور مغرور لڑکی تھی۔ اُس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ ایک مرجھائی ہوئی فلاکت زدہ اور بے آب و رنگ صورت سے شادی کر لے۔ وہ اس امر کا کھلے بندوں اظہار بھی کر چکی تھی۔ جب احسان اس سخت و سنگین حقیقت سے آگاہ ہوا تو اُس نے حسینہ کے رومال کو جسے وہ حرزِ جان بنائے ہوئے تھا پھوپھی کو دیدینے کا ارادہ کر لیا۔ تاکہ وہ تیوہاروں پر اسے استعمال میں لا سکے۔

طیور اپنا آخری راگ ختم کر چکے تھے۔ موذن اذان دے چکا تھا۔ جس کی گونج تک فضا میں فنا ہو چکی تھی۔ دھندلکے میں احسان نے مُلاّ کے مکان پر پہنچ کر دستک دی۔ اُس کی پھوپھی کی بجائے مُلاّ کی بیٹی نے جواب دیا۔ کسی مجہول کیفیت نے احسان کا کلیجہ برما دیا۔ اس کے دل کی دنیا بدل گئی۔ اس نے اپنی ٹوپی کو ہاتھ میں لے کر لڑکی کو گھورا۔ نازک دل لڑکی احسان کی ہیئت کذائی دیکھ کر ڈر گئی اور بے اختیار ہو کر چیخ اٹھی۔ اس کی چیخ سنکر مُلاّ باہر نکل آیا۔ وہ بھونڈے لباس میں تھا۔ اور جھنجھلا کر بولا کہ مدت سے ہم مریم کو مٹی دے چکے ہیں۔ اُسے مرے کھپے اک زمانہ ہو چکا ہے۔ وقت پر اُس کی مٹی عزیز کرنے آئے ہو۔۔۔؟"

پھر سر کھجلا کر کہا۔ کہ سامنے اُس کا مدفن ہے۔ احسان کے دل پر ایک بجلی سی گری اور اُس کے ہوش کھو گئے۔ حواس فقرّ و ہو گئے۔ اب دنیا میں وہ بالکل کس مپرس تھا۔ نہ نام لیوا نہ پانی دلوا تھا۔ پھر اس نے ہکلاتے ہوئے مُلاّ کو سلام کیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے اسکی پھوپھی کا صندوقچہ رکھا تھا۔ اور کواڑ کے قریب اس کا دوپٹہ پڑا تھا۔ جسے اُٹھا کر اس نے کندھے پر ڈال لیا۔ پھر وہ رومال نکال کر اُسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ زبان بند تھی۔ حلق میں کانٹے تھے لبوں پر پپڑی بندھی تھی۔ اور جی بھرا ہوا تھا۔ رومال زیادہ قیمتی نہ تھا۔ حاشیہ پر پھول کاڑھے ہوئے تھے۔ البتہ رنگت خوبصورت تھی۔ فرطِ غم سے رومال کو ہاتھ لگانا دشوار ہو گیا تھا۔ اب یہ رومال نہ تھا۔ دہکتے ہوئے انگارے تھے۔ احسان نے رومال کو تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر دل ہی دل میں اپنی آوارہ بختی کو کوسا۔ کیونکہ اب وہ

بیلے ٹھنڈا اور بے کھٹو رتھا۔ سر چھپانے کو کوئی گوشہ کدر انک نہ تھا اور ایسے میں واپس جانا بھی محال تھا۔ راستہ پُر خطر تھا۔ آخر اُس نے بڑی تلاش و تجسس کے بعد رات کاٹنے کے لئے ایک بیوہ بھٹیاری کا گھر تاڑ لیا۔ اس بستی میں نشہ پانی کا استعمال عام تھا۔ ہر چھوٹا بڑا شراب کا رسیا تھا۔ بیوہ جھوٹ احسان کے لئے لذیذ شراب لے آئی۔ اسی اثنا میں ایک مدھم سی چیخ سنائی دی۔ بیوہ نے کان لگا کر کہا کہ "ظالم عاصم پھر اپنی بیوی کو زدوکوب کر رہا ہے"۔

اتنا کہکر بیوہ نے محسوس کیا کہ احسان کو اونچا سنائی دیتا ہے۔ پھر وہ اُسے دانتوں سے اُٹھا کر کمرہ کے اندر لے گئی۔ اور بولی کہ "اسی غریب خانے کو اپنا گھر جانئے۔ یہاں کسی کیل کا کھٹکا نہیں ——— ذرا کھل کر بیٹھو"۔

چراغ کے نزدیک پرانی پٹاری پر ایک موٹے جھوٹے کپڑے کی شرخ صدری پڑی تھی۔ جس میں لمبے لمبے شلنگے بھرے ہوئے تھے۔ سیب کے چھلکے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے جنہیں بیوہ نے اکٹھا کر کے کمرے کے باہر پھینک دیا۔ بیوہ مہمان کی دلداری و دلآسائی کیلئے ہر کوشش صرف کر کے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ احسان نے شراب ڈھال کر چھلکتے ہوئے پیمانے میں اپنا عکس دیکھا۔ عکس سیاہ تھا جسطرح اُس کا بخت سیاہ تھا۔ پھر تیوری چڑھا کر شراب پینے لگا۔ اُسے بادہ کشی کے آداب و مسائل یاد نہ تھے۔ کہ وہ ساقی گری کی ضرورت محسوس کرتا۔ فوراً دوسرا جام بھر کر رکھدیا اور جھجک کر کچھ زیر لب کہا۔ بیوہ نے یہ تیور دیکھ کر کہا کہ "خدا کے واسطے یہ رونا جھینکنا بند کرو۔ پیمانۂ و ساغر سامنے دھرا ہے مگر زبان نہیں کھلتی .... کوا بھی اپنے آشیانے میں منقار زیر پر نہیں رہتا۔ مگر تم ہو کہ دم بخود ہو ...."

اس نوکاجھونکی سے بیوہ نے احسان کو اُبھارا وہ اُسے پھسلانا چاہتی تھی ——— "تمہاری آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں ...... عورت ایسی آنکھوں کو قطعاً نہیں چاہتی۔ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو تجھے گھر سے نکال دیتی۔ کیونکہ عورت ہرگز ہرگز کسی تنک مزاج اور ترشرو مرد کو پسند نہیں کرتی ———"

احسان خاموش رہا اور برابر چراغ کی لو پر نظر جمائے رہا۔

اُسے ریجھانا پھسلانا اور رنگ پر لے آنا مشکل تھا۔ بیوہ مہر و محبت کی باتیں کر کے پشیمان ہو رہی تھی۔ احسان کے جذبات سراسر مردہ تھے وہ بیوہ کی جانب ملتفت نہ ہوا۔ حالانکہ وہ ہر ممکن ترغیب سے کام لے چکی تھی۔ احسان شراب کا عادی نہ تھا۔ اُسے کچے کٹھڑے کی چڑھ گئی اور وہ رہ رہ کر ہنکارنے لگا۔ بدمستی میں وہ خالی الذہن نہ تھا۔ اُس کی پھوپھی کا صندوقچہ اُس کے ذہن میں تھا۔ جوش مستی میں وہ ایکبار لڑکھڑا کر اُٹھا اور ایک پتھر اُٹھا کر اُسے خوب کھینچا۔ اس اوچھے پن پر اُس نے محسوس کیا کہ در و دیوار اُس کا مضحکہ اُڑا رہے ہیں ———

آخر وہ نشہ میں چور ہو کر پڑ رہا۔ رات بھر گھناؤنے خواب دیکھتا رہا۔

بیوی کی امیدیں منقطع ہو چکی تھیں۔ احسان کی گرہ میں مال بھی نہ تھا۔ کہ وہ ہتھیانے کی آس رکھتی۔ اُس کا ٹھیرنا خسارے کا سودا تھا۔ بیوہ نے گجردم اُس کے شانے ہلا کر اُسے نیند سے بیدار کیا۔ احسان جماہیاں لیتا ہوا۔ بے کیفی کے عالم میں اُٹھ کھڑا ہوا اور ذرا سی ہچر مچر کے بعد گھر کی راہ لے لی۔ دل اندھا ہوا تھا۔ کل کل ٹوٹ رہی تھی۔ جوڑ جوڑ چٹخ رہا تھا۔ اور سر کا چکر چلنے سے مانع تھا۔ مگر احسان لشتم پشتم آنکھیں بند کئے برابر بڑھتا چلا گیا۔ عالم بڑا سہانا تھا۔ اس کا دل ٹھیر گیا۔ دماغ کام کرنے لگا۔ اور وہ لہرا کر کچھ گانا چاہتا تھا۔ کہ ناگہاں ایک پھونس کے جھونپڑے پر نظر پڑی اور وہ چپ ہو گیا۔ ایک بڈھا ٹھڈا راہ روک کر بولا کہ "اے قضا کے مارے! یہاں سے اُڑنچھو ہو جا ورنہ دھر لیا جائے گا۔ رات ایک گھوڑا چوری ہو گیا ہے اور پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے"۔

بڈھا احسان کے گھر گھاٹ کو جانتا تھا۔ احسان صدموں کی جان کان دبا کر چلتا تھا۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ احسان کی آنتیں قُل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ پیٹ پیٹھ سے لگ چکا تھا۔ راستہ میں فوج کا دستہ ملا۔ احسان نے ٹیلے پر چڑھ کر بستی پر نگاہ ڈالی تو ایک جم غفیر نظر پڑا۔ وہ اِسے کوئی جھنجھٹ سمجھ کر دوڑا۔ وہاں پہنچکر دیکھا تو آنکھ کا کاجل چرانے والا ہٹنڈا مستنڈا لوہار سپاہیوں کے نرغے میں تھا۔ لوہار بال باندھا چور تھا۔ ہیکڑی سے چوری کرنا اُس کا شیوہ تھا۔ جس کی دھاک دور دور تک تھی۔ وہ اُداس نہ تھا۔ کیونکہ

وہ ایک ضمیر باختہ انسان تھا۔

انصاف کے پتلے فرید نام ایک شخص نے اعیانِ مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ "مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ اب اس کی وہاں گردن ماریئے جہاں پانی نہ ہو۔ ورنہ یہ ذات شریف ہمارے گھروں میں جھاڑو پھیر دے گا۔ دیکھو تو سہی یہ دھوبا دیدہ کیسا خوش خوش نظر آتا ہے ـــــ حالانکہ ہیکڑ سے ہیکڑ مجرم بھی شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے دیدوں کا پانی ڈھل چکا ہے۔ اب کوئی دم میں جیلخانہ کی ہوا کھائے گا۔ تو تمام مشٹنڈ مردی غائب غلّہ ہو جائے گی اور مغز کے کیڑے جھڑ جائیں گے ـــــ"

یہ سنکر لوہار کے پاؤں سے لگی سر میں بجھی۔ اُس نے بیڑی کا کش لے جواب دیا کہ "میں خمیازہ بھگت لوں گا۔ میری تو لوہے کی چھاتی ہے ـــــ!"

لوہار فرید کی گردن ناپ لیتا مگر بے بس تھا۔ فرید قابو میں آتا تو وہ اس مردار کی کُتر کُتر کرتی جیب گدی سے کھینچ لیتا۔

فرید نے دانت پیس کر کہا۔ کہ مردود! اب تجھے لینڈی کُتے کی موت ماریں گے ـــــ لینڈی کُتے کی ـــــ۔"

اسی اثنا میں ولی کھوکھر نے جس کی آنکھوں میں ذرا سیل نہ تھا مجمع سے سر نکالا۔ ولی بنولے بنانے میں طاق تھا۔ اپنی چرب زبانی کے باعث وہ ایک پختہ کار اور صائب الرائے شخص تسلیم کیا جاتا تھا۔ بستی والے اس کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ اُس نے آگے بڑھ کر یہ شوشہ چھوڑا کہ "لوہار قطعاً مجرم نہیں ہے۔ شہر میں اونٹ بدنام کا معاملہ ہے۔ گھوڑا کسی اور نے چرایا ہے۔ لوہار کو قید کرانے سے پہلے ہمیں اپنے گھوڑے کاٹ کے رکھ دینے چاہئیں ـــــ پتھر پڑیں اس سمجھ پر۔ ساری بستی میں صرف ایک لوہار ہے جو گھوڑوں کی نعلبندی کرتا ہے۔ پھر یہ شخص گھوڑوں کے جملہ امراض کا ماہر بھی ہے ـــــ خدا را ذرا مطلب کی گھات چلو۔ اس میں کس کا نقصان ہے ـــــ؟"

ولی نے احسان پر نظر ڈال کر کہا۔ کہ "بستی میں چار بڑھئی موجود ہیں۔ ہم آسانی کے ساتھ ایک جدا کر سکتے ہیں۔ لوہار کے بدلے بڑھئی بھیجا جا سکتا ہے ـــــ"

ولی نے جب ہندی کی چندی کر کے سمجھایا۔ بچھایا تو اہل قریہ اسکے آلے بالے میں آگئے۔ انہوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی اور یہ اوڑھنا احسان کے گلے میں ڈالنے پر تُل گئے۔ اِدھر احسان مجمع چیر کر اندر آگیا۔ بہرے عموماً ایسا ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ کبھی معاملہ فہمی کی خلش اپنے اندر رکھتے ہیں۔ مجمع پر سکوت طاری تھا۔ احسان کو معاً خیال آیا کہ لوگ اُسکی جانب متوجہ ہیں۔ اسی لئے وہ شرما گیا۔ آنکھ کا جادو مشہور ہے۔ نڈر سے نڈر بھی جھینپ جاتا ہے۔

وہ یتیم تھا۔ غریب تھا۔ بےکس تھا۔ بے نوا تھا۔ اس کا کوئی لاگو نہ تھا کہ اس کی لاگ لپیٹ کرتا۔ اُس کا کوئی کھونٹا نہ تھا کہ اُس پر کُودتا ـــــ وہ مجرم تھا۔ کیونکہ اس کے بارے میں کان ہلانیوالا کوئی نہ تھا۔ بے رحم برادری اُسے مجرم گردانے پر تُل چکی تھی۔ زبردست زیردستوں پر ہاتھ صاف کر سکتے ہیں۔ امیر غریبوں پر ظلم ڈھا سکتے ہیں زبان تراش بے زبانوں پر آفتیں توڑ سکتے ہیں۔ احسان منہ پھیر کر ہنس دیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوجھ کر قربانی دینے کے لئے تیار ہے۔ نیکی نے غریبوں کو جرأت کی دایہ دودھ دھارتی ہے۔ اس کی بےگناہی ظاہر تھی مگر بستی والوں کے دل پک چکے تھے۔ وہ مقدس جذبۂ رحم جو دلوں میں ودیعت کیا گیا ہے۔ مفقود ہو چکا تھا۔ اور شقاوت جاگزیں تھی ظالم ضمیر کا خون کرنے پر تُل چکے تھے۔ اب خدا لگتی کہنا پتھر نچوڑنا تھا۔ ایک بڈھے جھبڑوس نے جو احسان کے قریب کھڑا تھا۔ کہا کہ "احسان مان لو ہماری یہی خواہش ہے۔ اب اس سے سرتابی محال ہے ـــــ"

عزیز نے آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر کہا کہ قوم کی خواہش کا احترام کرو۔ ہم تمہیں اپنی اولاد کی طرح کفنائیں گے اور دفنائیں گے۔ خاطر جمع رکھو ـــــ"

اس پر تمام مجمع نے صاد کیا مگر بے نوا احسان اس پہیلی کو اب بھی نہ بُوجھا اور ٹکر ٹکر دیکھا کیا۔ اب بھڑ چھپٹ چکی تھی۔ لوگ اُس کی طرف سراسر متوجہ تھے۔ حالانکہ بھول کر بھی آج تک کسی نے اُس پر نہ تھوکا تھا احسان حیران تھا کہ بستی والوں نے آج کیا جاتی دنیا دیکھی ہے؟ عمر کے دن بھرنے والا رہ رہ کر ہنس دیتا تھا۔ وہ گناہگار نہ تھا

ظالم برادری نے ناحق پھانسا تھا۔ غریب ایک پھانس ہوتا ہے جو رہ رہ کر دلوں میں کھٹکتا ہے۔ مفلس ایک خار ہوتا ہے۔ جو رہ رہ کر آنکھوں میں چبھتا ہے۔ پھانس اور کانٹا نکالے بغیر چین نہیں آتا۔

بیچارہ احسان ایک مسرت افروز استعجاب کے ساتھ یہ خیال کر رہا تھا کہ اہلِ قریہ شاید اسے پُرسا دینے آئے ہیں ——!

مجمع کھیت سے نکل کر بستی کے قریب پہنچا تو بستی کے لڑکے اور لڑکیاں احسان کو حقارت آمیز رحم کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ پھر دو مسلح سپاہیوں نے اُسے حراست میں لے لیا۔

....

(ترجمہ بہ تصرفِ کثیر)

ہوا آہیں بھرنے لگی۔ فضا مغموم ہو گئی۔ مظلوم احسان نے جھاڑی سے پتہ توڑ کر انگلی سے صاف کیا۔ اور اُسے مٹھی میں بند کر کے سونگھا —— تبسم اس کے لبوں پر کھیلنے لگا۔ خوشی سے نگاہیں بول اُٹھیں معًا اس کی پھوپھی کا صندوقچہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ اِس یاد نے اُس کے دل میں سیکڑوں سوئیاں بھونکدیں اور زردیاں چہرے پر کھنڈ گئیں —— "حسینہ کو میرا آخری سلام کہنا!"

یہ تھا وہ پیامِ محبت جو غم نصیب احسان کی زبان سے نکلا۔ پھر وہ خاموش ہو گیا۔ جس طرح فطرت خاموش اور بے زبان ہے۔ احسان کی اس خاموشی اور بے زبانی میں ہزاروں افسانۂ دردِ متکلم و گویا تھے۔

(صادق ایوبی جرنلسٹ)

جگر پارے

(از جناب جگر مراد آبادی)

اُف وہ روئے تابناک و چشمِ تر میرے لئے
جوشِ غم جوشِ حیا آغازِ عشق احساسِ حسن
کچھ تجاہل کچھ تغافل کچھ توجہ کچھ غرور
سر سے پا تک آہ وہ اک پیکرِ حسنِ حزیں
عشوہ عشوہ منظرِ حسن و جمالِ رنگ رنگ
ہر نفس میں ایک دنیائے محبت تو بتو
سامنے آتے ہی آتے وہ تنفس تیز تیز
وہ رُخِ رنگیں پہ انوارِ محبت زرد زرد
حیف وہ لغزیدہ لغزیدہ قدم میری طرف
شبنم آلودہ وہ آنکھیں وہ گلاب افشاں جبیں
سرد سرد آہوں میں تاثیرِ محبت گرم گرم
ہائے وہ رنگین رُخ وسیمیں تن و زریں کمر
اس نگاہِ ناز میں وہ ہلکی ہلکی جنبشیں
وہ مری آزاد فطرت وہ مرا تمکین ہوش
اُف وہ کہنا اس کا بھر باہوں میں باہیں ڈال کے

ہائے وہ زلفِ پریشاں تا کمر میرے لئے
کشمکش سی کشمکش آٹھوں پہر میرے لئے
رات دن میرے لئے شام و سحر میرے لئے
چار جانب دیدۂ حسرت نگر میرے لئے
جلوہ جلوہ دعوتِ ذوقِ نظر میرے لئے
ہر نظر میں اک پیامِ تازہ تر میرے لئے
سینۂ شفاف وہ زیر و زبر میرے لئے
وہ لبِ نازک پہ طوفانِ شرر میرے لئے
ہائے وہ دزدیدہ دزدیدہ نظر میرے لئے
وہ دھڑکتا دل وہ گھبرائی نظر میرے لئے
خشک خشک آنکھوں میں جوشِ اشکِ تر میرے لئے
ہائے وہ لعلیں لب و سلکِ گہر میرے لئے
معنیٔ بے لفظ و شرحِ مختصر میرے لئے
وہ شکستِ حسن وہ نیچی نظر میرے لئے
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

اصلاحات ۱۹۱۹ء

جدید اصلاحات

(از جناب گپتا - ایم - اے - سونی پت)

لارڈ مونٹیگو کے اعلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پارلیمنٹ نے ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا۔ ان اصلاحات کا نفاذ ہندوستان میں ۱۹۲۱ء میں ہو گیا تھا۔ موجودہ نظام حکومت انہی اصلاحات کے ماتحت مرتب ہوا ہے ان اصلاحات کی خصوصیت یہ تھی کہ ہندوستان میں خود مختاری حکومت کی بنیاد پڑی۔ خواہ خود مختاری کتنی ہی محدود کیوں نہ تھی۔ جیسا کہ قسط اول میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہندوستانی تو خواہاں تھے کہ ان کو خود مختاری حکومت حاصل ہو جائے۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے کانگریس مسلم لیگ نے ایک مشترکہ رپورٹ تیار کی تھی اور لکھنؤ میں ہندوستان کی ہر دو اہم جماعتوں نے باہم میثاق بھی کر لیا تھا مگر برطانوی جن کا صدیوں کا مفاد ہاتھوں سے جا رہا تھا کس طرح مقتضی ہو تا کہ ہندوستانیوں کو خود مختاری حکومت دیدی جائے۔ اسی بنا پر ہندوستانی مطالبہ کی سرتوڑ مخالفت کی۔ لیکن حکومت برطانیہ لارڈ مونٹیگو کے اعلان کی روشنی میں قدم پیچھے نہ ہٹا سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے ان مخالف نظریوں کی درمیانی راہ اختیار کی یعنی ہندوستان میں دوعملی حکومت قائم ہو گئی۔

دوعملی حکومت کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی حکومت دو حصوں میں منقسم کر دی جائے۔ کچھ حصہ پر سرکار برطانیہ پہلے کی طرح با اقتدار رہے ان معاملات کو غیر منتقلہ قرار دیا گیا۔ اور کچھ معاملات پر ہندوستانی حاوی ہو گئے۔ جو منتقلہ امور کہلائے برطانوی مدبر کوشاں تھے کہ ہندوستانیوں کو ان امور پر قدرت عطا فرمائی جائے جن پر وہ آسانی سے حاوی ہو سکیں اور جو ان کے لئے وسیع میدان تجربہ مہیا کر سکیں۔ لیکن جن میں ناتجربہ کاری کی بنا پر اگر غلطی ہو جائے تو اس کا ازالہ بآسانی ہو سکے ان شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے مرکزی حکومت کا تمام انتظام غیر منتقلہ معاملات کی فہرست میں شمار ہوا۔ کیونکہ مرکزی حکومت کے پاس اول تو اہم معاملات تھے۔ مثلاً فوج۔ خزانہ۔ سکہ درآمد برآمد ریلوے ڈاکخانہ وغیرہ وغیرہ جن کے انتظام میں غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور جہاں خفیف ترین غلطی تمام ملک میں انتشار پیدا کر سکتی ہے اور دوسرے مرکزی حکومت کا کام صوبوں پر نگرانی رکھنا تھا اس کے لئے بھی تجربہ و دانشمندی کی ضرورت تھی۔ لیکن ہندوستانی فن حکومت سے اسوقت ناآشنا محض تھے۔ مسلم حکومت کی بربادی کے بعد ہندوستانیوں کا کام خدمات سرانجام دینا رہ گیا تھا۔ نہ کہ حکومت کرنا اس لئے ان پر حکومت کا بار ڈالدینا خطرہ سے خالی نہ تھا۔

اس لئے صوبے خود مختار حکومت کے تجربہ گاہ قرار دئے گئے۔ صوبوں میں بھی یہی سوال پیدا ہوا اس لئے صف اول میں لگان زمین۔ عدل وانصاف پولیس۔ مالیات وغیرہ وغیرہ اہم صیغہ جات رکھ لئے گئے اور دوسری فہرست میں تعلیم۔ زراعت آبپاشی۔ ہسپتال۔ لوکل سیلف گورنمنٹ وغیرہ وغیرہ درج کئے گئے۔ موخر الذکر امور منتخب شدہ ممبران کونسل کے سپرد کئے گئے اور ان کی تنظیم و ترقی کا بار ان کے کندھوں پر رکھدیا گیا۔ کونسل کو حق دیا گیا کہ وہ وزراء سے ان امور کے متعلق دار العوام کی طرح معلومات حاصل کرتی رہیں اور اگر وزراء بدنیتی سے کونسل کے احکام کے خلاف کوئی کام کریں

تو وہ ان کو ان کے عہدے سے برخاست کر سکتی تھیں۔ وزراء پر کونسلوں کو مکمل اقتدار دینے کی غرض سے وزراء کی تنخواہ بھی کونسل کی رائے پر منحصر رہی یعنی اگر کونسل کسی وزیر سے ناراض ہو جائے تو وہ اس کو تنخواہ دینے سے انکار کر سکتی تھی اور وزیر کو مجبور کر سکتی تھی۔ کہ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے غرض ان امور پر کونسل کو مکمل اختیار حاصل تھا۔ گورنر عموماً وزرائے کونسل کے کاروبار میں دست اندازی نہ کرتا تھا۔ لیکن اگر وزیر کوئی ایسی تجویز رواج دینا چاہے جس سے صوبہ کا امن خطرہ میں ہو یا مرکزی حکومت کے اختیارات یا فرائض پر ضرب لگے یا دوسرے صوبوں کی حق تلفی ہو۔ تو گورنر دخل دے سکتا ہے۔ اور اس حالت میں وزیر کو ایسی تجویز سے دست بردار ہونا پڑتا ہے یا اپنے عہدے سے مستعفی۔

لیکن اول الذکر امور کا انتظام کا ذمہ دار گورنر تھا اور اس کی امداد کے لئے ایک کونسل مقرر کی جاتی تھی جس کے ممبر مختلف شعبوں کے صدر ہوتے تھے اور ان کے انتظام کے ذمہ دار۔ لیکن یہ ذمہ داری گورنر سے متعلق تھی۔ کونسل ان معاملات میں کسی پر کوئی قرار داد پاس کر دے۔ لیکن یہ قرار داد بمنزلہ سفارش کے ہوتی تھی۔ یعنی گورنر خواہ اسے منظور کر دے یا نامنظور رہنے دے۔ گورنر کا یہ حق غیر منتقلہ امور کی ترکیب میں پنہاں تھا جب وہ ان امور کے انتظام کا گورنر جنرل سکریٹری آف سٹیٹ اور اس کی وساطت سے پارلیمنٹ کا جوابدہ تو ضروری ہے کہ اسے اختیار بھی ہو کہ ان امور میں اپنی حسب منشا کام کر سکے۔ کونسل[1] میں گورنر صدر ہوتا ہے۔ اور عموماً کثرت رائے پر عمل کیا جاتا ہے۔ لیکن گورنر کو اختیار ہے کہ بر بنائے ضرورت کثرت رائے کے خلاف عمل کرے۔

چونکہ کونسل[2] میں منتخب شدہ ممبران کی کثرت قائم کی گئی اور یہ ممبر رائے عامہ سے منتخب ہوتے تھے۔ اس لئے رائے دہندگان صفات ایسی قرار دیگئی کہ زیادہ سے زیادہ اشخاص رائے دہندگان بن سکیں۔ اگرچہ دوعملی میں فرائض حکومت دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی اور حصہ کی ذمہ داری مختلف الخیال اور متضاد خیال کے لوگوں کے کاندھوں پر رکھدی گئی۔ لیکن خزانہ کا انتظام مشترکہ ہے یعنی ذرائع آمدنی تقسیم نہیں کی گئی۔ صوبہ کی کل آمدنی ایک ہی جگہ جمع کی جاتی ہے اور مشترکہ ملکیت ہے۔ شروع سال میں وزرا اور کونسل[1] کے ممبر متحدہ فیصلہ کرتے ہیں کہ منتقلہ و غیر منتقلہ صیغہ جات میں کس تناسب سے رقم تقسیم کیجائے۔ اگر کسی وجہ سے وزرا اور ممبران کونسل کسی فیصلہ پر قائم نہ ہو سکیں تو گورنر کو اختیار ہوتا ہے کہ حسب ضرورت دو حصوں میں روپیہ تقسیم کر دے۔ گورنر کا فیصلہ آخری اور ناطق ہے اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا۔ ممبران کونسل کو تو احتجاج کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ جو بار ان کے کاندھوں پر ہے اس کی حقیقی ذمہ داری گورنر پر ہے اور ان صیغہ جات کی تنظیم کا گورنر ہی جوابدہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ گورنر حتی الامکان اپنی ذمہ داری کے بار کو ہلکا بنائے۔ اور دوسروں پر اپنی ذمہ داری ڈالدے اور ہر حالت میں غیر منتقلہ صیغہ جات کی ضروریات اس کے پیش نظر رہیں گی۔ البتہ وزرا کو بسا اوقات شکایت رہتی ہے کہ ان کو اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ نہیں دیا جاتا کیونکہ ان کے پاس روپیہ کی کمی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پندرہ سالہ دور حکومت کے بعد بھی تعلیم معدودے چند سے زائد نہیں اور حسب منشا اضافہ نہیں ہوا۔ ہسپتال اور صفائی کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ دیہات کی ضروریات میں کوئی عمدگی نہ پیدا کر سکے

دوعملی کے دور میں صیغہ مالیات غیر منتقلہ صیغہ تھا۔ اس کی تنظیم ممبر مال کے سپرد تھی اور ہر وزیر اپنی مجوزہ تجویز ممبر مال کے پاس بھیجتا تھا تاکہ صیغہ مال اسکو مالی حالت کے متعلق مشورہ دے سکے۔ مگر صیغہ مال اس تجویز کو نہ محض مالی نگاہ سے پرکھتا تھا۔ بلکہ اس کی پالیسی پر بھی رائے زنی کرتا تھا۔ گو وزیر مالیات کے مشورہ کا پابند نہیں تھا۔ اور اسے رد بھی کر سکتا تھا۔ لیکن ممبر مالیات کی رائے کو ٹھکرانے کے بعد اسکو روپیہ حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے لئے اب یہ راستہ رہ جاتا تھا کہ وہ گورنر کے پاس جائے اور اس سے خصوصی رضامندی حاصل کرے۔ لیکن یہ قریباً ناممکن تھا۔ کیونکہ گورنر غیر منتقلہ صیغہ جات کی تنظیم کا ذمہ دار تھا اس حالت میں صیغہ مال کی رائے کو کیسے ٹھکرا سکتا تھا۔ نیز بعض صیغہ جات کی تنظیم خود ممبر مال کے سپرد تھی۔ قدرتاً وہ اپنے صیغہ جات کی ترقی کا زیادہ خیال رکھتا تھا

---

[1] کونسل سے مراد گورنر کی کونسل ہے۔ جس کے تمام ممبر نامزدہ ہوتے ہیں جو مختلف شعبوں کے صدر ہوتے ہیں۔ یہ ممبر کونسل ایوان واضع قوانین کے ممبر بھی ہوتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ منتخب شدہ ممبران ہوں۔ بلکہ یہ ممبران عمداً غیر منتخب ممبران میں سے ہیں۔ جو کہ اپنی قدرتی استعداد یا ذاتی کمال کی بدولت اس عہدہ تک پہنچتے ہیں۔

[2] کونسل سے مراد ایوان واضع قوانین ہے۔

ہندوستانی مدبر ہمیشہ اس امر پر زور دیتے رہتے ہیں۔ کہ صیغہ مال کسی منتخب شدہ کونسل آئین ساز ممبر کے سپرد ہونا چاہئے لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ہندوستانی ابھی فنِ حکومت میں نو آموز کی حیثیت رکھتے تھے۔ کسی اہم صیغہ کو ان کے سپرد کر دینا خالی از خطرہ نہ تھا۔ اس لئے صیغہ مالیات غیر منتقلہ صیغہ رہا

مرکزی حکومت کے نظام پر روشنی ڈالنے سے قبل صوبہ جاتی حکومت کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ کونسل آئینی و قانون سازی کے ممبروں میں کثرت منتخب شدہ ممبرونکی ہوتی ہے۔ اور ۳۰ فیصدی سے زیادہ نامزد ممبروں کی تعداد نہ ہوسکتی تھی۔ جن میں کچھ سرکاری اور کچھ غیر سرکاری آدمی ہوتے تھے۔ کونسل ۲/ کا صدر کونسل خود منتخب کرتی تھی۔ کونسل کو بجٹ کے کافی حصہ پر رائے زنی کا حق حاصل تھا۔ اور غیر منتقلہ صیغہ جات پر وہ پوری طرح حاوی ہوتی تھی۔ ان کی پالیسی کو جس سانچہ میں چاہتے ڈھال سکتے تھے اور وزراء کو ان کے عہدوں سے خارج کر سکتے تھے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ کونسلوں نے اپنا کام حقیقی توجہ اور دلچسپی سے انجام نہیں دیا۔ ہندو مسلم سوال ایک حد تک ممبروں کو مشترکہ لائحہ عمل پر کاربند ہونے سے روکتا تھا۔ سرمایہ پرست اپنے مفاد پر مزدور پیشہ لوگوں کو قربان کرتے رہے۔ نامزد ممبروں نے صورت حالات اور بھی خراب کر دی۔ وزراء نے قوم کی آواز پر چلنے کی بجائے گورنر کے اشارہ پر ناچنا پسند کیا۔ نامزد ممبروں کی ۳۰ فیصدی رائے اس حالت میں مل سکتی تھی۔ بعض لوگوں کو مذہبی طعن سے شریک کیا جا سکتا تھا۔ سرمایہ پرست اور رجعت پسند اصحاب بھی ان لوگوں کے ساتھ ملجاتے تھے۔ اس طرح پر وزیر نامزد ممبرونکی خوشنودی حاصل کر کے چند سرمایہ پرست اور رجعت پسند اصحاب بھی ان لوگوں کے ساتھ ملجاتے تھے۔ اس طرح پر وزیر نامزد ممبرونکی خوشنودی حاصل کر کے چند سرمایہ پرست اور رجعت پسندوں کی خوشامد کر کے اور چند مذہبی متعصبین کو بڑھا کر با اختیار بن سکتے تھے۔ کونسل کے منتخب شدہ عوام کے نمائندوں کی ان کو مطلق پروا نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ عوام کے نمائندے مختلف جماعتوں مختلف خیالات اور مفاد کے پیرو تھے۔ اس لئے ان کا کسی ایک مرکز پر متفق ہونا ناممکن تھا۔ وزراء اس لئے ان لوگوں کی مطلق پروا نہ کرتے تھے۔ اور دو عملی دور اسی لئے ناکامیاب رہا۔ اگر وزراء حقیقی طور پر وزراء ہوتے۔ اگر ملک و قوم کا مفاد ان کے پیشِ نظر ہوتا۔ اگر مذہب کو سیاسیات سے الگ کر کے وہ اقتصادی مفاد کو ہی اپنی بنیاد بنا لیتے تو ممکن تھا۔ کہ ہندوستان کہیں زیادہ ترقی کر چکا ہوتا۔ مگر خود غرضی نے کام خراب کیا۔ کیا ہندوستانی مدبرین اس تجربہ سے سبق لیں گے؟

مرکزی حکومت کے ایوان قانون ساز میں کثرت منتخب شدہ ممبران کی تھی۔ اور اسمبلی کو کسی حد تک بجٹ پر رائے زنی کا حق بھی حاصل تھا۔ مگر کوئی صیغہ خاص طور پر ان کے زیر اہتمام نہیں رہا۔ ماسوائے بجٹ پر رائے دہندگی کے جسپر کونسل آف سٹیٹ اور اسمبلی کو یکساں اختیار تھے۔ کوئی تجویز اس وقت قرارداد نہ بن سکتی تھی۔ جب تک کہ ہر دو ایوان متفق نہ ہوں۔ افتراق کے وقت دو ایوانوں کا مشترکہ اجلاس کیا جا سکتا تھا۔ اور یہ فیصلہ ناطق ہوتا۔ مگر گورنر جنرل نے ایسا کوئی موقع نہیں دیا۔ اور عموماً متنازعہ امور اپنی رائے سے فیصل کر دئے گئے۔

گورنروں کی انتظامیہ کمیٹی کونسل کی طرح گورنر جنرل کی مدد کیلئے بھی ایک کونسل مقرر کی جاتی ہے۔ جس کے ممبر مختلف صیغوں کے صدر ہوتے تھے۔ گورنر کی طرح گورنر جنرل بھی اپنی کونسل کا صدر ہوتا تھا۔ اور عموماً ہر امر کا فیصلہ کثرت رائے سے کیا جاتا ہے۔ مگر گورنر جنرل کو اختیار دے کر اگر اسے ضرورت محسوس ہو تو کثرت رائے کے خلاف احکام جاری کرے یہ حق گورنر جنرل کو ۱۷۸۶ء میں دیا گیا تھا۔ جبکہ لارڈ کارنوالس نے ہسٹنگز کے حشر سے سبق لے کر زور دیا تھا۔ کہ گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرنے سے پیشتر اسے اپنی کونسل پر کامل اقتدار دیا جائے۔ تاکہ وہ حسب منشا تنظیم سلطنت کر سکے۔

گو مرکزی حکومت کے جملہ دفاتر امور غیر منتقلہ ہیں اور ۸۵ فیصدی بجٹ پر بھی ایوان واضع قوانین کو رائے زنی کا حق نہیں لیکن نشو و نما کی فضا اس امر کی مقتضی تھی۔ کہ مرکزی حکومت میں بھی کچھ تبدیلیاں کی جائیں جو لارڈ مونٹیگو کے اعلان کا لفظی و معنوی مقصد تکمیل تک پہنچا سکیں۔ اس کیلئے مدبرین برطانیہ نے ایک جدید طریقہ اختراع کیا۔ گو قانونی لحاظ سے اسمبلی کو گورنمنٹ کی پالیسی پر اثر انداز ہونے کے لئے کوئی حربہ نہ ملا تھا۔ لیکن عملی زندگی میں اس کی کمی چند مراعات سے کی گئی۔ یعنی چند ایسی روایات پیدا کی گئیں۔ جن سے ہندوستانی مدبرین اقتصادی و مجلسی زندگی پر اثر ڈال سکیں۔ ان میں سب سے مشہور　　　ادٹوفی (اقتصادی آزادی)

تھی یعنی ہندوستانی مدبر ہندوستانی اقتصادی پالیسی کو مرتب کر سکتے تھے اس روپیہ کے ماتحت محفوظ محاصل تعمیر کئے گئے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی صنعت کو فروغ دینے کے لئے آمد پر اتنے محاصل لگائے جائیں کہ ہندوستانی صنعت ان کا مقابلہ بآسانی کر سکے۔ لیکن برطانیہ اشیا کو خصوصی مراعات بخشی گئیں۔

جیسا کہ پہلی قسط میں معلوم ہو چکا ہے کہ سکریٹری آف سٹیٹ کو اختیار کامل حاصل تھا۔ یا بالفاظ دیگر وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ ہر امر کے لئے اس کی منظوری ضروری تھی۔ مگر یہ اختیارات و آزادی کی سپرٹ دو متضاد چیزیں تھیں۔ اس لئے ضروری ہوا کہ سکریٹری آف سٹیٹ کے وسیع اختیارات پر قید و بند لگائی جائے۔ لیکن چونکہ سکریٹری آف سٹیٹ پارلیمنٹ کا نمائندہ تھا۔ اور اسی کو جواب دہ ہوتا تھا۔ اس لئے اس کے اختیارات پر قید لگانا پارلیمنٹ کے اختیارات پر قید لگانے کے مترادف ہے۔ مگر پارلیمنٹ کے اختیار پر کوئی آئینی قید نہیں لگائی جا سکتی کیونکہ یہ اصول کے خلاف ہے اس لئے مصنفان مونٹیگو رپورٹ نے سکریٹری آف سٹیٹ کے اختیارات تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سکریٹری آف سٹیٹ کے اختیارات آئندہ بھی ہوں گے جو ۱۹۱۹ء سے قبل اسے حاصل تھے۔ مگر صوبجاتی حکومتوں کے منتقلہ صیغہ جات میں اسے دخیل ہونے کا حق نفی کے مساوی ہے وہ ان کے اعمال میں خصوصی حالات میں ہی دخل دے سکتا ہے۔ غیر منتقلہ صیغہ جات میں بھی اگر کونسل اور حکومت کسی امر پر متفق ہوں تو سکریٹری آف سٹیٹ روایتی طور پر دخل نہیں دے سکتا۔ لیکن حکومت اور نمائندہ ممبران متفق ہی کب ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں کا زاویہ نگاہ جداگانہ ہے۔ اور دونوں کا نصب العین الگ ہے۔

مرکزی حکومت کے ایوان واضع قوانین میں نمائندہ ممبروں کی کثرت ہے۔ لیکن وہ کسی امر کے ذمہ دار نہیں۔ رائے دہندگان سے وہ کہہ سکتے ہیں کہ گورنمنٹ نے ان کی تجاویز قبول نہیں کی ایسی حالت میں ہم کیا کریں یہ جانتے ہوئے کہ حکومت کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر نہیں پڑ سکتی وہ بہ اطمینان حکومت کے نظم و نسق میں مداخلت کر سکتے ہیں ان کے بجٹ کے جس حصہ کو چاہیں نامنظور کر دیں جو قرارداد چاہیں پاس کر دیں اگر حکومت وقت کو ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے اور ان کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہ ہو کہ جس سے وہ اپنے فرائض کی انجام دہی اپنی مرضی کے مطابق کر سکیں تو انکے اوپر جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے وہ اس کو کسی طرح بھی نہیں ہٹا سکتے۔ ان فرائض کی انجام دہی کے لئے آئینی دو حربہ ان کے سپرد کر دیئے گئے۔ حربہ اول ہے وہ اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے غیر موافق قرارداد کو نامنظور کر سکتے ہیں یہ اختیار اصطلاح میں ویٹو کہلاتا ہے۔ یعنی اگر گورنر جنرل محسوس کرتا ہے کہ اسمبلی کی کسی قرارداد سے نظم و نسق ہند خطرے میں ہے۔ تو وہ اس قرارداد کو نامنظور کر سکتا ہے۔ دوسرے ذریعہ سے گورنر کو اختیار ہے - کہ اسمبلی یا کونسل آف سٹیٹ کسی ضروری قانون کو پاس کرنے سے انکار کر دیں۔ یا کسی بجٹ کے حصہ کو منظور کرنے سے منحرف ہو جائیں۔ جس کے بغیر حکومت اپنے فرائض کو انجام نہیں دے سکتی۔ تو گورنر جنرل اس قانون کو اپنی مرضی سے پاس کر سکتا ہے۔ اور اس حصہ بجٹ کو منظور کر سکتا ہے۔ اور اس صورت سے وہ قانون بنجاتا ہے اور مطلب پورا ہو سکتا ہے۔

لیکن یہ دونوں ذرائع اس وقت استعمال کئے جا سکتے ہیں جبکہ اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ باجلاس ہوں اور وہ کوئی ایسا قانون پاس کریں یا رد کریں۔ جس کی گورنمنٹ مخالف یا موافق ہو۔ لیکن اگر دونوں ایوان براجلاس نہ ہوں۔ اور ملک میں ایک ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ خصوصی ذرائع کی ضرورت محسوس ہو اور روزمرہ کے ذرائع صورت حالات پر قابو پانے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔ اس وقت گورنر جنرل کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ مناسب قانون خود نافذ کرے اور یہ قوانین اصطلاح میں آرڈیننس کہلاتے ہیں۔ اور چھ ماہ تک قانون کی حیثیت سے نافذ رہتے ہیں۔ چھ ماہ بعد گورنر جنرل ان قوانین کو دوبارہ اسی صورت میں نافذ نہیں کر سکتا۔ البتہ دوسری صورت میں رد و بدل کر کے جاری کر سکتا ہے۔

ہندوستانی سیاسی ناقد گورنر جنرل کی ان غیر معمولی اختیارات پر ہمیشہ نکتہ چیں رہے ہیں۔ مگر ان کی نکتہ چینی دراصل مروجہ آئین کے خلاف ہے۔ کیونکہ جب ہم ایک مرتبہ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ ہندوستان کا نظام حکومت صوبوں میں دو عملی ہوتا ہے۔ اور مرکز میں غیر ذمہ دار پھر ہم کسی طرح کے اختیارات کو ناجائز قرار نہیں دے سکتے کیونکہ کھلونے کی شکل وہی ہوگی جو ڈھانچہ کی فطرت میں منقش ہے۔ تصویر کی صورت خاکہ کے مشابہ ہی ہوا کرتی ہے۔

نمائش فنونِ ایرانیہ

(از جناب ڈاکٹر سید یمین ہاشمی - ایل - ایل - بی - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی - (لنڈن)

گو نمائش فنون ایرانیہ کو منعقد ہوئے پورے پانچ سال ہوگئے - لیکن جہانتک مجھے علم ہے اسکے متعلق کوئی تفصیلی مضمون ہندوستان کے کسی رسالہ یا اخبار میں شائع نہیں ہوا - میں نے مندرجہ ذیل صفحات میں جو توضیح و تفصیل دی ہے اور جس زاویہ نظر سے اس نمائش پر روشنی ڈالی ہے وہ یقیناً مفید ہے - اس قسم کے تحقیقی مضامین مشکل سے دلچسپ ہو سکتے ہیں - طوالت بھی ان کی ایک خصوصیت ہے - میں نے حتی الوسع دونوں نقائص سے بچنے کی کوشش کی ہے -

جس وقت یہ نمائش لنڈن میں ہو رہی تھی - میں اسی زمانہ میں وہاں بہ سلسلہ تعلیم مقیم تھا - لنڈن یونیورسٹی نے مجھے بہ حیثیت متعلم ادبیات فارسی اس نمائش میں کام کرنے کی ہدایت کی - اس نمائش کے ختم ہونے کے بعد یونیورسٹی نے مجھے اس کام پر مامور کیا - کہ میں ہندوستان میں گشت لگا کر فارسی قلمی نسخوں کی فہرست مرتب کروں - وہ معلومات جو میں نے نمائش میں حاصل کیں اور سیر ہندوستان کی "سیر و تفریح" نے کافی اضافہ کیا - مجھے امید ہے کہ ارباب مذاق اس سے لطف اندوز ہوں گے -

یوں تو نمائش کا ہر حصہ قابل توجہ و لائق بیان تھا - لیکن میں نے اس کے صرف دو شعبوں کے مطالعہ میں وقت صرف کیا - انکی بابت میں نے جو کچھ رائے قائم کی وہ ہدیۂ ناظرین ہے - مضمون کے آخر میں چند ضمیمہ جات بھی شامل ہیں - ضمیمہ (الف) میں نایاب و نادر الوجود کتابوں کی مختصر فہرست ہے - اس فہرست میں چند ایسی کتابیں بھی شامل ہیں - جو دیگر خصوصیات کے باعث قابل الذکر ہیں - ضمیمہ (ب) میں مشہور و مخصوص شبیہہ و تصویر کی فہرست ہے - ضمیمہ (ج) میں خوشنویسوں اور کتب نویسوں کی فہرست شامل ہے - میں نے ہر نام کے ساتھ سنہ حیات درج کر دیا ہے - آج اکثر فارسی کے قلمی نسخوں کی تاریخ صرف اس لئے معین نہیں کی جاسکتی کہ ان کے لکھنے والوں کا زمانۂ حیات معلوم نہیں - یہ فہرست اس غرض کے لئے بے حد مفید ہے - میں نے یہ فہرست یورپ کی متعدد فہرستوں سے تیار کی ہے - ضمیمہ (د) میں چند مشہور مصوروں کے نام درج ہیں - جن کا زمانۂ حیات معلوم ہوسکا وہ درج کر دیا گیا ہے - ضمیمہ (ر) میں چند متفرق اشیاء کا ذکر ہے جو تاریخی و ادبی حیثیت سے اہم ہیں میں نے بغرض زینت احمد جلائری کے دیوان کے ایک صفحہ کا عکس اور جہانگیر کی ایک نایاب شبیہہ کا عکس بھی شامل مضمون کر دیا ہے - (سید یمین ہاشمی)

مصوری (۱)

ایرانی مصوری خداداد مرصع نگاروں کا تمثیلی عمل ہے - گو اسمیں فطرتی جذبات کا اظہار تقریباً مفقود ہوتا ہے لیکن قصص و حکایات کی تمثیل بے مثل ہوتی ہے - اس کا سر قدرتی مناظر کے سامنے کبھی خم نہ ہوا - اس لئے کہ دنیاوی جاہ و حشم ہمیشہ

"اس کے سامنے سر بسجود رہے" (لارنس بنین)

جو تصویریں نمائش میں موجود تھیں ان کے دیکھنے سے بظاہر یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ ایرانیوں کو مصوری سے بہت کم شغف رہا ہے - قدرتی مناظر کی تصویریں تقریباً مفقود تھیں - قصص و حکایات کو مصور کرنے کی بہت زیادہ کوشش کی گئی تھی - اس کے بعد درجہ اول تصویروں کا تھا - جو ایرانیوں کے مذہب شیعیت نے

مختلف رخ پیش کر رہی تھیں۔

لیکن میں نے اپنی تحقیقات نمائش کی چار دیواریوں میں بھی محدود نہ رکھی۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں کے بیش قیمت ذخائر دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ ایرانیوں کو مصوری سے قدرتی مناسبت تھی۔ لیکن اندرونی و بیرونی اثرات نے اس ذوقِ فن کی ہمت افزائی نہ کی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ رہا کہ ایرانی اس فنِ لطیف میں کوئی غیر معمولی اور نمایاں ترقی نہ کر سکے۔

اصول دعوئی نبوت پر اگر غور کیا جائے تو ایران کی مثال دنیا میں یکہ و تنہا ہے۔ آدم سے رسول عربیؐ تک دنیا میں کسی مدعی نبوت نے فنِ مصوری کو اپنا معجزہ قرار دے کر نہیں پیش کیا۔ لیکن یہ فخر مانی کو حاصل ہے چونکہ مدعیان نبوت کے اسناد و معجزے ہمیشہ ملکی مذاق کے مطابق رہا کئے ہیں۔ اس لئے اگر میں یہ نتیجہ نکالوں تو بیجا نہ ہوگا کہ ایرانیوں کی سازِ زندگی میں مصوری کے لطیف نغمات بہرصورت موجود تھے۔ جس وقت مانی نے ملک کے سامنے اپنا "معجزہ" پیش کیا۔ اس وقت ایران کی فضا اس کے استقبال کے لئے ہمہ تن آمادہ تھی۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس کے اعلانِ نبوت کے وقت (تیسری صدی عیسوی) دنیا کے کسی حصہ میں یہ مذاق صحیح طور پر رائج نہ تھا۔

مانی اپنے مقاصد میں ناکامیاب رہا اور اس کا نام دنیا کے کامیاب پیغمبروں کی فہرست میں کبھی بھی شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس غیر معمولی ہستی کی ناکامرانی ایرانیوں کی بد مذاقی پر کبھی بھی محمول نہیں کی جا سکتی۔ جس قوم نے صناعی۔ معماری۔ نقاشی۔ شاعری ایسے فنونِ لطیفہ میں اپنے کمال دلبستگیوں کے ثبوت پیش کئے ہیں۔ اسکی بابت کبھی بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے جذبات تشکیل و تصویر سے متنفر تھے۔ ایک طرف تو زرتشت کے خشک مسائل نے جذبات میں جمود و سکون پیدا کر رکھا تھا۔ جن میں کسی قسم کی تحریک وارتعاش فوری صورتوں میں ناممکن تھا۔ دوسری سمت مانی کی صلح کل تبلیغی مسائل نے بہرام گور کو برگشتہ کر دیا تھا۔ مانی کی قبل از وقت وفات (۲۷۶ء) نے اس تحریکِ لطیف کو فنا تو نہیں لیکن دبا ضرور دیا۔

مزدک (چھ صدی عیسوی) کے مذہب کو فنونِ لطیفہ سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس مذہب کو موجودہ بالشویزم سے بہت کچھ مماثلت ہے جس طرح آج روس "نان و نمک" کے پیچھے دنیا کے سارے فنونِ لطیفہ کو چھوڑنے کے لئے آمادہ ہے۔ اسی طرح مزدکیت نے مادیت کی علمبرداری میں ہر شعبۂ حیات کو نظر انداز کر دیا تھا۔

جب ایران میں اسلام نے قدم رکھا (۶۴۲ء) تو ملک میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ ایک طرف تو قاضی کے فتوؤں نے مصوری کو معصیت قرار دیدی۔ لیکن دوسری طرف اس لطیف مذہب نے جذبات میں جو ہیجان پیدا کیا وہ مختلف صورتوں میں اظہار کے لئے مضطرب تھے۔ اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو خیال و عمل میں اتحاد کا مدعی ہے۔ ایک طرف تو وہ شرک کا دشمن جانی ہے اور "تجسید" کا عدوی مطلق۔ لیکن دوسری طرف عبودیت کے اظہار پیہم کا زبردست مدعی اور جذباتِ فطری کی تشکیل کا بے حد محرک۔ فتوئی تجسیدِ خیال کا مانع لیکن تقوئی تصویر ہئیت کا موئد۔ ظاہربیں آنکھیں اس فرق کو سمجھنے سے مدتوں مجبور رہی ہیں اب تک مشتبہ ہوں کہ دنیا اسلام کی اس زبردست خصوصیت کو اچھی طرح سمجھ بھی سکی یا نہیں۔

قاضی کے فتوے فنِ مصوری کے دشمن رہا کئے۔ لیکن جذبات کا تذکیہ جو اسلام کا لازمی نتیجہ تھا برابر جاری رہا اور اندر ہی اندر ایرانیوں کے دل اس قوت سے متاثر ہوتے رہے۔ شارع کی ظاہری پابندیاں چند دنوں تک نقاشی کو ضرور روک سکیں۔ لیکن شاعری جو مصوری کا روشن پیش خیمہ ہے۔ وہ ظاہر ہو کر رہی۔ ایرانی شاعری کی تاریخ میرے اس نظریہ کی موئد ہے۔ اب آپ پھر نفس مبحث کی طرف متوجہ ہوں۔

ایرانی مصوری کی تاریخ چار بڑے زمانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے

دور اول۔ ۵۵۰ء قبل مسیح لغایت ۶۴۲ء

یہ دور خود تین چھوٹے چھوٹے زمانوں میں منقسم ہے۔

(ا) عہد کیانی ۵۵۰ء ق۔م۔ لغایت ۳۲۶ء قمری۔ اس زمانے میں مصوری حقیقتاً موجود نہ تھی۔ اس لئے کہ کاغذ اس وقت تک مفقود تھا۔ پتھر۔ پیتل۔ اور مٹی کے برتنوں پر جو نقوش دستیاب ہوتے ہیں اُن سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی بت سازی و نقاشی میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔

(۲) عہد سکندری ۳۲۳ ق م ۲۲۵ء[۵۱] مذکورہ بالا عہد و نیز اس عہد میں یونانی اثرات سارے ایران پر حاوی تھے۔

(۳) عہد مانی ۲۲۵ء لغایت ۶۳۰ء۔ مانی چین میں مدتوں رہا اور اس نے ہندوستان میں بھی چند سال بسر کئے اس لئے اس دور کی مصوری نے چین و ہندوستان سے اگر کچھ خیالات حاصل کئے ہوں تو عجب نہیں۔ افسوس کہ اس عہد کی کوئی تصویر دنیا میں موجود نہیں۔

دور دوم ۶۴۱ء لغایت ۱۲۵۸ء۔ اسلام کے جدید اثرات کے باعث اس دور میں ایرانیوں نے مصوری سے ضرور اجتناب کیا۔ لیکن درخت اور پھولوں کی نقاشی و زرنگاری میں شغف جاری رہا۔ اس دور کی لکھی ہوئی کتابوں کے صفحات اس امر کے شاہد ہیں۔ زرنگاری میں جو رنگ آمیزی چینی اصول پر کی جاتی تھی۔ ہندوستان کا اثر گو بہت معمولی ہے لیکن جہاں تک میں غور کر سکا نمایاں ضرور ہے۔ نقوش کو روشن بنانے میں جو اجزا استعمال کئے جاتے تھے۔ وہ یقیناً ہندوستانی تھے۔ سطح و فضا کی ترتیب و تشکیل میں بھی ہندوستانی مذاق ظاہر ہو رہا ہے[۵۲]

دور سوم۔ تیرھویں صدی لغایت پندرھویں صدی۔

گو زوال بغداد کا المناک واقعہ ۱۲۵۸ء میں ہوا لیکن ایران کی حالت تیرھویں صدی کی ابتدا ہی سے ابتر ہو چکی تھی جس میں کسی علم و فن کی ترقی ناممکن تھی۔ مغلیہ تسلط کے بعد ملک نے کروٹ بدلی۔ مغلیہ سلاطین کی اسلامی تہذیب و تمدن سے نفرت۔ یہودیوں کا غلبہ اور مزید براں خانہ جنگی۔ یہ اسباب مدتوں تک ملک کو اطمینان طلب مشاغل کی جانب متوجہ نہ کر سکے۔ با ایں ہمہ ملک نے اس دور میں مصوری کی طرف دوسرا قدم بڑھایا۔ ماہرانِ فن نے غیر ذی روح سے آگے بڑھ کر ذی روح کو مصور کرنے کی کوشش شروع کی۔ سب سے پہلے کلیلہ و دمنہ کے نتیجہ خیز قصص تصویر کی صورت میں لائے گئے۔ بعد ازاں شاہنامہ کی حکایات کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔[۵۳] اس کے بعد خمسہ نظامیہ کے مختلف دلچسپ واقعات مصور کئے گئے۔

چودھویں صدی میں مصوری نے تین مزید مباحث کی جانب قدم بڑھائے۔ (۱) دواوین۔ (۲) تاریخ۔ (۳) مذہب۔ ان میں مذہبی تصاویر خاصکر قابلِ لحاظ ہیں۔ اس دور میں حضرت علیؓ و امیر معاویہؓ کی شبیہیں تیار کرنے کی سب سے پہلی کوشش کی گئی۔

پندرھویں صدی کی عملیات میں حضرت علی کی وہ تصویر مذہبی حیثیت سے نہایت اہم تھی جس میں آپ کو آسمان پر جاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔[۵۴] مصورانہ حیثیت سے اس دور کی دو خصوصیات قابلِ لحاظ ہیں۔

(۱) چینی اثرات کو ضبط و جذب کرنے کی سعی بلیغ کامیاب ہوئی اور اب ایک خاص ایرانی اثر ہر صورت میں غالب رہا۔

باغ و پھول کی تصویروں پر ایرانی سادگی کا صاف اثر معلوم ہونے لگا۔ سطح باغ و فضائے آسمانی کی تصویروں میں پہلی سی درشتی و ویرانیت باقی نہیں رہی۔ رومیوں کی تصویروں سے "مشابہت" ظاہر ہونے لگی۔ تصویر کے خاکوں میں جدتِ طبع و ندرتِ خیال نے بھی دخل پایا۔

(۲) اس دور کی تصویریں رنگ کے اعتبار سے بہتر ہیں۔ چینی و ہندوستانی اجزا میں جواہرات کی آمیزش نے روشنی و صفائی کے ساتھ ساتھ پختگی بھی پیدا کر دی۔

دور چہارم۔ سولھویں صدی لغایت انیسویں صدی۔

دور صفویہ بہر صورت ایران کا بہترین زمانہ خیال کیا جاتا ہے[۵۵]

---

۵۱ یونانی اثرات کے لحاظ سے یہ دور عہد سکندری یا عہد یونانی کے نام سے موسوم ہے گو تیسری صدی (قبل مسیح) کے وسط ہی سے یونان کے سیاسی اثرات ملک سے کم ہو گئے تھے اور پارتھین قوم نے ملک پر اپنا پورا اقتدار جما لیا تھا۔

۵۲ ملاحظہ ہو نافع الاحجار از [illegible] و علم الاسطرلاب از ابوالحسن کتب خانہ برٹش میوزیم لندن۔

۵۳ یہ واقعہ ایران کی سیاسی تاریخ میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔

۵۴ جنگ قادسیہ کے بعد ہی سے ایران کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ ہر طرح پر عرب سے آزاد رہے۔ یہ خیال ایرانیوں کی ہر تحریک کے پس پردہ کام کرتا رہا۔

۵۵ موجودہ دور پہلویہ اس میں شامل نہیں۔

جنگ قدسیہ کے بعد سے ایرانی حکومت ملکی میں تین چیزوں کا متلاشی تھا۔

(۱) عرب سے قطعی علیحدگی۔

(۲) قدیم ایرانی شاہی خاندان سے وابستگی۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اتباع شیعیت

(۳) قومی اصول پر نظم و نسق حکومت۔

ملک کو دور صفویہ میں یہ ساری باتیں حاصل تھیں۔ ایسی صورت میں اس کے سامنے ترقی کی سب راہیں کھل گئیں۔ شاہ عباس اعظم کے زمانۂ حکومت میں مغرب کے متعدد ماہرانِ فن ملک میں آ کر مقیم ہوئے۔ جن سے ایرانیوں نے کافی فائدہ اٹھایا۔ شاہ طہماسپ صفوی کا شوق مصوری و نقاشی اس درجہ بڑھا ہوا تھا۔ کہ قدیم روایات کے خلاف شعراور بارسے بالکل علیحدہ کر دیئے گئے[۱]۔

دور صفویہ کے ابتدائی حصہ میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی ان میں بہزاد کا نام خاصکر قابلِ ذکر ہے۔ اس کی مصوری کی بابت ایک مشہور ماہرفن کا خیال ہے[۲]۔

بہزاد کی فوقیت اس کے قوی و مستحکم خیالات میں مضمر ہے

اس کے معمول انفرادی حیثیت سے زندہ رہتے ہیں

اس کے انداز قوی و حق پرست ہوتے ہیں۔ اس کے

مصورانہ لطافت کے ساتھ ساتھ تخیل کی جدت خاصکر

قابل لحاظ ہے۔

اس کے علاوہ بہزاد میں ایک اور خصوصیت ہے۔ بہزاد کی تصویریں ایران کا بہترین قومی تخیل پیش کرتی ہیں۔ بہزاد کی تصویریں دورِ صفویہ کی آئینہ ہیں۔ اتحادِ نظر۔ ضبطِ عمل۔ تقسیم کار۔ غرض مجھے اس کی تصویروں میں ہر وہ بات نظر آئی جو شاہ عباس اعظم کی زبردست شخصیت اپنی محکوم رعایا کو اس دور میں پیش کر سکتی تھی۔

میرک (حیات ۹۴۴ھ ۔ ۱۵۳۸ء) جو بہزاد کے برسوں بعد آتا ہے اپنے پیشرو سے ممتاز خیال کیا جاتا ہے۔

[۱] "بقول عشق"

بے تکلف خوش ترقی کردہ انداز کاتب و نقاش و قزوینی دخر

براون جلد ۴ صفحہ ۹۷

[۲] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۵ رجنوری ۱۹۳۲ء مضمون نمبر ۱۵۔

میرک ایک کھوئی ہوئی کڑی ہے جو بہزاد کو اس مدرسۂ مصوری سے منسلک کرتی ہے۔

جسے شاہ طہماسپ صفوی نے تبریز میں قائم کیا تھا[۳]۔

بعض کا خیال ہے کہ میرک[۴] اس مدرسہ مصوری کا نہ صرف پیش رو بلکہ اصل استاد تھا۔ مدرسہ تبریز یہ کے چند شاہکار میری نظروں سے ضرور گزرے۔ لیکن میں اپنی عدم قابلیت کا معترف ہوں کہ میں ماہرانِ فن کی اس رائے کو نہ سمجھ سکا۔ میں اپنی محدود تحقیق کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مدرسہ تبریز کے ماہرانِ فن میرک کے نہیں بلکہ بہزاد کے متبع تھے۔ میرک کی تصاویر میں لطافت ضرور ہے۔ لیکن اس میں اور بہزاد میں وہی فرق ہے۔ جو فردوسی و نظامی میں ہے یا جو رزم و بزم میں ہے۔ علاوہ بریں میرک مغربی فن مصوری سے بے حد متاثر معلوم ہوتا ہے۔ گو اس کے نقوش بہزاد کے نقوش سے بے حد مشابہ ہیں لیکن اس میں ایرانیت کم اور مغربیت زیادہ غالب ہے[۵]۔ مدرسہ تبریز کی تصویروں میں رنگ آمیزی البتہ مغربی طرز پر ہے۔ مسٹر بینین کا خیال اس دور کی تصویروں کے متعلق قابل لحاظ ہے۔

"اس دور کی رنگین تصاویر میں جو جو ہرنگاری کا کمال

دکھایا گیا ہے۔ اس کی مثال دوسرے فنون میں

نایاب ہے۔ یہ تصویریں چینی تصاویر سے زیادہ شوخ

رنگ ہیں۔ اور لطف یہ کہ مغربی تصاویر کی طرح نہیں

عکس و سایہ بنانے کی کوشش بھی نہیں کی گئی ہے۔

اس لحاظ سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس دور کے ایرانی

مصور تصویر سازی میں صحیح ترین مذاق رکھتے تھے۔"

اس سلسلہ میں قاچاریہ دور کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ فتح علیشاہ کی مغرب پرستی نے اطالوی مصوروں کو ملک میں بلایا۔ اطالوی اثر نے مصوری کو آسان و سہل ضرور بنا دیا لیکن جس صنعت و فن پر ملک کو ناز تھا وہ بہت

[۳] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۵ رجنوری ۱۹۳۲ء مضمون نمبر ۱۵۔

[۴] میرک کو شاعری سے بھی شوق تھا۔ ملاحظہ ہو دیوان میرک او۔ آر ۴۹۱۲ ۔ برٹش میوزیم۔

[۵] شارڈن۔

جلد ایران سے تباہ و برباد ہو گیا۔

آج ایران ایک نئے دور سے گزر رہا ہے۔ جس میں مصوری سے زیادہ فوٹوگرافی (عکاسی) کی قدر ہے۔ ایرانی مصور ابھی دنیا سے فنا تو نہیں ہوا۔ لیکن دم توڑ رہا ہے۔

چونکہ مجھے شاعری سے کسی قدر دلچسپی ہے۔ اس لئے میں نے ان موزوں اشعار کو ضبط کر لیا جو چند تصویروں پر لکھے ہوئے تھے۔ مجھے امید ہے کہ موجودہ خشک مبحث کو مندرجہ ذیل اشعار دلچسپ بنانے میں کافی مدد دیں گے۔

(۱) ایک کمسن خوبرو عورت کی شبیہہ کے تحت میں:۔

اے قدِ تو سرو ناز پرور ؛ دلدادۂ قامتت صنوبر
نگرفت ببر نہالِ قدرت ؛ از نخلِ امید کسے برم بر

(۲) ایک شاہزادہ کی تصویر کے حاشیہ پر:۔

چو سرو قد تو در جوئبار دیدہ رسد ؛ مرا خدنگ بلا بر دلِ رمیدہ رسد
اگر صبا ز سر کوئے او رسد شاہی ؛ نسیم روضہ بجانِ ستم رسیدہ رسد

(۳) ایک "محوِ گلگشتِ چمن" کی تصویر پر:۔

پیوستہ جفا خوش نبود بلکہ وفا نیز ؛ ما عاشقِ دل سوختہ خود بہ ازیں باش

(۴) ایک زہد شکن واعظانہ انداز میں:۔

برآرد روزگار رت از سہ لب کام ؛ لبِ یار و لبِ جوئے و لبِ جام

(۵) ایک میخوار کی تصویر کے حاشیہ پر:۔

فی الجملہ اعتماد کلی بر ثباتِ عمر ؛ کایں کارخانہ ایست کہ تغییر می کند

(۶) سلطان حسین مرزا کی شبیہہ کے تحت میں:۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید ؛ حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

۷ ایک کجکلاہ کی تصویر کے حاشیہ پر:۔

دلِ من ببرد زلفش جگرم ببرد جنبش ؛ تو مباش غافل ایجاں کہ ہنوز کار دارد
نتوانمش کہ بینم بہ رقیبِ ناموافق ؛ چہ خوشیست گل و لیکن چہ کنم کہ خار دارد
بخدا کہ سینۂ من بشگاف و جاں بروں کن ؛ کہ درون خانۂ تو دگرے چہ کار دارد

(۸) ایک نوجوان عورت کی تصویر کے حاشیہ پر:۔

از لطفِ تو ہیچ بندہ نومید نہ شد ؛ مقبولِ تو جز مقبلِ جاوید نہ شد
لطفت بکدام ذرہ پیوست دمے ؛ کاں ذرہ بہ از ہزار خورشید نہ شد

(۹) ایک مصلے پر:۔

ابر دے دوست در نظر آر و نماز کن ؛ بنشیں و تکیہ بر کرمِ بے نیاز کن

(۱۰) ایک شاہزادی کی شبیہہ کے تحت میں:۔

فرہاد نیست ورنہ دریں عہدِ روزگار ؛ چندیں ہزار صورتِ شیریں کشیدہ اند

(۲) کتب و کتابت

اسلام و مغربی عیسائیت نے جو کتاب کی قدر و منزلت کی ہے اس کی مثال دنیا کے کسی تمدن میں دستیاب نہیں ہو سکتی خدا کے کلام کی دعوت یا تو مسجدوں کے گوشوں سے اٹھی یا کلیسا کے عافیت اندوز میناروں سے۔

(جے۔ اس۔ ولکنسن)

ایرانی کاتب خیالات کو الفاظ کا جامہ نہیں پہناتا۔ اس کی کتابت کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کاغذ کے تاریک صفحات پر اپنی روشن آنکھ کی بصیرت اور اپنے محرک ہاتھ کی قوت کا نچوڑ رکھ دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ اس کے بصیرت حروف دیکھتے ہیں۔ اس کے حروف کے مرکز کھینچتے ہیں۔ اس کے شعشے بنتے ہیں اور اس کے دائرے دنیا میں زندگی کے طریقے بناتے ہیں۔

(آر۔ کے۔ گڈری)

دنیا میں کس نے اور کب کتابت شروع کی۔ یہ ابتک لاینحل مسئلہ ہے اس کے بعثت کے زمانہ کو تاریخی انکشافات روز بروز آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک چینی حروف سب سے زیادہ قدیم سمجھے جاتے تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں یہ امتیاز مصریوں کو حاصل ہوا۔ لیکن آج ایشیائے کوچک سے جو اشیاء برآمد ہو رہی ہیں ان کے کتبے مصریوں سے بھی زیادہ پرانے سمجھے جاتے ہیں۔

ایران میں کتابت کب سے شروع ہوئی اس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ جب سر ہنری رالنسن نے بہستون (بے ستون) (دیکھو صفحہ ۲۶۷ صفحہ ۲۶۷ کے بعد) کے کتبات کامل دنیا کے سامنے پیش کیا اسوقت تک ارباب فن کا یہی خیال تھا کہ دارائے کیانی کے زمانہ میں کتابت نے

معین صورت اختیار کی۔ میرے گذشتہ قیام یورپ میں "دربند گوہر"[1] کے کتبات کی بابت جب مسٹر جی۔ جے۔ گیڈ نے اپنی تحقیقات پیش کی اسوقت دنیا کو یہ معلوم ہوا کہ سنہ ۲۵۰ ق۔ م۔ میں بھی ایرانی کتابت سے خوب واقف تھا[2]۔

لیکن بوجہ اس کے کہ کوئی شے کاغذ کی مانند[3] ابتک ایجاد نہ ہوئی تھی اس لئے اس دور کو اصلی معنوں میں کتابت کا زمانہ نہیں قرار دیا جا سکتا ساسانی دور میں کوئی شے کاغذ کی مانند ضرور ایجاد ہو چکی تھی۔ جب عہد فاروقیہ میں ایران فتح ہوا۔ اس وقت شاہی کتب خانوں میں بکثرت کتابیں موجود تھیں۔ مانی کے تعلق سے یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ کسی حد تک زرنگاری بھی موجود رہی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ مانی اور اس کے رفقا کی تصانیف جب خلیفۂ وقت کے سامنے نظر آتش کی گئیں اسوقت سونے اور چاندی بگھل بگھل کر بہتے تھے[4]۔

خلافت راشدہ کا آخری دور ایران کے لئے نہایت بدامنی کا زمانہ تھا۔ عہد بنو امیہ میں ایرانیوں کا رسوخ بڑھ چلا تھا۔ علوم مروجہ میں بھی ان کو کافی دخل تھا۔ لیکن فن کتابت ابتک عربوں ہی کے ہاتھ میں رہا اور جہاں ایرانیوں کو اس میں درک رہا۔ وہاں بھی وہ عربی اصول تحریر و کتابت سے خود کو مستثنےٰ نہ کر سکے۔

میں نے اس دور کی بعض تحریریں دیکھیں۔ چونکہ مجھے ان سے کوئی خاص شغف نہیں اس لئے میں ان میں کوئی امتیازی خصوصیت نہ پا سکا۔ میرے ایک دوست نے (جنہیں اس فن میں خاص درک ہے) البتہ مجھے چند باتیں بتائیں۔ ان کا خیال ہے کہ خود خط کوفی ایرانیوں کی اختراع ہے۔ چند عربی تحریروں میں (جو بنی امیہ کے ابتدائی عہد کی بتائی جاتی ہیں) اور اس عہد کی آخری زمانہ کی کوفی تحریروں میں ایک امتیاز ضرور ہے۔ یہ امتیاز حکومت عباسیہ میں نمایاں اور سہل النظر ہے۔ چونکہ دور عباسیہ میں ایرانی کلیتاً حاوی تھے۔ اس لئے ان کے مخترع اور قوم پرست طبائع نے عربی خط میں وہ تصرف کیا جس نے اسے بغیر مسخ کئے ہوئے ایرانی بنا لیا۔ قادر باللہ کے عہد زمانہ کی ایک کتاب حال میں دستیاب ہوئی ہے۔ جو کلیتاً فارسی خط میں ہے۔

ایرانیوں نے خط کوفی کو اپنا بنانے کی ایک دوسری ترکیب یہ کی کہ اسے شکست خط میں لکھنا شروع کر دیا۔ یہ طرز تیرھویں صدی تک برابر جاری رہا۔ میں نے برٹش میوزیم میں صدی کی لکھی ہوئی ایسی کتابیں بھی دیکھی ہیں جن کی طرز کتابت کو "کوفی شکست" کہا جا سکتا ہے۔

تیمور (۱۳۶۰ - ۱۴۰۲) و شاہ عباس اعظم کے درمیان کے دو سو برس ایرانی کتابت کا بہترین زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ کتابت میں پختگی۔ سیاہی میں چمک و پائداری۔ حروف کے تمامی اجزا میں صفائی و وضاحت یہ سب باتیں اس دور کی خصوصیات کہی جا سکتی ہیں۔ شاہ طہماسپ کے عہد میں کتابت کو بیحد ترقی نصیب ہوئی اور اس عہد کی کتابیں فن خطاطی کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن جہانتک میں غور کر سکا ہوں انہیں ایک ایسا نقص ہے جو عہد سابقہ میں موجود نہیں۔ اور طہماسپ کی کتابت میں ایک مصنوعی اور غیر فطری رنگ ہے جو آنکھوں کو تو ضرور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قلب کو اس سے ایک کشیدگی پیدا ہوتی ہے

قاچاریہ عہد میں نستعلیق سے زیادہ نسخ کی جانب توجہ کی گئی۔ آج ہندوستان میں کتابت گو کم مقبول ہے۔ لیکن زندہ ہے لیکن ایران میں تقریباً ساری کتابیں لوہے کے ٹائپ میں طبع ہوتی ہیں۔

---

[1] یہ درہ ہے اور مقام قراداغ کے قریب واقع ہے۔ اس مقام پر جو بت نصب ہے اس کی شکل "نرام سین" واقع لوری سے بہت مشابہ ہے۔ موخرالذکر کے تحت میں کوئی کتبہ نہیں لیکن دونوں کی کلیتاً مشابہت سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی وقت میں نصب کئے گئے تھے۔ اول الذکر کے تحت میں جو عبارت کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بت سنہ ۲۵ ق۔ م کے قریب بنایا گیا تھا۔ جب "نرام سین" نے "لولو بو" قوم پر فتح پائی۔ "آنو بانی نی" نے جو اس کے چند ہی برسوں بعد لولو بو کے تخت پر بیٹھا ایک اور یادگار بمقام "سرپل" قائم کی۔ جس کے اثرات ابتک موجود ہیں۔

[2] ایران کے قدیم کتبات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنفہ جی۔ جے۔ گیڈ۔

[3] کاغذ کی ایجاد سے قبل کتابت عموماً لکڑی اور پتھر پر ہوتی تھی۔ قدیم چینی چوبی کتب اور حضرت موسےٰ کی توریت کے واقعات اس امر کے شاہد ہیں۔

[4] ٹائمز مورخہ ۵ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۲

اس نمائش میں جو کتابیں پیش کی گئی تھیں انہیں گو مضامین کے مباحث سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن فن کتابت و زرنگاری کا بہترین نمونہ تھیں۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ نمائش میں دور تیموریہ سے قبل کی کتابیں تقریباً مفقود تھیں۔ ان کتابوں میں نصف حصہ قرآن مجید اور فردوسی نظامی۔ خیام خسرو۔ سعدی و رومی و حافظ کی تصنیفات پر مشتمل تھا۔ بقیہ کتابوں میں چند نادر الوجود نسخے بھی تھے۔ جو فی نفسہ کیاب سمجھے جاتے ہیں۔ غالباً ان میں سے بعض کے متعلق چند مفید معلومات کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔

جس نسخہ نے ساری نمائش میں جان ڈالدی تھی وہ سلطان احمد جلائر (۱۴۱۰ - ۱۳۸۰) کے قلمی دیوان کے چند اوراق تھے[1]۔ ان پر سلطان بایزید (۱۵۱۲ - ۱۴۸۱) کی مہر ثبت تھی۔ حاشیہ کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ یہ اوراق تیمور کے کتب خانہ میں بھی رہ چکے ہیں کارکنان نمائش کا بیان ہے کہ نمائش کے پیش کردہ اوراق جلائر کے دیوان کا محض پسماندہ حصہ ہے۔ نیز اس سے زیادہ جلائر کا کلام دنیا میں کہیں بھی دستیاب نہیں۔ میں نے چار گھنٹہ کی متواتر محنت میں سارا کلام نقل کرلیا۔ اس نادر الوجود کلام کے چند اشعار ناظرین کی دلبستگی کے لئے درج ذیل ہیں۔

غزل

می شکنی دل مرا۔ زلف چو بازمی کنی ؛ با تو نیاز می برم ایں ہمہ ناز می کنی
چند گدازمی کنی قلب شکستہ مرا ؛ قلب شکستہ مرا چند گداز می کنی
ابن سبکتگیں توئی بندہ ایاز خاص تو ؛ ہر کرسے کہ می کنی بہر ایاز می کنی
سنگ چہ باشد آنکہ او بوسہ زند بپائے تو ؛ شانہ کہ باشد آنکہ او محرم راز می کنی
مطرب بانوا بیا با دف و نائے وارغنوں ؛ زہرۂ زہرہ خوں شود عود چو ساز می کنی

احمد ابن دیں بس بس وصف دو زلف او مکن
مختصر مفید کو قصہ دراز می کنی

دوسری غزل کے چند اشعار بھی لطف سے خالی نہیں :-

روئے ماہ تو بدیدم زخورم یاد آمد ؛ لب لعل تو گزیدم شکرم یاد آمد
سرو را با قد رعنات چو کردم نسبت ؛ طعنۂ مردم کوتہ نظرم یاد آمد
در شب تار کہ آں شب اثر ماہ نبود ؛ برقع از رخ چو فگندی قمرم یاد آمد

نالۂ عاشق بیچارہ بگوشم چو رسید
در چمن نوحۂ مرغ سحرم یاد آمد

دوسری غزلوں کے مندرجہ ذیل منتخب اشعار بھی قابل لحاظ ہیں

طالب عشق حقیقت بازد اول عشق بت[1] ؛ تا مجاز او را براہ عشق رہبر می شود
آنانکہ ماہ را بجمال تو دیدہ اند[2] ؛ بر آفتاب پردہ زغیرت دریدہ اند
شبہائے شوق تا بسحر۔ بے قرار و صبر ؛ چوں مرغ سر بریدہ بخوں دطپیدہ اند
چہ دہم شرح کہ ہر لحظہ دل می کنم[3] ؛ چوں بلا میکشد از رہ گزر بالائش
اہل دل را ہمہ از عالم ظلمت برہاند ؛ برتو چہرۂ خورشید جمال آرائش
نزد لعل لب او لعل بدخشاں کم گیر[4] ؛ با وجود قد او سرو خراماں کم گیر
گر گلستاں طلبی طوف کنی فصل بہار ؛ رخ او را نگر و طرف گلستاں کم گیر

ضمیمہ (الف) کتب نادرہ

(۱) دستوریہ مصنفہ عبداللہ ابن فضل۔ منقولہ ۶۱۹ھ مطابق ۱۲۲۲ء
(۲*) صفات العاشقین۔ مصنفہ ہلالی تصنیف ۹۱۳ھ مطابق ۱۵۰۷ء
(۳) اعتقاد نامہ۔
(۴) قرآن مجید بخط فارسی کوفی مورخہ ۱۰۵۵ - ۴۴۷ھ۔
(۵*) دیوان آصفی (متوفی ۱۵۱۷ء) (کوہستانی) مورخہ ۱۵۵۱-۹۵۹
(۶*) دیوان بنائی۔ (متوفی ۱۴۶۶ء) (کمیاب)
(۷*) دیوان رشید۔ مورخہ ۱۵۶۵ - ۹۷۳ (نایاب)
(۸) قرآن کریم جسے سلطان بایزید یلدرم تلاوت کرتا تھا۔
(۹*) گو و چوگان۔ از محمود عارفی۔ مورخہ ۱۵۲۷ - ۹۳۴۔
(۱۰*) مطلع السعدین۔ مصنفہ عبدالرزاق سمرقندی (تاریخ تیموریہ) مورخہ ۱۵۸۰ - ۹۸۸۔
(۱۱) منافع الحیوان۔

[1] ٹائمز مورخہ ۱۴۰۲ - ۵ - ۸۰ - نمبر ۴۷۵۲
[2] جن لوگوں کو حافظ کے مذاق شاعری کی تاریخ سے دلبستگی ہے۔ وہ اس شعر سے لطف اٹھائیں گے۔
[3] اس دور تک ان کا اظہار بصورت اضافت جائز تھا۔

(۱۲) کلیلہ ودمنہ - مترجمہ نصراللہ (۱۲۳۶ - ۶۳۳)

(۱۳) آلات مصنفہ الجزاری - مورخہ (۱۳۵۴ - ۷۵۵)
مصری کتابت -

(۱۴) شاہنامہ - جس پر بابر سے اورنگ زیب تک تمامی سلاطین مغلیہ کی مہریں ثبت ہیں - صفحہ اول پر شاہ جہاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت و دستخط موجود ہیں - یہ دستخط نیز عبارت اس لئے اور بھی اہم ہیں کہ دیوان بابر (کتب خانہ رامپور) پر جو عبارت و دستخط موجود ہیں اس سے یہ بالکل مشابہ ہے -

(۱۵) تیمور نامہ ہاتفی -

(۱۶*) شاہ وگدا - مصنفہ ہلالی -

(۱۷) کتاب سمک عیار (ناول فارسی) یہ فارسی زبان کا سب سے پہلا ناول ہے - بہت ممکن ہے کہ اس فارسی ناول کا خاکہ مصنف داستان امیر حمزہ کے پیش نظر رہا ہو -

(تیرھویں صدی عیسوی)

(۱۸) منافع الاحجار از عطارد بن محمد الحاسب - مشہور ہندسی عالم علم الحساب - (۱۰۲۶ - ۴۱۷)

(۱۹) علم الاسترلاب - از ابوالحسن نیشاپوری - مورخہ ۱۱۲۸ - ۵۲۲

(۲۰) آثار الباقیہ - مصنفہ البیرونی - اس کتاب پر تفصیلی تنقید کیلئے ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ اڈنبرا یونیورسٹی نمبر ۱۶۱

(۲۱) البلہان (نجوم عربی) (نایاب)

(۲۲) خواص الاشجار (عربی)

(۲۳) مفید الخاص - مصنفہ محمد بن ذکریا راضی (عربی) مملوکہ خاص سلطان ابوالفدا اسماعیل ابن ابوالمعالی - محمد بن الملک المنصور قلاون (۱۳۴۲ - ۷۴۳)

(۲۴) کلیات خواجہ کرمانی - مورخہ ۱۴۳۸ - ۸۴۱ - (کمیاب)

(۲۵*) دیوان شیخ عتیقی - (نایاب)

(۲۶*) دیوان امیر شاہی (وفات ۱۴۵۳ - ۸۵۷) صفحہ اول پر شاہ عباس و جہانگیر و شاہ جہاں کے دستخط ثبت ہیں -

(۲۷) سد اسکندری - مصنفہ میر علی شیر نوائی (ترکی) ۱۴۸۵ - ۸۹۰ (نایاب)

(۲۸*) مجموعہ - اس نایاب مجموعہ میں میر علی ہراتی - محمد قاسم - سلطان محمد - (۳) سلطان محمد نور کی تحریروں کے نمونے درج ہیں - مورخہ ۱۵۲۴ - ۹۳۰ - حاشیوں پر اکبر - جہانگیر و شاہجہاں کے تصدیقی دستخط ثبت ہیں -

(۲۹) نظم الجواہر مصنفہ میر علی شیر نوائی - (ترکی) مورخہ ۱۴۸۵ - ۸۹۰ (نایاب)

(۳۰) خمسہ نظامی مورخہ ۱۵۴۷ - ۹۵۴ - اسکی نو تصویروں پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں - صفحہ اول پر جو عبارت درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کو شاہ ایران نے شاہ جہاں کو ہدیتاً بھیجا تھا - اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک خط بھی شامل ہے - جسے سلطان حسین مرزا ہراتی نے شاہ اسماعیل صفوی (۱۵۰۲ - ۲۴) کو بھیجا تھا - یہ خط تاریخی حیثیت سے نہایت اہم ہے - اس لئے کہ اس سے سلطان حسین و اسماعیل کے ان تعلقات کا پتہ چلتا ہے جو تاریخ میں دستیاب نہیں -

(۳۱*) مہر و مشتری - از عصار (۱۳۷۷ - ۷۷۸) (کمیاب)

(۳۲) مخزن الاسرار از مولانا حیدر قلیبہ (ترکی) مورخہ ۱۵۰۲ - ۹۰۸ (نایاب)

(۳۳*) مجالس العشاق - مصنفہ سلطان حسین ہراتی مورخہ ۱۵۰۳ - ۹۰۸ یہ نسخہ برٹش میوزیم کے نسخہ سے بہر نوع بہتر و قابل اعتبار ہے

(۳۴) ظفر نامہ - از شرف الدین علی یزدی - مورخہ ۱۴۶۷ صفحہ اول پر اکبر اعظم کی تحریر درج ہے جس کے تحت میں جہانگیر کا تصدیقی دستخط ثبت ہے -

(۳۵) حمزہ نامہ -

(۳۶) مناقب العارفین - مصنفہ احمد الفلکی (سوانح فقرائے سلسلہ رومیہ) (نایاب)

(۳۷*) داستان جمال و جلال (مثنوی) از محمد آصفی مورخہ ۱۵۰۲ - ۹۰۸ یہ نسخہ انڈیا آفس لائبریری کے نسخہ سے زیادہ صحیح و قابل اعتبار ہے

(۳۸*) دیوان میر علی شیر نوائی - مورخہ ۱۴۷۱ - ۸۷۶ - یہ نسخہ برٹش میوزیم

نسخہ سے بدرجہا بہتر ہے۔

(۳۹) تحفۃ الاحرار۔ از جامی مورخہ ۱۵۸۲۔ ۹۹۰ مکتبہ خوند سالک بن میرک سمرقندی شاگرد جامی۔

(۴۰) جامع الاصول (حدیث) از مجد الدین الجزاری۔ مورخہ ۱۴۳۵۔ ۸۳۹۔

(۴۱*) اقوال حضرت علی۔ عربی مع ترجمہ فارسی صفحہ اول پر شاہ عباس کا یہ دستخطی حکم۔ مورخہ ۱۵۹۷۔ ۱۰۰۶۔ درج ہے کہ اسکی متعدد نقلیں مختلف حصص سلطنت میں بھیجی جائیں[۱]

(۴۲) آثار المظفر از مولانا نظام (تاریخ اوائل اسلام) مورخہ ۱۵۶۶۔ ۹۷۴۔ یہ نسخہ نادر الوجود ہے۔

(۴۳) صور الکواکب مترجمہ نصیر الدین طوسی (یزد۔ ۱۵۴۰۔ ۹۴۷)

(۴۴) مجمع الاحادیث۔ مع ترجمہ فارسی (از جامی۔ مورخہ ۱۵۵۷۔ ۹۶۴) یہ نسخہ نادر الوجود ہے۔

(۴۵) رسالہ در علم موسیقی و شاعری مورخہ ۱۸۴۳۔ ۱۲۵۹۔ اس سے زیادہ واضح و مفصل تصنیف اس فن پر میری نظر سے نہیں گزری مجھے اندرونی شہادت کے مطالعہ کا موقع بدقسمتی سے نہیں دستیاب ہوا لیکن جس حد تک میں نے اس بے مثل تصنیف کو دیکھا اس سے میں نے یہ اخذ کیا کہ یہ رشید الدین طوطواط کی وہ گم شدہ تصنیف ہے جس کا ذکر دوسری کتابوں میں ملتا ہے۔

ضمیمہ (ب)

شبیہہ و تصویر

(۱) ایک اونٹ کی تصویر جسے مختلف درندے پھاڑ کر کھا رہے ہیں (۱۲۳۶۔ ۶۳۳) یہ آخر دور عباسیہ کا عمل ہے۔ اور اس سے ان خیالات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ جو ایران میں عربوں کے خلاف موجود تھے۔ تاریخی حیثیت سے یہ تصویر نہایت اہم ہے۔

(۲) شبیہہ گوتم بدھ جسے "شکمونی" سے موسوم کیا گیا ہے۔ (پندرھویں صدی عیسوی)

(۳) تصویر جنازہ اسفندیار۔ جنازہ کے لیجانے کا طریقہ و نیز مراسم عزا بالکل وہی ہیں جو آج بہ سلسلہ محرم رائج ہیں۔

(چودھویں صدی عیسوی)

(۴) شبیہہ رشید الدین مرطواط۔

(۵) شبیہہ حسین مرزا ہراتی۔ عمل بہزاد۔

(۶) شبیہہ شیبک خاں (محمد خاں شیبانی) اوزبک وفات ۱۵۱۰ء)

(۷) تصویر دو اونٹوں کی جو آپس میں لڑ رہے ہیں۔ از بہزاد۔ اس تصویر کی نقل ننھا مصور ہندی نے کی ہے۔ (۱۶۲۰۔ ۱۰۱۷) جس کی تصدیق شاہ جہانگیر کے دستخط سے ہوتی ہے۔

(۸) تصویر شاہزادگان مصروف بہ "شکار" عمل ایرانی جسے ہندوستانی مصور "دولت"[۲] نے اصلاح دی ہے۔

(۹) شبیہہ حضرت علی۔ فرشتوں کی معیت میں آسمان پر جا رہے ہیں۔

(۱۰) شبیہہ میر علی شیر نوائی (۱۵۰۱۔ ۱۴۴۱)

(۱۱) شبیہہ ہمایوں و اکبر خورد سال (بخطی عبد الصمد (شیریں قلم) ۱۵۵۰ء.

(۱۲) شبیہہ بادشاہ سلیم (جہانگیر) از رضا ایرانی مصور دربار اکبری۔

(۱۳) شبیہہ مرزا کامران۔ (کامران شاہ ہندی)

(۱۴) شبیہہ سلطان محمد مصور دربار شاہ طہماسپ صفوی)

(۱۵) شبیہہ شاہ طہماسپ۔

(۱۶) شبیہہ میر سید علی کاتب۔

(۱۷) شبیہہ مولانا ہاتفی (متوفی ۱۵۲۱) از بہزاد۔

---

[۱] جن ناموں پر نشان (*) درج ہے اس کے دلچسپ اقتباسات کسی آئندہ صحبت میں انشاء اللہ پیش ہوں گے۔

[۲] دولت عہد جہانگیری کا مشہور مصور تھا۔

ضمیمہ (ج)

خوشنویس

(۱) محمد بن اظہر - سنہ ۱۴۸۵ء سنہ ۸۹۰ھ

(۲) میر حسین الکاتب الخاقانی الحسینی - سنہ ۱۵۴۳ء سنہ ۹۵۰ھ

(۳) محمود المنجم الخاقانی البخاری - سنہ ۱۵۴۶ء سنہ ۹۵۳ھ

(۴) خواجہ جلال بخاری - سنہ ۱۵۴۶ء سنہ ۹۵۴ھ

(۵) شاہ حسین شہابی ہروی - سنہ ۱۵۸۴ء سنہ ۹۹۲ھ

(۶) میر علی السلطانی - سنہ ۱۵۳۴ء سنہ ۹۴۱ھ

(۷) علی الکاتب - سنہ ۱۵۲۵ء

(۸) داود طرح اللہ - سنہ ۱۴۶۳ء سنہ ۸۶۸ھ

(۹) شیخ محمود الشیرازی - سنہ ۱۴۶۰ء - سنہ ۸۶۵ھ

(۱۰) علاء الدین رضائی - سنہ ۱۵۶۵ء - سنہ ۹۷۳ھ

(۱۱) سلطان علی ہراتی - سنہ ۱۴۸۰ء - سنہ ۸۸۵ھ

(۱۲) سلطان علی مشہدی - سنہ ۱۴۵۵ء - سنہ ۶۳۳ھ

ابن محمد المشہدی -

(۱۳) عبداللہ ہراتی - سنہ ۱۴۳۰ء - سنہ ۸۶۳ھ

(۱۴) میر حسین الساحر التبریزی -

(۱۵) ناصر کتابدار سنہ ۱۶۴۹ء سنہ ۱۰۵۹ھ

(۱۶) محمود الکاتب الحسینی الشیرازی - سنہ ۱۴۲۰ء سنہ ۸۲۳ھ

(۱۷) جعفر بایسنغری (تبریزی) سنہ ۱۴۲۶ء سنہ ۸۳۰ھ

(۱۸) علی فاخر الاشتر خانی سنہ ۱۴۳۵ء سنہ ۸۳۹ھ

(۱۹) میر شیخ محمد بن شیخ احمد سنہ ۱۴۷۸ء سنہ ۸۳۳ھ

(۲۰) شاہ قاسم الحسینی - سنہ ۱۴۹۷ء سنہ ۹۰۲ھ

(۲۱) محمد امین سنہ ۱۶۱۷ء سنہ ۱۰۲۶ھ

(۲۲) شاہ محمود نیشاپوری سنہ ۱۵۳۹ء سنہ ۹۴۶ھ

(۲۳) احمد بیہقی سنہ ۱۱۲۸ء سنہ ۵۰۲۲ھ

(۲۴) ابن القطبی سنہ ۱۳۰۷ء سنہ ۷۰۷ھ

(۲۵) حسن بن علی بن حسین البہمنی - سنہ ۱۳۳۰ء سنہ ۷۳۱ھ

(۲۶) عبدالصمد بن محمد البغدادی سنہ ۱۳۲۰ء سنہ ۷۲۰ھ

(۲۷) لطف اللہ بن یحییٰ بن محمد سنہ ۱۳۹۳ء سنہ ۷۹۶ھ

(۲۸) عبدالمومن العلاوی الکاشی سنہ ۱۳۱۳ء سنہ ۷۱۳ھ

(۲۹) جعفر بایسنغری سنہ ۱۴۳۳ء سنہ ۸۳۷ھ

(۳۰) محمد بن محمد الحنفی الثناقی سنہ ۱۴۴۳ء سنہ ۸۴۷ھ

(۳۱) علی بن یحییٰ الحسینی - سنہ ۱۴۵۲ء سنہ ۸۵۶ھ

(۳۲) بایزید بن ابراہیم التبریزی سنہ ۱۴۳۸ء سنہ ۸۴۲ھ

(۳۳) نصر بن حسن السمکی - سنہ ۱۴۵۲ء سنہ ۸۵۶ھ

(۳۴) محمد بن عماد النیشاپوری سنہ ۱۴۶۲ء سنہ ۸۶۶ھ

(۳۵) میر حسین عرف کلنگی ہراتی سنہ ۱۴۹۲ء سنہ ۸۹۸ھ

(۳۶) میر عماد الحسینی - آخر پندرھویں صدی عیسوی -

(۳۷) مرشد شیرازی - عرف عطار سنہ ۱۴۸۱ء سنہ ۸۸۶ھ

(۳۸) علی الحسینی سنہ ۱۵۰۴ء سنہ ۹۱۰ھ

(۳۹) سلطان محمد نور آخر چودھویں صدی عیسوی

(۴۰) عنایت اللہ شیرازی سنہ ۱۵۵۶ء سنہ ۹۶۴ھ

(۴۱) عبدالہاتف سنہ ۱۵۴۱ء سنہ ۹۴۸ھ

(۴۲) میر علی سنہ ۱۵۳۰ء سنہ ۹۳۷ھ

(۴۳) مرشد الدین محمدی سنہ ۱۵۶۰ء سنہ ۹۱۲ھ

(۴۴) ابراہیم خلیل بخاری سنہ ۱۵۲۳ء سنہ ۹۲۹ھ

(۴۵) احمد المنشی مصری سنہ ۱۳۳۸ء سنہ ۷۳۸ھ

(۴۶) محمد بن حاجی الحافظ سنہ ۱۴۳۵ء سنہ ۸۳۹ھ

(۴۷) باباشاہ اصفہانی سنہ ۱۵۶۹ء سنہ ۹۷۷ھ

(۴۸) حاجی محمد بن ملک احمد تبریزی سنہ ۱۵۳۱ء سنہ ۹۳۸ھ

(۴۹) عبدالرشید سنہ ۱۶۲۲ء سنہ ۱۰۳۲ھ

(۵۰) محمد قوام شیرازی (سولہ صدی عیسوی)

(۵۱) حسن بن محمد احسان شیرازی سنہ ۱۵۶۰ء سنہ ۹۶۷ھ

(۵۲) فرید الکاتب سنہ ۱۵۵۱ء سنہ ۹۵۹ھ

(۵۳) بابا مبرک تاشقندی سنہ ۱۵۵۸ء سنہ ۹۶۶ھ

(۵۴) عیشی سنہ ۱۵۳۷ء سنہ ۹۴۴ھ

ضمیمہ (د)

مصور و نقاش

(۱) معین مصور ۷۸-۱۶۵۵-۱۰۸۹-۱۰۶۶

(۲) شیخ محمد ۱۵۵۶ - ۹۶۴

(۳) محمود مصاحب بخاری سولھویں صدی

(۴) قاسم علی ہراتی ۱۴۸۵ - ۸۹۰ -

(۵) حیدر علی ابن بہزاد

(۶) منظفر علی برادر زادہ بہزاد

(۷) مقصود شاگرد بہزاد

(۸) شیخ زادہ ۱۵۱۰ - ۹۱۷ -

(۹) عبداللہ سولھویں صدی

(۱۰) سید علی بن سید محمد ۱۵۴۰ء

(۱۱) محمد ہروی مصور دربار شاہ طہماسپ ۱۵۲۲- ۹۲۸

(۱۲) رضا عباسی ۱۶۴۲ - ۱۵۷۸ء

(۱۳) ابو الحسن غفاری کاشانی ۱۸۶۰

(۱۴) محمد مومن ۱۵۵۰

(۱۵) میرک ۱۵۰۰

(۱۶) خسرو اورنگ ۱۶۰۰ء

(۱۷) محمد سلیم تبریزی ۱۶۳۹ - ۱۰۴۹

(۱۸) مراد بن علی ۱۶۰۲ - ۱۰۱۱

(۱۹) شاہزادے بہرام خوقندی - سترھویں صدی

(۲۰) محمد یوسف ۱۶۲۵

(۲۱) بہرام عباسی "

(۲۲) مرزا انور اللہ "

( ) محمد علی سترھویں صدی

شاہ قلی "

ولی جان "

محمد زمان "

ضمیمہ (ر)

متفرقات

(۱) کیانی سپاہی کا بت (چوتھی صدی قبل مسیح) یہ بت جزیرہ تھسلی میں پایا گیا جس سے کیانی اثرات کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کا لباس کوہ قاف کے باشلیقوں کی پوشاک سے ملتا ہے (نمبر ۱ - ب)

(۲) پارتھین دیوی "اناہیت" کا بت۔ دنیا کی تاریخ بت سازی کی یہ ایک اہم کڑی ہے۔ (نمبر ۱۰۶، ڈبلو)

(۳) کاسہ جس پر انکسرسیز (پانچویں صدی قبل مسیح) کا نام فارسی، بابلی، مصری و آلامی زبانوں میں درج ہے۔ یہ پیالہ کیانی سلطنت کی وسعت کا بین ثبوت ہے۔ (نمبر ۱۲)

(۴) دروازہ جس پر عبارت بخط کوفی درج ہے۔ مورخہ ۳۶۲ھ مطابق ۹۷۶ء۔ (نمبر ۸۰)

(۵) شطرنج کے مہرے جنہیں ہارون الرشید نے شہنشاہ شارلمین کے پاس بطور ہدیہ بھیجے تھے۔ (نمبر ۹۱) ف۔

(۶) طشتری (مورخہ ۱۲۱۰ - ۶۰۷) اس پر خسرو و شیریں کے غسل کا جو منظر ہے وہ نظامی کے بیان کردہ واقعات سے مختلف ہے۔ اس سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ نظامی نے مروجہ قصہ میں بہت سی ترمیمات کی تھیں۔ نمبر (۱۵۹) کیو

(۷) عباسی علم (تیرھویں صدی عیسوی) اس پر پہلوی عبارت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ نمبر (۱۷۴) جی

(۸) سلطان حسین مرزا ہراتی کا خاص جام شراب - نمبر (۱۹۳) زڈ

(۹) شاہنشاہ الجیاتو خدابندہ (۱۶-۱۳۰۳) کا خاص گیند۔ نمبر (۲۲۹) کیے

(۱۰) قالین ریشمی جسے شاہ عباس اول نے درگاہ مشہد میں پیش کیا تھا۔ یہ قالین ہندوستان کا تیار کردہ تھا۔ نمبر (۲۵۲)

(۱۱) تصویر کرہ ارض پیتل کے گیند پر۔ اس پر حسب ذیل عبارت درج تھی جو قابل لحاظ ہے۔ "عمل کمترین غلامان ضیاء الدین محمد بن ملا عیسی بن شیخ التعداد منجم شاہی لاہور ۱۰۷۴ھ (۱۶۶۳ء)"

(۱۲) اسطرلاب مملوکہ سلطان بایزید ثانی شہنشاہ ترکی (۱۵۱۲-۱۴۸۱)

(۱۳) ریشمی پٹکا مرسلہ آصف جاہ نظام حیدر آباد (۱۷۲۶-۱۱۵۹) بجدت

باغبان
ٹیگور کے ادبی پھول

(از جناب مولٰینا عبدالمجید صاحب سالک - بی اے - مدیر انقلاب لاہور)

"اے نوجوان! ہمارے پاس آ - ہمیں سچ سچ بتا - تیری آنکھوں
میں اتنی دیوانگی کیوں ہے؟"

"میں نہیں جانتا - میں نے جنگلی پوست کی کیسی تیز شراب پی ہے
کہ میری آنکھوں میں اتنی دیوانگی اور مستی ہے"

"او! شرم!"

"دیکھو بعض عقلمند ہیں - اور بعض بے وقوف - بعض ہشیار اور
چوکنے ہیں - اور بعض بے پروا - بعض آنکھیں مسکراتی ہیں - اور بعض آنکھیں
روتی ہیں ---- میری آنکھوں میں مستی ہے"

"اے نوجوان! تو درخت کی چھاؤں میں کیوں اس قدر ساکن و
خاموش کھڑا ہے؟"

"میرے پاؤں میرے دل کے بوجھ سے سست ہو رہے ہیں -
اور میں چھاؤں میں ساکن کھڑا ہوں"

"او! شرم!"

"دیکھو بعض اپنے راستے پر چلے جاتے ہیں - اور بعض ٹھیرے رہتے
ہیں - بعض آزاد ہیں - اور بعض پابزنجیر ---- اور میرے پاؤں میرے
دل کے بوجھ سے سست ہو رہے ہیں"

(۲)

"جو کچھ تو مجھے اپنی مرضی سے عطا کر دیتی ہے لے لیتا ہوں - میں
زیادہ کچھ نہیں مانگتا"

"ہاں - ہاں - میں تجھے جانتی ہوں - شرمیلے بھکاری! تو تو جو کچھ
کسی کے پاس ہو - سب کچھ مانگ لیتا ہے"

"اگر مجھے ایک یونہی پڑا ہوا پھول بھی اٹھا کے دیدیا جائے میں
اسے اپنے دل میں رکھ لوں گا"

"لیکن اگر کانٹے ہوں؟"

"میں انہیں جھیل لوں گا"

"ہاں - ہاں - میں تجھے جانتی ہوں - شرمیلے بھکاری - تو تو
جو کچھ کسی کے پاس ہو سب کچھ مانگ لیتا ہے"

"اگر صرف ایکبار تو محبت کی نگاہیں اٹھا کر میرے چہرے کو
تک لے - تو میری زندگی موت کے بعد تک خوشگوار ہو جائے"

"لیکن اگر صرف غصے کی بے رحم نگاہیں ہوں؟"

"میں انہیں اپنے دل میں چبھونے اور خلش کرنے کے لئے رکھوں گا"

ہاں - ہاں - میں تجھے جانتی ہوں - شرمیلے بھکاری! تو تو
جو کچھ کسی کے پاس ہو - سب کچھ مانگ لیتا ہے"

(۳)

"محبت پر بھروسہ رکھو - اگرچہ وہ رنج و اندوہ ہی لائے
اپنے دل کو بند نہ کرو"

"آہ - نہیں - میرے دوست! تمہارے لفظ تاریک ہیں -
میں انہیں سمجھ نہیں سکتا"

"میرے پیارے - دل صرف اس لئے ہے - کہ ایک آنسو
اور ایک گیت کے ساتھ دیدیا جائے"

"آہ - نہیں - میرے دوست! تمہارے لفظ تاریک ہیں -
میں انہیں سمجھ نہیں سکتا"

"خوشی ایک قطرۂ شبنم کی طرح کمزور ہے - یہ ہنستی ہوئی مرجاتی ہے - لیکن غم مضبوط اور پائدار ہے - غمناک محبت کو اپنی آنکھوں میں بیدار رہونے دو"

"آہ - نہیں - میرے دوست - تمہارے لفظ تاریک ہیں میں انہیں سمجھ نہیں سکتا"

(ٹیگور)

"کنول سورج کے سامنے کھلتا ہے - اور اپنا سب کچھ کھو دیتا ہے - وہ نہیں چاہتا - کہ موسم سرما کی جاودانی دھند میں کلی بن کے رہ جائے"

"آہ - نہیں میرے دوست - تمہارے لفظ تاریک ہیں میں انہیں سمجھ نہیں سکتا"

(سالک)

غزل

(از جناب محمد اصطفا خاں مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی لکھنؤ)

دوئی ہے کیا یہ عدیم المثال کیا جانے
زوال کیا ہے یہ وہ لازوال کیا جانے

تڑپ تڑپ کے گذرتے ہیں راتدن کیونکر
جو مطمئن ہو مرے دل کا حال کیا جانے

ہزار کرتے ہیں تیمار دار دلسوزی
مریضِ غم کی کوئی دیکھ بھال کیا جانے

جو اپنے حسن میں اوجِ کمال پر پہونچے
وہ ہم سے خاک نشینوں کا حال کیا جانے

ہے شادکام تو اک کامیاب وصل ضرور
مگر وہ لذتِ شوقِ وصال کیا جانے

اسے کسی کے کرم پر بڑا بھروسہ ہے
گناہگار گنہ کا مآل کیا جانے

جو التفات کہ ہے باغباں کا پھولوں سے
بھلا وہ سبزہ کہ ہے پائمال کیا جانے

وہ محو اپنی تجلی کی برق پاشی میں
کسے ہے ہوش یہ سحرِ جمال کیا جانے

جو حکم دو بسر و چشم ہر طرح منظور
تمہارا بندہ کوئی قیل و قال کیا جانے

جسے نہ اپنی خبر بھی رہے تصور میں
خیالِ غیر وہ محوِ خیال کیا جانے

خدا کسی کو کبھی صاحبِ غرض نہ کرے
سخی ہے کون؟ یہ دستِ سوال کیا جانے

جھکی ہوئی بہ ہزاراں نیاز پیشانی
نتیجۂ عرقِ انفعال کیا جانے

جو اصطفا سا کسی کا ہو باوفا عاشق
وہ بے وفائی کا اپنے مآل کیا جانے

نواب نصیر حسین صاحب خیال کی ایک غیر مطبوعہ تحریر:—

خالاؤں کا مارا آغا

[سید محمد باقر صاحب بی۔ اے۔ آنرز۔ جو ایم اے میں دو برس تک لکھنؤ یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر رہے۔ جہانتک ہمارا حافظہ کام کرتا ہے۔ آپ لکھنؤ یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ اور آپ کا ارادہ تھا کہ آپ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان کا سفر کریں۔

آپ کے پاس نواب نصیر حسین صاحب خیال کے مضامین پر مرحوم خیال صاحب کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے نوٹ ہیں۔ یہ نوٹ اس انداز میں لکھے گئے ہیں گویا کوئی دوسرا شخص لکھ رہا ہے۔ لیکن ان میں جو معلومات اور حقائق ہیں وہ بے حد قیمتی اور قابلِ قدر ہیں۔

سید محمد باقر صاحب نے ایک نوٹ ہمیں دیکھنے کے لئے بھیجا تھا۔ جو درج ذیل ہے۔ اگر کوئی صاحب سید محمد باقر صاحب سے معاملہ کرسکیں یا انہیں آمادہ کرسکیں تو اردو ادب میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہو سکتا ہے] ادارہ

۱۹۱۲ء میں حسبِ معمول ایک اتوار کو جناب خیال کے یہاں (کلکتہ) اُردو ادب و انشا کے شائقین کی صحبت گرم اور اس زبان کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ کہ ان میں سے ایک صاحب نے فرمایا کہ اُردو نظم و نثر میں وِٹ (wit) یعنی سنجیدہ ظرافت کی بہت کمی ہے اور اس زبان پر نظر کرکے کہا جاسکتا ہے کہ اس میں ایسی ایجاد اور اس طرز کا نباہ آسان نہیں۔ جناب خیال نے بھی اس کا اعتراف کیا۔ اور جب سے موصوف اس صنعت کو بھی اُردو نثر میں داخل کرنے کے خیال میں رہے۔

اس سال کی گرمیوں میں جناب خیال دارجلنگ (پہاڑ) گئے وہاں فرصت تھی اور تخلیہ۔ احبابِ وطن کی یاد آتے ہی اُردو کے متعلق اُن کا وہ قول بھی یاد آگیا۔ سوچتے رہے۔ ایکدن طبیعت لڑی اور آغا کا وہ دلچسپ قصہ شروع ہوگیا جسے اردو ادبی دنیا نے لاجواب اور اس زبان میں ایک نئی طرز کی ایجاد کو تسلیم کیا ہے!

یہ سرگزشت تمام ہوتے ہی الہ آباد کے رسالہ ادیب کو اشاعت کے لئے بھیجدی گئی کہ وہ پرچہ اُس وقت ملک میں مشہور اور فرد مانا جاتا تھا۔ ستم رسیدہ آغا کی داستانِ پاستان ۱۹۱۳ء کے ادیب کے کئی نمبروں میں شائع ہوئی۔ اس عجیب و غریب قصہ پر رسالہ کے خوش مذاق و فاضل مرتب (مولوی قاسم حسین بہاری) نے حسبِ ذیل نوٹ تحریر کیا۔

> جس طرح چاشنیٔ کلام کے لئے مثل اور ذائقہ زبان کیلئے نمک درکار ہے۔ اسی طرح تفریح دماغ کے لئے متانت آمیز ظرافت بھی چاہئے۔ اس کی مثال ذیل کی داستان میں دکھائی گئی ہے۔ جو نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ مضمون کی دلچسپی کو انداز بیان اور بڑھا دیتا ہے اور یہ **حضرت خیال کا حصہ ہے!**
>
> (ایڈیٹر رسالہ ادیب۔ جنوری ۱۹۱۳ء)

اس مضمون نے ملک میں ایک غلغلہ بلند کیا۔ بچہ بچہ کی زبان پر اس کا ذکر اور آغا کا قصہ چڑھا ہوا تھا۔ مِس فرحا کا نام گھروں میں روشن اور انکی پیاری بِسی (بلی) سے ہر ایک کو اُلفت اور میاں مَنّو (بلا) سے

یوں نفرت دکھائی دیتی تھی۔ جیسے یہ کہانی سچی اور آغا ظاہر پر گذری ہوئی۔ اور حسن و عشق کی ایک بولتی اور چلتی ہوئی تصویر ہے! اس قصہ کا ابھی ایک ہی حصہ نکلا تھا۔ کہ اڈیٹر ادیب کے پاس اس کے متعلق مبارکباد و اظہار پسندیدگی کے خطوط آنا شروع ہوئے۔ فاضل مرتب اس کا تیسرا نمبر (حصہ) شائع کرتے وقت بصد مسرت یہ نوٹ درج رسالہ کیا:-

اس مضمون کی جیسی حیرت انگیز عالمگیر پسندیدگی ہوئی ہے اُس سے نقادانِ فن کی نکتہ سنجی اور زندہ دلانِ اردو کی شگفتگی طبع و مذاقِ سلیم کا کافی ثبوت ملتا ہے - اور ہمیں بخوبی اس کا اندازہ ہو گیا کہ اردو کی دنیا کیرکٹر (عادات و خصائل) نگاری کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہے اس بنا پر ہمارا یہ کہنا فضول نہ ہوگا کہ اس طرزِ انشا پردازی میں بھی ہماری زبان یورپ کی زبانوں سے پیچھے رہنا نہیں چاہتی . . . .

بہرحال پسندیدگی کے جتنے حوصلہ افزا پیغامات قدردانانِ ادیب نے بھیجے تھے - نہایت شکریہ کے ساتھ نواب خیال کے پاس بھیج دیئے گئے - اور واقعی ممدوح ہر طرح مستحق داد ہیں! (اڈیٹر رسالہ ادیب مارچ ۱۹۱۳ء)

یہ مضمون اپنے ادب و طرز میں یگانہ اور واقعی نرالا تھا۔ اور اس لئے اس کی جتنی واہ واہ نہوئی ہو اور نہ ہو وہ کم ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عام طور پر اس کا اصل منشا و مطلب نہیں سمجھا گیا۔ یہ داستان وہ بوستانِ خیال نہیں ہے جس کے چمن میں بظاہر خوشنما پھول تو نظر آئیں لیکن انہیں بُو باس نہ ہو۔ بلکہ یہ وہ گلستاں ہے جس کے گل ہمیشہ خوشبودار اور سدابہار رہیں گے۔

جنابِ خیال کی تحریروں سے واقفکار جانتے ہیں کہ ان کا کوئی حرف بیکار و فضول نہیں ہوتا۔ اس لمبی داستان کا بھی یہی حال ہے، اس بیان میں ممدوح نے حقیقتاً۔ ہماری موجودہ شعر و شاعری اور اس کے پرستار شعرا کی وہ ہجوِ ملیح (Satire) کی ہے جس کا جواب ممکن نہیں!

زمینِ ایران - زمین شعر کہی گئی ہے۔ اِس مناسبت سے آغا ظاہر وہیں کی خاک سے اُٹھایا گیا - اور پھر یورپ اس لئے پہونچایا گیا کہ وہاں کی زمین اب بیکار گل نہیں کھلاتی۔ شاید آغا پر اس نئی اور سائنٹیفک دنیا کا اثر پڑے - اور وہ بھی باکار ہو جائے۔ لیکن اپنے گھر میں اُس کی خُو بگڑ چکی تھی۔ بنتی کیونکر؟ نظام الملک (آغا کا چچا) اسپر برہم ہو کر نصیحت کرتا ہے:- کہ

"بابا عجب ہیچ کارہ شدۂ - نہ پیشِ من مے آئی۔ نہ گاہے حساب و کتاب ہوتل رامی بینی۔ تو کہ شاید دیوانہ شدۂ شنیدم یک مثنوی لیلیٰ و مجنوں ترتیب دادۂ - و برآں فخر ہم می کنی۔ حیف - لاحول ولا! (ایں زمان انجور (طور) نظم بازی و بیہودہ سری! تو کہ تاحال نہ زبان فرانسہ کہ کلید ہر گونہ دانش است - یاد گرفتی و نہ از دیگر ہنرہائے دنیا چیزے بہرہ حاصل کردی! فرزندِ من۔ افسوس دنیائے تو ہم مثلِ مُلا ہائے ایران ہنوز بر پشتِ گاؤ - و ماہی ست - ظاہر بہ انداز ایں قصۂ پارینہ را ؎ ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولے!"

مگر ہمارے شاعر آغا صاحب کھڑے سن رہے ہیں اور اس کا کوئی معقول جواب نہیں دیتے! پھر نظام الملک کے بعد اپنے کرتوت کی بدولت جب ان کی حالت نازک ہو جاتی ہے اور سولمن (ان کے چچا کا دوست) ان پر رحم و کرم کرنا چاہتا ہے تو ان سے سوال کرتا ہے کہ از ہنرہائے دنیا چہ یاد گرفتہ؟ تو آپ کڑک کر فرماتے ہیں - کہ

من - من شاعر ہستم - شاعرِ پُرہنر و پُرگو و نکتہ سنج فصیح اللسان و شیریں و نازک بیان - رشکِ فردوسی - و قاآنی - منم کہ ہیولا را مجسم کردم - روح بخشیدم - برہنہ بود - لباسِ نورانی عطا فرمودم ؎

عیسیٰ منم کہ روح بہ بخشم بہ مردہ شعر - ما را لقب نہند مسیحائے شاعری! شاگرد رحمٰن ہستم - لاکن کار استاد می کنم - غیر از شاعری ہنرہا کہ ہیچ!

حیاتین

(از جناب رئیس الاطبا حکیم محمد حسن صاحب قرشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور)

۱۹۰۶ء میں بعض محققین نے متواتر تجربات کے ذریعے ثابت کر دیا تھا۔ کہ اگر حیوانوں کو مصنوعی طور پر تیار کی ہوئی ایسی غذا دیجائے جس میں صرف غذا کے کیمیاوی اجزا یعنی نائٹرو جینی اجزا۔ مواد نشائیہ معدنی نمکیات۔ چربیلے اجزاء اور پانی ہی شامل ہوں۔ تو ان کی صحت کا قائم رہنا محال ہے۔ لیکن اگر ان میں قدرے تازہ اور طبعی غذا مثلاً دودھ کی آمیزش بھی کر دی جائے تو صحت اعتدال پر رہتی ہے اور اس میں کسی طرح کا نقص پیدا نہیں ہوتا اس سے محقق ہاپکن نے نتیجہ نکالا۔ کہ غذا میں علاوہ معلومہ کیمیاوی اجزا کے بعض ایسے نامعلوم اجزا بھی موجود ہوتے ہیں۔ جو زندگی اور صحت کے لئے لازمی ہیں ان کو اس نے غذا کے اجزاء خاص یا زائدہ کے نام سے نامزد کر دیا لیکن اس کے بعد پروفیسر فنک نے اپنی تحقیقات میں غذا کے ان اجزائے خاص کے لئے جو مرض بیری بیری کو روکتے ہیں۔ حیاتین (وٹامین) کی اصطلاح استعمال کی۔ جو اب عام طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

حیاتین وہ خاص اجزاء ہیں۔ جو انسانوں اور حیوانوں کی تمام طبعی اغذیہ میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن تاحال ان کی کیمیاوی ترکیب معلوم نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی ان کو طبعی غذا سے الگ کرکے دکھایا جا سکا ہے۔ ان کی موجودگی کا ثبوت کیا گیا ہے۔ کہ حیوانات صرف ایسی غذا دینے سے مر جاتے۔ یا کسی خاص مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جس میں صرف خاص کیمیاوی اجزائے غذائیہ پائے جاتے ہیں۔ حیاتین کے متعلق تفتیش جاری ہے۔ مگر ابھی تک یہ ثابت نہیں ہو سکا۔ کہ آیا یہ حیوانی اجسام کی ترکیب میں بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ البتہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حیوانات ان کو اپنی نباتی غذاوں سے حاصل کرکے جسم میں جمع رکھتے ہیں۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ یہ حیوانی اجسام کی ترکیب میں بھی شامل ہوں گے۔

یوں تو آج تک کے تجربات سے چھ سات قسم کی حیاتین معلوم ہو چکی ہیں۔ لیکن ان میں سے مندرجہ ذیل پانچ قسم کی حیاتین زیادہ اہم ہیں۔

حیاتین۔ (الف) حیاتین (ب) حیاتین۔ (ج) حیاتین (د) اور حیاتین (ذ) ان میں سے بھی اول الذکر تین ایسی ہیں۔ جو زندگی کے تحفظ اور صحت کے بقا میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

(یادداشت) چونکہ حیاتین کی کیمیاوی ترکیب ابھی تک معلوم نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی مختلف قسم کی حیاتین کا باہمی کیمیاوی فرق معلوم ہے صرف مختلف تجربات کے لحاظ سے ہی ان کے وجود کو اور ان کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی قسموں کے نام الف۔ ب ج۔ د۔ ذ۔ وغیرہ۔ حروف تہجی پر رکھدیئے گئے ہیں۔

حیاتین (الف) یہ حیوانوں کے نشوونما کے لئے ضروری ہے اور یہ خیال کیا گیا ہے کہ بچوں کی خوراک میں اس کی غیر موجودگی ان کے نشوونما کو روک دیتی اور ان میں مرض کساح کو پیدا کر دیتی ہے۔ جوانوں کے لئے یہ بہت زیادہ ضروری نہیں ہے۔ وہ بغیر اپنی صحت پر کسی خراب اثر کو محسوس کرنے کے کچھ عرصہ اس کے بغیر گذار سکتے ہیں۔ یہ حیاتین پانی میں حل نہیں ہوتی لیکن چربیوں میں حل ہو جاتی ہے۔ اور حرارت کے ذریعے آسانی تباہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کچھ دیر کے لئے ۲۱۲ درجے کی فارن ہیٹ

حرارت پر گرم کی جاسکتی ہے - البتہ چار گھنٹے تک اس درجے کی
حرارت پر رکھے رہنے سے بتدریج ضائع ہونا شروع ہو جاتی ہے
یہ طبعی طور پر نباتات کے سبز پتوں اور بعض قسم کے بیجوں میں پائی
جاتی ہے - لیکن نباتی تیلوں میں نہیں پائی جاتی - چنانچہ یہ بالعموم دودھ
مکھن - بالائی - انڈے کی زردی - پنیر - سبز نبات بعض قسم کے
غلوں - چربی دار گوشت مچھلی اور دوا کے طور پر تیار کئے ہوئے
مچھلی کے تیل (کاڈلیور آئل) میں پائی جاتی ہے - یہ گندم کی روٹی
اور نباتی تیلوں مثلاً روغنِ زیتون وغیرہ میں نہیں پائی جاتی - البتہ
ڈبوں کے خشک دودھ میں ہوتی ہے - جو ولایت سے بند ہو کر
آتے ہیں -

حیاتین (ب) یہ زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے - غذا میں اس کی غیر موجودگی سے بچوں کی
پرورش میں فوری کمی رونما ہوتی ہے - اور ہر عمر کے انسانوں یا حیوانوں کے
اعصاب میں ایک قسم کا التہاب پیدا ہو جاتا ہے - اس کے علاوہ
ایک خاص قسم کا مرض پیدا ہو جاتا ہے - جس کو مرض بیری بیری
کہتے ہیں - چنانچہ حیاتین کی تمام تر تحقیقات مرض بیری بیری کی تحقیقات
ہی کی رہینِ منت ہے - کیونکہ بیری بیری کی تحقیقات کے سلسلے میں
ہی حیاتین کی موجودگی کا علم ہوا ہے - اور سب سے پہلے حیاتین
(ب) معلوم کی گئی تھی - یہ حیاتین پانی میں حل ہو جاتی ہے اور تیز
حرارت پہنچنے پر زائل ہو جاتی ہے - یہ تازہ اور خشک انڈوں
سبز ترکاریوں - آلوؤں - گوشت - اور دودھ میں بھی پائی جاتی
ہے - مچھلی تمام قسم کی چربیوں - میدے ٹینوں کی خوراکی اشیاء
جو ولایت سے بند ہو کر آتی ہیں - ان میں اور ولایتی یخنیوں میں
یہ حیاتین بالکل نہیں پائی جاتی - مکی - چاولوں اور گندم وغیرہ کے
چھلکے میں یہ ہوتی ہے -

حیاتین (ج) غذا میں اس کی غیر موجودگی ایک خاص قسم کا مرض اسکربوطی (سکروی لثہ دامیہ) پیدا کر دیتی ہے
یہ تازہ سبزیوں اور ترکاریوں مثلاً - کاہو - گوبھی - کرم کلا - مولی
شلغم - ٹماٹر - کسی قدر آلو - گاجر - لوبیا - چقندر - بعض پھلوں -
مثلاً لیموں - نارنگی وغیرہ اور ان کے رسوں میں پائی جاتی ہے -
بعض قسم کے گوشتوں اور غلوں میں بھی پائی جاتی ہے -

حیاتین (د) یہ بھی حیاتین الف کی مانند ہوتی ہے اور دودھ مکھن - گھی - روغن ماہی وغیرہ میں بکثرت پائی جاتی
ہے - اس کی عدم موجودگی بھی جسم کے نشو و نما پر اثر انداز ہوتی ہے -

حیاتین (ذ) غذا میں اس کی عدم موجودگی قابلیتِ تولید کو زائل کر دیتی ہے - چنانچہ جن عورتوں یا مردوں کی غذا
میں یہ بالکل شامل نہیں ہوتی - ان کے ہاں بچے پیدا نہیں ہو سکتے
یہ زیادہ ترکاہو - چنے کی دال - گندم کے چھلکوں - انڈے کی تازہ
زردی - گائے کی کلیجی - روغن زیتون اور مغز پنبہ دانہ میں پائی جاتی
ہے - دودھ میں یہ بالکل نہیں پائی جاتی -

چھٹی قسم کی حیاتین ابھی زیرِ تحقیق ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ
مرض بلا جرا اور دیگر کئی ایک خاص خاص امراض جو جنگِ عظیم کے دوران
میں خصوصاً ان اشخاص میں رونما ہوئے ہیں - جن کو دورانِ جنگ
میں محدود غذا ملتی رہی ہے - خاص حیاتین کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوئے
ہیں - اس لئے ممکن ہے مزید تحقیقات میں ابھی اور کئی قسم کی حیاتین کا
انکشاف ہو -

ذیل کے نقشہ میں مختلف قسم کی اغذیہ میں حیاتین الف
ب - ج - کی مقدار کے تناسب کو ظاہر کیا گیا ہے - چنانچہ نشان تین
جمع (+++) سے مراد یہ ہے کہ اس میں بہت عمدہ مقدار حیاتین ہے
دو جمع (++) کا مطلب ہے کہ اس میں صرف عمدہ مقدار حیاتین ہے
اور صرف ایک جمع (+) کا نشان اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس میں
اچھی خاصی مقدار حیاتین ہے - ایک خانے میں عمدہ اجزائے لحمیہ پروٹین کو
درج کیا گیا ہے - جن کے بغیر غذا کی تکمیل نہیں ہو سکتی -

حیاتین الف	حیاتین ب
کاڈ مچھلی کے جگر کا تیل +++	مختلف قسم کے غلے ++
مکھن ++	خشک باقلا - مٹر اور دالیں ++
انڈے کی زردی ++	انڈے کی زردی ++
جگر ++	جگر - دل - بانقراس دماغ اور گردے ++

حیاتین الف

شحم بقر + +
دل +
بکرے کے گوشت کی چربی +
دودھ +
ہیرنگ مچھلی +
تازہ سبزیاں + +

حیاتین ب

میوہ جات اور سبزیاں +
مغزیات + +
خمیرہ + + +

حیاتین "ج"

تازہ میوہ جات خصوصاً لیموں۔ نارنج
انگور اور ٹماٹر + + +
رس بھری۔ سیاہ بھری + +
شفتالو۔ آڑو۔ آلو بخارا + +
دیگر میوہ جات +
کچی تازہ سبزیاں + + +
پکی ہوئی سبزیاں + + +
اگر تھوڑی دیر تک پکائی جائیں تو +
آلو +
شلغم +

عمدہ اجزائے لحمیہ

گوشت۔
انڈے۔
دودھ اور پنیر
مچھلی

ذیل میں ایک اور نقشہ دیا جاتا ہے۔ جس میں عام غذاؤں میں مختلف قسم کی حیاتین کا تناسب واضح کیا گیا ہے۔ اس نقشہ میں پہلے نقشے سے بعض جگہ خفیف سا اختلاف ہے ....

مقدار حیاتین (وٹامین) جو ان میں پائی جاتی ہے

حیوانی اغذیہ	ا (A)	ب (B)	ج (C)	د (D)
کاڈ اور دیگر مچھلیوں کے جگر کے روغن	+ + +	–	–	+ + +
مچھلیوں پرندوں اور دودھ پلانیوالے جانوروں کے جگر	+ +	–	–	+ +
کچا جگر	–	+ +	+ +	–
تھوڑے عرصے تک پکا ہوا جگر	–	–	+	–
روہو مچھلی	+ +	–	–	+ +
عام مچھلی	–	+ +	–	–
انڈے کی زردی	+ +	+ +	–	+ +
مکھن	+ +	–	–	+
دودھ	+	+	+	+
پنیر	+	+ +	–	+
دودھ پلانیوالے جانوروں کے جسم کی چربی	+	–	–	–
مچھلی کے جسم کی چربی	–	–	–	+
پتلا اور نرم گوشت	–	+ + +	–	–
دل	+	+ +	–	–
دماغ	–	+ +	–	–
تازہ سبزیاں				
تازہ سبزیاں (کچی)	+ +	–	+ + +	بہت کم
تازہ سبزیاں (بغیر نمک کے تھوڑی دیر تک پکی ہوئی)	–	–	+	–
وہ سبزیاں جن کی جڑیں کھائی جاتی ہیں۔	–	+	–	–
گاجریں	+ +	–	+ +	–
شلغم	–	–	+ +	–
آلو (کچے)	–	+	–	–
آلو (اُبلے ہوئے)	–	–	+	–
میوہ جات				
ٹماٹر	+ +	قدرے	+ + +	بہت کم
سنگترے۔ لیموں۔ اور انگور	–	–	+ + +	–
روز بھری۔ بلیک بھری۔ آڑو اور اناناس	–	–	+ +	–
کیلے۔ سیب۔ بہت سے دوسرے میوہ جات۔ اور ٹینوں میں محفوظ کئے ہوئے میوہ جات	–	–	+	–
خشک خمیر (پیسٹ)	–	+ + + +	–	–

حیوانی اغذیہ	ا (A)	ب (B)	ج (C)	د (D)
جوہر خمیر (پیسٹ)	-	++++	-	-
جوہر گندم (بمکس کا تیار کیا ہوا ویٹ جرم)	-	++++	-	-
غلے				
مٹر - باقلا - دالیں اور مغزیات	-	+++	-	-
گندم - رائی - مکی - جو - چاول -	-	++	-	-
گندم کا آٹا	-	+	-	-

اس تمام بحث کا لب لباب یہ ہے - کہ غذا میں مختلف قسم کی حیاتین کا ہونا ضروری ہے اور حافظانِ صحت کو ایسی غذائیں استعمال کرتے رہنے چاہئیں - جن میں مختلف قسم کی حیاتین پائی جاتی ہیں ؞

(حکیم محمد حسن قرشی)

(ملاحظہ ہو بقیہ صفحہ ۶)

۵۵۴ ہ ایک مجلس میں کم از کم بیس بار پڑھوایا گیا تھا - محمد اصطفا خاں بے حد خلیق - مہمان نواز اور کاروباری آدمی ہیں - آپ نے اپنے کارخانہ کو اتنی ترقی دی ہے - کہ ہندوستان بھر میں یہ فرد ہے - بلکہ یورپ کے بڑے بڑے کارخانوں کے مقابلہ میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے - اس کارخانہ کے عطر لاجواب اور بے مثل ہیں - اور صنعتِ عطر سازی کی ترقی اور بقا جناب اصطفا خاں صاحب کی مساعی جمیلہ کی مرہونِ منت ہے ؞

کرنال شاپ لاہور بلکہ پنجاب میں بوٹ شوز کی سب سے بڑی دکان ہے - شیخ صاحب کے بزرگوں کی اور آپ کی مساعی حسنہ کا نتیجہ ہے کہ کرنال شاپ لاہور میں نمونہ کی واحد دکان ہے - شیخ عبد المالک ایک مرنجاں مرنج سعادتمند نوجوان ہیں جنہیں اپنے کاروبار کی ترقی کا بہت ہی خیال ہے - کرنال شاپ کی خصوصیت ہے کہ ہر ناپ کے درجنوں فیشن کے بوٹ وہ بیک وقت پیش کر سکتے ہیں - اور اُن کے دام مارکٹ میں سب سے کم لئے جاتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب و ملت کے آدمیوں کی بھیڑ کرنال شاپ میں موجود رہتی ہے - شیخ عبد المالک صاحب کو لکھنے پڑھنے کا بھی شوق ہے - آپ کا ایک مختصر مضمون کسی دوسری جگہ درج ہے ؞

شیخ عنایت اللہ صاحب منیجنگ ڈائرکٹر تاج کمپنی لمیٹیڈ پنجاب کے وہ جوان ہمت جواں سال سرگرم کارکن ہیں جنہوں نے تاج کمپنی لمٹیڈ کو کامیابی کی منزل تک پہونچایا ہے - شیخ صاحب صبح سے لے کر رات تک برابر محنت کرتے رہتے اور اپنی ان تھک کوششوں سے کمپنی کو ایک منافع کے کاروبار میں لے آئے ہیں - آپ منتظم ہونے کے ساتھ خلیق و منکسر المزاج بھی ہیں - تاج کمپنی کی مطبوعات خصوصًا حمائل شریف ملک میں اتنی مقبول ہوئی ہے کہ کمپنی مانگ کو پورا کرنے سے بھی قاصر ہے - اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ -

شیخ مبارک علی لاہور کے بہت بڑے ناشر و تاجر ہیں - جنہوں نے کتابوں کی تجارت میں بہت نام پیدا کیا ہے - علامہ سر اقبال کی بیشتر ابتدائی تصنیفات شیخ صاحب ہی کے اہتمام میں شائع ہو کر مقبول ہوئیں - شیخ صاحب معاملہ فہم - زیرک اور نبض شناس بزرگ ہیں - آپ کی کاروباری قابلیت کا دُور دُور شہرہ ہے - قیمتی اور اچھی کتابیں شائع کرنا آپ کا ذوق رہا ہے - اور آپ بڑی دلیری اور جرأت کے ساتھ ہزاروں روپے کتابوں کی نشر و اشاعت پر صرف کر دیتے ہیں - گو آپ اہلِ قلم نہیں ہیں لیکن اہلِ قلم کے مسودات کو کتابوں کی صورت میں بدل دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کام ہے ؞

ادارہ

داستان!

زنِ گذران

(اثر۔ پروفیسر سید عابد علی صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی)

(الفرڈ ایٹ جو انگریزی کی ایک نادر تصنیف ہے اور جسے اندھی جوانی سے تشبیہہ دیجا سکتی تھی۔ اس کا ترجمہ سید عابد صاحب نے نہایت عرقریزی سے کیا ہے ایک باب مطالعہ کیجئے اور اس کی دلچسپیوں کا اندازہ لگائیے۔ لباب کا نام واستان رکھا گیا ہے۔)

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا سر شانے پر ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ چاندنی رات میں وہ سنسان مہتابی پر محوِ خرام تھی۔ ایک بیقرار سایہ اس کے پاؤں کے پاس لرزاں تھا۔

دمیطریس اُسے بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ باریک کتاں میں سے اس کے جسم کا جو ذرا سا حصہ نظر آتا تھا۔ اس پر آڑے ترچھے جھول نظر آتے تھے۔ اس کی ایک کہنی تنگ قبا میں سے صاف اُبھری ہوئی نظر آتی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں وہ شال کا لمبا دامن اُٹھائے تھی کہ خاک آلود زمین سے مَس نہ ہونے پائے۔

زیوروں سے اس نے پہچانا کہ کسبی تھی۔ اور وہ سڑک چھوڑ کر ہٹ گیا۔ کہ سلام و کلام کا سلسلہ نہ شروع ہو جائے۔ وہ اس کی طرف دیکھنا بھی نہ چاہتا تھا۔ اس کا ذہن زاگرلیس کے عظیم الشان مجسمے کے خیالات سے لبریز تھا۔ اس کے باوجود اس کی آنکھیں اس زنِ گذران کا تعاقب کر رہی تھیں۔

اس نے دیکھا کہ وہ رُکی نہیں۔ اُسے گویا دمیطریس کے وجود کا علم ہی نہ تھا۔ اس نے کسی طرح اپنی کسی حرکت سے جھوٹ موٹ یہ بھی ظاہر نہ کیا کہ میں تماشائے دریا میں محو ہوں۔ یا یہ کہ میں اپنے خیالات میں مگن ہوں۔

مختصراً سادہ الفاظ میں وہ کسبی اکیلی سیر کر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا۔ تنہائی۔ خلوت اور خاموشی کی ہلکی سی گونج کے سوا وہ اور کسی چیز کی خواہشمند نہ تھی۔

دمیطریس چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ حیرت سے ششدر رہ گیا۔ یہ عورت اب دُور نکل گئی تھی۔ ایک بے پرواہ سایہ زرد کی طرح اور اس کا اپنا سایہ اس کے اپنے آگے آگے لرزاں تھا۔ ہر قدم پر وہ شاہراہ کی خاک پر اس کی چپلیوں کی ہلکی ہلکی آواز سُن رہا تھا۔ وہ منار نور کے جزیرے تک گئی اور پھر وہاں کے پتھروں پر چڑھ گئی۔

ناگاہ۔ گویا دیر سے اس نامعلوم عورت سے عشق ہے۔ دمیطریس نے اس کے پیچھے بھاگنا شروع کیا۔ پھر ٹھہر گیا۔ واپس آیا۔ کانپنے لگا۔ اپنے آپ کو بُرا بھلا کہا۔ مہتابی سے لوٹ جانا چاہا۔ لیکن اس نے آج تک اپنی قوتِ ارادی کو صرف حصولِ مسرت میں استعمال کیا تھا۔ اور آج جو ناگاہ اُسے بلندی داخلاق اور اپنی زندگی کی نظم و ترتیب کی خاطر اس چیز کو استعمال کرنے کی ضرورت آن پڑی تو ضعف عزم کے سبب وہ کچھ نہ کرسکا اور اس کے پاؤں گویا وہیں جم گئے۔

ہر آن اس زن گذران کا خیال اسے ستا رہا تھا۔ اس لئے وہ دل میں اس اضطراب شدید کے لئے عذر تلاش کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہتا تھا:۔

"میری دلبستگی۔ میری تحسین کی وجہ قطعاً و یکسر جمالیاتی ہے (کہ مجھے ہر خوبصورت چیز سے عشق ہے) یہ عورت جو گذری ہے اس مجسمے کے لئے کیا خوب نمونہ بن سکتی ہے۔ جو میں بنانا چاہتا ہوں یعنی پنکھیا والی عورت کل ہی شروع بھی کر دوں گا کام"۔

پھر ناگاہ اس کے خیالات میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اور زرد لباس والی عورت کے متعلق اس کے ذہن میں اضطراب انگیز سوالات کا ایک ہجوم پیدا ہو گیا۔ اس وقت رات کو وہ یہاں کیا کرنے آئی؟ اپنا گھر چھوڑ کر۔ وقت گئے وہ کس کے لئے آئی؟

اس نے مجھے سلام کیوں نہیں کیا۔ اس نے یقیناً مجھے دیکھا تھا جب میں سڑک چھوڑ کر ہٹا ہوں تو اس نے مجھے ضرور دیکھا ہو گا۔ بغیر کسی لفظ کے وہ خاموش کیوں چلی گئی تھی؟ یہ افواہ گرم تھی کہ بعض عورتیں صبح سے کچھ پہلے تاروں کی چھاؤں میں ٹھنڈے ٹھنڈے نہانے کے لئے آتی ہیں۔

لیکن لوگ منار نور کے پاس نہانے کے لئے نہیں آتے۔ وہاں پانی بہت گہرا ہے۔ علاوہ ازیں زیور پہن کر کون عورت نہانے جائے گی۔ غلط! پھر کیا چیز تھی۔ جس کی کشش لسے ریکانٹس سے لے آئی تھی۔ کسی سے ملاقات کا وعدہ؟ کیا وہ کسی نوجوان سے ملنے آئی تھی۔ جو تنوع کا بھوکا تھا۔ جس نے ان پتھروں کو اپنا عارضی بستر عشرت بنانا پسند کیا تھا۔ جو لہروں کی مسلسل ضربوں سے چمکدار و صاف ہو گئے تھے۔

دمیسطرلیس اپنے شکوک کو یقین کے درجے پر پہونچانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ کم عمر عورت خود ہی واپس آ رہی تھی۔ اس طرح دبے پاؤں چلتی۔ پنکھے سے مہتابی کی مٹی اڑاتی آ رہی تھی اور چاند کی ہلکی ہلکی سفیدی میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

....

وہ اور میں

(از جناب شیخ عبدالمالک صاحب)

وہ مجھ سے دور ہے۔ بہت دُور۔ میرے اور اس کے درمیان کتنے جنگل پہاڑ اور دریا حائل ہیں۔ میں اس تک نہیں پہنچ سکتا ہوں۔ سارے وسائل سفر دنیا میں موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں اس سے دور ہوں۔ کیا میرے دل میں اس کی محبت نہیں رہی۔ یا اس میں کچھ کمی ہو گئی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ اپنی شمشیر کی برش کا امتحان کرنا چاہے تو میں اپنا سر پیش کر دوں۔ آہا۔ وہ تو میرے خانۂ دل میں کھڑا مسکرا رہا ہے۔ میں نے سمجھا تھا کہ وہ مجھ سے جدا ہو گیا۔ نہیں وہ مجھ سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسا بے وفا نہیں۔ میں کس قدر احمق ہوں کہ اس کی جدائی میں آنسو بہا رہا ہوں۔ وہ شاید میری اسی حماقت پر ہی مسکرا رہا ہے۔

(عبدالمالک)

لاعلمی

(از جناب حامد اللہ صاحب افسر)

علم اور واقفیت ایک نعمت ہے۔ اس کے بغیر انسانیت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ لیکن اگر غور کر کے دیکھو تو لاعلمی اور عدم واقفیت اس سے بھی بڑی نعمت ہے اور اس کے بغیر زندگی کی تکمیل نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں اور جن چیزوں سے ہمیں واقفیت ہے اس سے کہیں زیادہ اہمیت ان چیزوں کو حاصل ہے۔ جن کا ہمیں مطلق علم نہیں۔

زندگی صدہا رازوں کا مخزن ہے۔ خود زندگی ایک راز ہے جتنا علم بڑھتا جاتا ہے۔ واقفیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اتنا ہی زندگی کا لطف کم ہوتا جاتا ہے۔ عدم واقفیت اور لاعلمی زندگی کا سہارا ہے۔ جب ہمیں کسی چیز سے واقفیت ہو جاتی ہے تو اس چیز کے اندر پھر ہمارے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اپنے بچپن کا زمانہ یاد کرو۔ تمہیں بارہا ایسا اتفاق ہوا ہوگا۔ کہ رات کے وقت گھر واپس آتے ہوئے اندھیرے میں کچھ سفید سفید متحرک چیز نظر آ رہی ہے۔ جب تک تمہیں یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ دل میں کیسے عجیب وغریب دھڑکے محسوس ہوئے ہوں گے۔ ممکن ہے کوئی بھوت ہو۔ ممکن ہے کوئی آدمی چھپا کھڑا ہو۔ لیکن جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ درخت کی ایک نیچی شاخ پر کسی نے چادر سوکھنے کے لئے لٹکا دی ہے۔ جو ہوا سے ہل رہی ہے تو تمہاری ساری دلچسپی زائل ہو گئی۔

تم ایک شعبدہ باز کا تماشہ دیکھتے ہو۔ وہ ٹوکری میں کبوتر بند کر دیتا ہے اور جب ٹوکری اٹھاتا ہے تو کبوتر غائب ہوتا ہے۔ مٹھی میں تمہارے سامنے ایک روپیہ رکھتا ہے اور جب مٹھی کھولتا ہے روپیہ نہیں ہوتا۔ تمہیں ان حرکتوں میں صرف اس لئے لطف آتا ہے کہ تم نہیں جانتے کہ وہ یہ سب کیونکر کرتا ہے۔ اگر تمہیں ان شعبدوں کی ترکیب معلوم ہو جائے۔ تو پھر کوئی دلچسپی باقی نہ رہے اور تم اس کے حیرت انگیز کارنامے دیکھنے کے لئے روپیہ صرف نہ کرو۔

زندگی کے ہر دور میں جن چیزوں سے ہم واقف نہیں ان کی اہمیت ان چیزوں سے کہیں زیادہ ہے۔ جن سے ہم واقف ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا واقعہ ہونیوالا ہے۔ کاروبار میں تجارت میں کسی بڑے سے بڑے ماہر کو بھی معلوم نہیں کہ کل بازار کا کیا رنگ ہوگا۔ کون جانتا ہے کہ موسم کی کیفیت اگلے دن کیا ہوگی۔ کسے معلوم ہے کہ آب وہوا کا کل کیا حال رہے گا۔ ہم دوست بناتے ہیں۔ لیکن نہیں جانتے کہ وہ کیسے ثابت ہوں گے۔ ہم ان سے نباہ بھی سکیں گے یا نہیں۔ ہم شادی کرتے ہیں۔ لیکن نہیں کہہ سکتے کہ وہ خانہ آبادی کا سبب ہوگی یا خانہ بربادی کا۔ زندگی کا اعتبار نہیں۔ موت کا راز کسی کو معلوم نہیں۔ موت کے بعد کون جانتا ہے کیا ہوگا پس ایک غیر محدود سلسلہ ان اشیاء کا ہمیشہ ہمیں گھیرے ہوئے ہے جن سے ہم بالکل واقف نہیں۔

نامعلوم اشیاء سے لوگ ڈرتے ہیں سکتے ہیں کہ پردۂ غیب سے خدا جانے کیا ظہور میں آئے۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ خداوند کریم نے دنیا میں "معلوم" اشیاء کی بہ نسبت "نامعلوم" اشیاء زیادہ پیدا کی ہیں۔ پس ہو نہیں سکتا کہ وہ انسان کی بہتری کے لئے نہ ہوں اگر ذرا غور کرو تو معلوم ہوگا کہ زندگی میں جس قدر بہتر اور راحت بخشنے والی چیزیں ہیں ان سب کی بنا عدم واقفیت پر ہے اور وہ سب پردۂ غیب سے ظہور میں آئی ہیں۔ صحیح معنوں میں عقلمند اور دانا وہی شخص ہے جو نامعلوم اشیاء کی اہمیت سے آگاہ ہے نہ وہ

جو اپنے علم اور واقفیت پر نازاں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنا علم ہمیں ہے۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو ہم نہیں جانتے تو اس میں عجز و انکسار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی علم اور عرفان کی طرف پہلا قدم ہے۔

عدم واقفیت کا احساس عقل و دانائی کی ابتدا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے واقفیت پر غرور دماغی ترقی کے لئے آخری حد ہے تم نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ سطحی ہوتے ہیں اور جن کا دماغی سرمایہ جہالت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہی سب سے زیادہ اپنے علم و عقل پر غرور کرتے ہیں۔ اور بانگِ دہل اس کا اعلان اور جنہیں خدا نے صحیح معنوں میں علم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور جو اس دولت سے مالا مال ہیں وہی سب سے پہلے اپنی تنگ سامانی اپنی تہی دستی اور اپنی محدود واقفیت کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نظر آئیں گے۔

شاید دنیا میں سب سے بڑا عقلمند سقراط تھا۔ اور جانتے ہو اس کا تکیہ کلام کیا تھا" میں تو کچھ بھی نہیں جانتا"

کبھی تم نے "کشش ثقل" کے مسئلہ پر عالمانہ غرور سے جدا رہ کر غور کیا ہے۔ مادہ کے ہر ذرہ میں کوئی ایسی چیز ہے جو مادہ کے ہر دوسرے ذرہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہی چیز یہی قوت اجرام فلکی کو ایک نظام میں وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اور خدا کی زمین کے ہر جزو پر اپنا تسلط اور قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ لیکن نیوٹن بھی جس نے ہمیں بتایا کہ سیب زمین پر اس لئے گرتا ہے کہ ہر مادی چیز دوسری مادی چیز کو اپنے حجم اپنے وزن اور فاصلے کی نسبت سے اپنی طرف کھینچتی ہے اس امر سے واقف نہیں ہے کہ یہ قوت اصل میں ہے کیا؟ بالکل اسی طرح جس طرح وہ بچہ اس قوت سے آگاہ نہیں جو کہتا ہے کہ سیب اس لئے زمین پر گرتا ہے کہ وہ بھاری ہے۔ اور شاخ اس کا بار نہیں سنبھال سکتی۔

آج کل گھر گھر بجلی سے کام لیا جاتا ہے۔ ہم اس سے گاڑیاں چلاتے ہیں۔ پنکھے چلاتے ہیں۔ روشنی حاصل کرتے ہیں۔ ایک منزل سے دوسری منزل پر۔ دوسری منزل سے تیسری پر اور اسی طرح بیس بیس منزلوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایک تار لگا کر صدہا کوس کے فاصلے پر گھر بیٹھے بات چیت کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بے تار لگائے بھی گفتگو کرتے ہیں۔ ہزار ہا کوس کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تقریریں سنتے ہیں۔ موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ غرض بجلی حیاتِ جدید کی روحِ رواں ہے۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ بجلی ہے کیا چیز۔

زندگی ایک قوت ہے۔ ایک طاقت ہے اور ایسی چیز ہے۔ جس سے زیادہ اور کوئی چیز ہم سے قریب نہیں۔ لیکن کون جانتا ہے۔ کہ زندگی ہے کیا چیز۔ وہ کہاں سے آتی ہے اور پھر کہاں کو چلی جاتی ہے۔ آج تک کوئی سائنسداں زندگی کو ظہور میں نہیں لا سکا۔ کسی نے ایک حقیر سے حقیر کیڑا بھی پیدا کر کے نہیں دکھایا۔ اور نہ کبھی دکھا سکے گا۔

زندگی سربستہ رازوں والی قوت کا وہ سرچشمہ ہے۔ جو عدم واقفیت اور لاعلمی کی نامعلوم وسعت سے ہم تک پہونچتا ہے جب تک وہ ہمارے جسم میں ہے ہم بڑھتے رہتے ہیں۔ جس وقت وہ ہمارے جسم کو چھوڑ دیتی ہے وہ سڑ جاتا ہے۔ ہم اسے اپنے جسم سے ایک چاقو یا زہر کے ذریعہ خارج کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے ہم اسے بڑھا گھٹا بھی سکتے ہیں۔ لیکن ہم زندگی کو پیدا نہیں کر سکتے۔

پس یہ سب چیزیں جن پر دنیا کی مشین چل رہی ہے۔ کشش ثقل بجلی۔ زندگی ہمارے لئے ایک معمہ ہیں۔ ہم ان کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ لیکن اس کے باوجود یہی دنیا کی اہم ترین چیزیں ہیں۔ انہیں پر نسلِ انسانی کا دارومدار ہے۔ جن چیزوں کا ہمیں پورا علم ہے وہ نہایت غیر اہم معمولی اور سطحی ہیں۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اس کا جاننا مفید سہی لیکن بے اثر ہے۔ اگر نہ جانیں تو بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ تم یہ جانتے ہو کہ اس مضمون میں کل کتنے الفاظ ہیں لیکن کس کو غرض پڑی ہے جو ان باتوں کی طرف توجہ کرے اور اگر توجہ کرے بھی تو کیا حاصل ہے؟

زندگی کی ساری دلچسپیاں سارے دلنشین دھڑکے لاعلمی اور عدم واقفیت سے حاصل ہوتے ہیں۔ آنے والی کل ایک نامعلوم

اور غیر دریافت شدہ ملک ہے۔ جو خدا جانے کتنی مہمات کی سرمایہ دار ہے اور ہم سب کولمبس کی طرح "آج" کے جہاز پر کھڑے ہیں۔ اور مستقبل کے نامعلوم اور تاریک سمندر کے سفر پر کمربستہ ہیں۔

جوانی میں کیف ہے۔ دلچسپی ہے۔ بڑھاپے میں کوئی لطف نہیں۔ کوئی دلچسپی نہیں صرف اس لئے کہ جوان کے سامنے مستقبل کی ایک نامعلوم وسعت ہے۔ اس لئے کہ بوڑھے آدمیوں کی معلومات زیادہ ہے۔ وہ بہت سی چیزوں سے واقف ہیں یا کم سے کم وہ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ نامعلوم اشیاء میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں اور اسی لئے زندگی کا سارا لطف غارت ہو جاتا ہے۔

موت بھی نامعلوم وسعتوں کا ایک دروازہ ہے۔

....

کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس دروازہ کے اس طرف کیا ہے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ موت ہمارے متعلق ہمارے لئے تمام چیزوں کا خاتمہ ہے۔ یا فرض کرو ہمارے لئے ڈانٹے کا بہشت یا گوتم کا نروان ہے۔ تو موت کے سربستہ رازوں اور اس کی پوشیدہ قوتوں کا ہم پر کوئی اثر نہ رہے۔ اور ہم اسے ایک معمولی چیز سمجھنے لگیں۔ صرف اس لئے کہ ہم موت کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ اس سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ صرف اس لئے کہ ہم موت کے دروازے سے نامعلوم وسعتوں کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے وہ ایک زبردست مہم ہے۔ کسی قدیم یونانی حکیم کا مقولہ ہے۔ "کسے معلوم ہے کہ یہ زندگی اصل میں موت ہی ہو اور جسے ہم موت کہتے ہیں۔ وہ زندگی ہو"

(حامد اللہ افسر)

موسیقار

(ایک منثور نظم)

(از جناب غلام عباس صاحب - ایڈیٹر اخبار پھول لاہور)

جب موسیقار ہزار برس کا ہو گیا۔ اور اپنے آشیانے میں اپنے ہی گیتوں کی لگائی ہوئی آگ سے جل کر راکھ ہو گیا۔ تو جنگل کے سب چھوٹے بڑے پرند جو اس کی آواز پر فریفتہ تھے۔ اور ہر روز اُس کے عجیب و غریب نغمے سنا کرتے تھے۔ اس کے آشیانے کے جواب ایک تودۂ خاک تھا۔ ارد گرد سرنگوں ہو کر بیٹھ گئے۔ اور اس کی خاکستر کو جو آتشِ نغمہ سے ابھی تک گرم تھی۔ اپنے آنسوؤں سے ٹھنڈا کرنے لگے۔

اتنے میں ہوا کا ایک سرمست جھونکا منڈلاتا ہوا اِدھر آنکلا۔ اور اس کی خاک کو دیوانہ وار اِدھر اُدھر بکھیرنے لگا۔

یہ دیکھ کر سب پرندوں نے باہم اپنے پروں کو پھیلا لیا۔ اور اُس کی خاک کو ان کے نیچے چھپا لیا۔ پھر وہ بڑی منت سماجت سے ہوا کے جھونکے سے کہنے لگے "کم از کم آج کے دن کے لئے تو اس مشتِ غبار کو ہمارے پاس رہنے دو۔ تم نہیں جانتے۔ نہیں جان سکتے۔ کہ وہ ہمیں کس قدر عزیز تھا"۔

ہوا کے جھونکے نے کہا "اچھا یونہی سہی۔ تمہاری بات مانے لیتا ہوں۔ لیکن تم اس کی موت پر اس قدر غمگین کیوں ہو؟"

....

....

(طبعزاد)

عقاب بولا "اس کے مدھ ماتے گیت مجھے اپنی تندی اور خونخواری بھلا دیتے تھے"۔

چڑیا نے کہا "جب وہ گاتا تھا۔ میں بھول جاتی تھی۔ کہ میں چڑیا ہوں۔ میرے خیالات عقاب کی طرح بلند پرواز ہو جاتے تھے"۔

جھونکے نے کہا "یہ سچ ہے۔ کہ اس کے گیتوں سے تمہیں بےحد خوشی حاصل ہوتی تھی۔ لیکن وہ اپنے گیت تمہیں خوش کرنے کے لئے نہیں سناتا تھا۔ بلکہ ان کے پردے میں وہ اپنی شکم پُری کیا کرتا تھا جب اس کے جادو بھرے گیت سُن کر تم پر بےخودی طاری ہو جاتی تھی۔ تو وہ چپکے سے تم ہیں سے ایک دو کو پکڑ کر نوالہ بنا لیتا تھا"۔

یہ سُن کر ایک ننھی سی شاما نے پوچھا "کیا وہ سچ مچ پرندوں کو کھا لیا کرتا تھا؟"

ہوا کے جھونکے نے کہا "ہاں لیکن مدہوشی میں تمہیں خبر نہیں ہونے پاتی تھی"۔

شاما نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔ خوش نصیب تھے وہ پرند جنہیں موسیقار نوالہ بنا گیا۔ کیونکہ انہیں اس وقت اُس کی موت اور جدائی کا غم تو نہیں سہنا پڑا!"

(غلام عباس)

چڑیا چڑے کی کہانی

(از جناب خواجہ حسن نظامی)

حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان جانوروں سے کچھ محبت ہو گی مجھے تو ان کی شرارتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ جب دیکھو ایک نہ ایک سر پر موجود۔

سب سے زیادہ بدذات یہ چڑا ہے۔ غسل خانہ میں گھونسلا بنایا کرتا تھا۔ اگلے میں نے کہا۔ میاں یہ موروثی جگہ نہیں ہے۔ اس سے کہیں اور جا کر رہو۔ سنئے کون عذر یہ کہ آدمی کی بولی نہیں سمجھتا سب کچھ سمجھتا ہے۔ اشارے تک جانتا ہے۔ مگر یہ خیال کرتا ہے کہ میاں ننھی ننھی جانوں کو مار کر کھا جانے والے مسلمان نہیں ہیں جتنا جی میں آئے ستاؤں کچھ نہ کر سکیں گے۔ غسل خانہ کو ذرا دیکھو۔ تو طاق میں سے دامن پھڑکا۔ کھلی پھینکی۔ ٹب میں بیٹ کی۔ لوٹے میں غوطے لگائے۔ اور تولیہ کا تو دشمن ہے۔ سارے تاگے نکال ڈالے۔ اور اپنے موذی اور موذی فرزند ارجمند کے نیچے لے جا کر بچھا دیئے۔

خیر میں نے صبر کر لیا۔ بچوں کا خیال کر کے چپ ہو گیا۔ وہ بال و پر کے ہو کر اڑ گئے تو ان حضرات نے دوسری تیاری شروع کی۔

ارے بھائی کیوں دنیا کی آبادی بڑھاتا ہے۔ تجھے کیا ان چڑیا زادوں کو لڑائی پر بھیجنا ہے۔ نہیں مانتا۔ گھونسلے میں تنکے اور پر جمع کئے جاتا ہے۔

آج آٹھ دن ہوئے میں نے غسل خانہ بند کر دیا۔ دروازہ بند دیکھ کر یہ دونوں خصم جورو کچھ دیر تو چڑچڑاتے رہے۔ اور پھر اڑ کر چلے گئے۔ میں نے کہا چلو پاپ کٹا۔

دیکھتا کیا ہوں۔ چڑے صاحب پھر موجود۔ عورت ذات تو ہوا لی تھی۔ وہ تو نہ آئی اور در کی بندش کو لیڈی کی انسلٹ و توہین سمجھ کر اس نے ادھر کا رخ نہ کیا۔ لیکن چڑا بے حیا مغرب تک غل مچاتا رہا۔ سورج چھپا تو چھت گیری میں جا گھسا۔ یہ خیال نہ کیا چڑیا رات کے وقت کہاں چلی گئی نازک زمانہ ہے۔ اکیلا چھوڑنا ٹھیک نہیں مگر اس کو ملک دگھر کی پڑی ہوئی تھی۔ بیوی کی اس نے پروا بھی نہ کی۔ صبح ہوئی تو چڑیا ایک اور چڑے کے ساتھ آئی اور منڈیر پر بیٹھ کر چڑ چوں چڑ چوں چوں چوں کی آواز لگائی۔ یہ بے غیرت بلبلا کر دوڑا۔ اور چڑیا کے برابر جا بیٹھا۔ یہ نہ پوچھا کہ کیوں ری ساتھ میں کون ہے اور رات تو نے کہاں گذاری مگر نہیں پھر وہی راز۔ وہی نیاز۔ رقیب چڑا اڑ گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد چڑیا بھی غائب ہو گئی۔ اب پھر میری شامت آئی۔ سامنے آن بیٹھا اور لگا طرح طرح کی آوازیں نکالنے۔ لڑتا ہے۔ گالیاں دیتا ہے کوستا ہے۔ آخر تو کیا کہتا ہے۔ میں غسل خانہ تو ہرگز نہ کھولونگا۔

میں نے کبھی ایسا مستقل مزاج نہیں دیکھا۔ برابر آٹھ دن اس نے ایجی ٹیشن جاری رکھا۔ آخر آج بوقت عصر میں نے اپنی ضد کے ہتھیار چڑے کے سامنے ڈال دیئے اور غسلخانہ کھول کر اس کو گھونسلے میں جانے کی اجازت دیدی ۔

اب مس چڑیا کی کہانی سنئے

ایک چڑے چڑیا نے نئی روشنی کی ایک اونچی کوٹھی میں اپنا گھونسلا بنایا تھا۔ اس کوٹھی میں ایک مسلمان رہتے تھے۔ جو ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے اور ایک میم کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان کی بیرسٹری کچھ چلتی نہ تھی۔ مگر گھر کے امیر زمیندار تھے گزارہ خوبی سے ہوا جاتا تھا۔ ولایت سے آنے کے بعد خدا نے ان کو ایک لڑکی بھی

عنایت کی تھی - جو ماشاء اللہ چلتی پھرتی تھی اور باپ کی طرف سے سلطان اور ماں کی طرف سے بس بابا تھی -

چڑے چڑیا نے کھپریل کے اندر ایک سوراخ میں گھر بنایا تنکوں اور سوت کا فرش بچھایا - یہ سوت پڑوس کی ایک بڑھیا کے گھر سے چڑیا لائی تھی - وہ بیچاری چرخا کاتا کرتی تھی - اُلجھا ہوا سوت پھینک دیتی تو چڑیا اٹھا لاتی - اور اپنے گھر میں اس کو بچھا دیتی -

خدا کی قدرت ایک دن انڈا پھسل کر گر پڑا اور ٹوٹ گیا ایک ہی باقی رہا - چڑے چڑیا کو اس انڈے کا بڑا صدمہ ہوا - جس دن انڈا گرا ہے تو چڑیا گھونسلے میں تھی - چڑا باہر دانہ چگنے گیا ہوا تھا - وہ گھر میں آیا تو چڑیا کو چُپ چُپ اور مغموم دیکھ کر سمجھا میرے دیر میں آنے کے سبب خفا ہو گئی ہے -

لگا پھدک کر چوں چوں - چیں - چڑچوں - چیں چڑ چوں - چوں - چڑچوں - چڑچوں - چوں - کرنے کبھی چونچ مار کر گدگدی کرتا کبھی خود اپنے پروں کو پھلاتا - ناچتا - مٹکتا اور چڑیا کی چونچ پر اپنی چونچ محبت سے رکھتا - مگر چڑیا اسی طرح پھولی اپھری خاموش بیٹھی رہی - اس نے مرد ذات کی خوشامد کا کچھ بھی جواب نہ دیا - چڑا سمجھا بہت ہی خفگی ہے - مزاج حد سے زیادہ بگڑ گیا ہے خوشامد سے کام نہ چلے گا - مجھ مرد کی کتنی بڑی توہین ہے کہ اتنی دیر خوشامد درآمد کی - بیگم صاحبہ نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا - یہ خیال کر کے چڑا بھی منہ پھیر کر بیٹھ گیا - اور چڑیا سے بے رُخ ہو کر نیچے برآمدہ کو جھانکنے لگا - جو اپنی لیڈی کے سامنے آرام کرسی پر لیٹے تھے - اور ہنسی مذاق کر رہے تھے - چڑے نے خیال کیا یہ آدمی کیسے خوش نصیب ہیں - دونوں کا جوڑا خوش و بشاش زندگی کاٹ رہا ہے - ایک میں بدنصیب ہوں - سویرے کا گیا گیا دانہ چگ کر اب گھر میں گھسا ہوں - مگر چڑیا صاحبہ کا مزاج ٹھکانے میں نہیں ہے - کاش میں چڑا نہ ہوتا اور کم سے کم آدمی بنایا جاتا -

چڑا اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ چڑیا نے غمناک آواز نکالی - چوں - چڑے نے جلدی سے مڑ کر چڑیا کو دیکھا اور کہا - چوں چوں چڑچوں چوں - کیا ہے - آج تم ایسی چپ کیوں ہو - چڑیا بولی انڈا گر کے ٹوٹ گیا -

انڈے کی خبر سے پہلے تو چڑے کو ذرا سا رنج ہوا مگر اس نے صدمہ کو دبا کر کہا - تم کہاں چلی گئی تھیں - انڈا کیونکر گر پڑا - چڑیا نے کہا میں اُڑ کر ذرا آنگن کی ہوا کھانے چلی گئی تھی - جھپٹے سے انڈا پھسل گیا - یہ بیان سُن کر چڑا آپے سے باہر ہو گیا - اس کے مردانہ جوش میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کڑک دار گرجتی ہوئی چوں چوں میں کہا - پھوہڑ - بدسلیقہ - بے تمیز تو کیوں اڑی تھی - تجھ کو چمن کی ہوا کے بغیر کیا ہوا جاتا تھا - کیا تو بھی اس گوری عورت کی خصلت سیکھتی ہے جو گھر کا کام نوکروں پر چھوڑ کر ہوا خوری کرتی پھرتی ہے - تو ایک چڑیا ہے تیرا کوئی حق نہیں ہے کہ بغیر میری مرضی کے باہر نکلے - تجھ کو میرے ساتھ اڑنے اور ہوا خوری کرنے کا حق ہے آج کل تو انڈوں کی نوکر تھی - تجھے یہاں سے ٹلنے کا اختیار نہ تھا - تو نے میرے ایک انڈے کا نقصان کر کے اتنا بڑا قصور کیا ہے کہ اس کا بدلہ کچھ نہیں ہو سکتا تو نے میرے بچے کو جان بوجھ کر مار ڈالا - تو نے خدا کی امانت کی قدر نہ کی جو اس نے ہم کو نسل بڑھانے کی خاطر دی تھی - میں تو پہلے دن منع کرتا تھا کہ اری کمبخت اس کوٹھی میں گھونسلا نہ بنا - ایسا نہ ہو - ان لوگوں کا اثر ہم پر بھی پڑ جائے - ہم بیچارے پرانے زمانہ کے دیسی چڑے ہیں - خدا ہم کو نئے زمانہ کے چڑیا چڑے سے بھی بچائے رکھے - کیونکہ پھر گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے مگر تو نہ مانی - اور کوٹھی میں رہوں گی - کوٹھی میں گھر بناؤں گی - یہ کہا کہ میرا ناک میں دم کر دیا - اب لا میرا بچہ لا - میں تجھ سے لوں گا - نہیں تو مارے ٹھونگوں کے کچلا بنا دوں گا - بڑی صاحب بنی تھیں ہوا کھانے - اب بتاؤں تجھ کو ہوا کھانے کا مزہ - چڑیا پہلے تو اپنے غم میں چُپ چاپ چڑے کی باتیں سنتی رہی - لیکن جب چڑا حد سے بڑھا تو اس نے زبان کھولی اور کہا -

بس بس سُن لیا - بگڑ چکے - زبان کو روکو - انڈے بچے پالنے کا مجھی پر ٹھیکہ نہیں ہے - تم بھی برابر کے شریک ہو - سویرے کے گئے گئے یہ وقت آ گیا - خبر نہیں اپنی کس سگی کے ساتھ گلچھرے اڑاتے

پھرتے ہوں گے۔ دوپہر میں گھر کے اندر گھسے ہیں اور آئے تو مزاج دکھاتے آئے۔ انڈا گر پڑا میرے پنجہ کی نوک سے۔ میں کیا کروں میں کیا انڈوں کی خاطر اپنی جوان جہان جان کو گھن لگا لوں۔ دو گھڑی باہر کی ہوا بھی نہ کھاؤں۔ صبح سے یہ وقت آیا ایک دانہ حلق سے نیچے نہیں گیا۔ تم نے جھوٹے منہ سے یہ نہ پوچھا کہ تو نے کچھ تھوڑا کچھ کھایا یا مزاج ہی دکھانا آتا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اکیلی چڑیا یہ سب بوجھ تھامے۔ اب آزادی اور برابری کا وقت ہے۔ آدھا کام تم کرو۔ آدھا میں کروں۔ دیکھتے نہیں میم صاحبہ کو وہ تو کچھ بھی کام نہیں کرتیں۔ صاحب کو سارا کام کرنا پڑتا ہے۔ اور بچہ کو آیا کھلاتی ہے۔ تم نے ایک آیا رکھی ہوتی۔ میں تمہارے انڈے بچوں کی آیا نہیں ہوں ؛

چڑیا کی اس تقریر سے چڑا سن ہو گیا۔ اور کچھ جواب نہ بن پڑا بیچارہ غصہ کو پی کر پھر خوشامد کرنے لگا۔ اور اس دن سے چڑیا کے ساتھ آدھی خدمت انڈے کی بانٹ کر اس نے اپنے ذمہ لے لی ؛

مس چڑیا کی پیدائش

ایک انڈا تو ٹوٹ چکا تھا دوسرے انڈے سے ایک بچہ نکلا جو مادہ یعنی چڑیا تھی۔ جب یہ بچہ ذرا بڑا ہوا اور اس نے میم صاحبہ کے بچہ کو دیکھا کہ وہ کاٹ کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ گھڑی گھڑی دودھ پیتا ہے ٹب میں بیٹھ کر نہاتا ہے۔ نئے نئے خوبصورت کپڑے پہنتا ہے۔ تو اس چڑیا زادی نے بھی باپ سے کہا۔

چیں۔ چیں۔ چیں۔ ابا مجھ کو بھی گھوڑا منگا دو۔ ابا میں بھی ٹب میں نہاؤنگی۔ ابا مجھ کو بھی ایسے رنگ برنگ کے کپڑے لا کر دو۔ چڑے نے چڑیا سے کہا۔ لے سن۔ دیکھا مزہ کوٹھی میں گھر بنانے کا اب لا اپنی لاڈلی کے واسطے گھوڑا۔ ٹب منگا۔ کپڑے بنا۔

چڑیا نے کہا۔ دیکھو پھر وہی لڑائی کی باتیں نکالیں۔ ایک کی تو تمہاری اس کل کل سے جان گئی۔ یہ نگوڑی بچی ہے۔ تم اس کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ بچہ ہے کہنے دو یہ کیا جانے۔ ہم غریب ہیں۔ اور یہ چیزیں نہیں لا سکتے۔ بڑی ہو گی تو آپ سمجھ لے گی کہ چڑیوں کو آدمیوں کی ریس سے کیا سروکار۔ مس چڑیا نے ماں کی بات سن کر کہا۔ واہ بی اماں واہ تم غریب تھیں۔ تم چڑیا تھیں تو اس امیر کی کوٹھی میں آکر کیوں رہی تھیں۔ گاؤں کے چھپر میں گھر بنایا ہوتا۔ میں تو ہرگز نہ مانونگی۔ اور میم صاحبہ کے بچہ کی سی سب چیزیں منگا کر رہوں گی۔ نہ لاؤ گی تو لو میں گرتی ہوں اور مرتی ہوں۔ پاپ کاٹے دیتی ہوں۔ نہ زندہ رہوں گی نہ تم پر میرا بوجھ ہو گا ؛

چڑے چڑیا نے گھبرا کر کہا۔ ہے ہے۔ ایسا غضب نہ کیجیئو۔ اچھا اچھا ہم سب کچھ منگا دیں گے۔ یہ کہکر اور مس چڑیا کو دلاسہ دے کر دونوں نے چونچ سے چونچ ملائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ روتے تھے اور یہ کہتے تھے۔ ہائے اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے۔ اور بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے۔ یہ بیرسٹر صاحب اچھے سہی مگر ان کی صحبت سے ہمارا تو ستیاناس ہو گیا۔ ہائے ہماری لاڈلی ہاتھوں سے نکل گئی۔ ہائے یہاں تو اور کوئی چڑیا بھی نہیں جو ہمارے دکھ میں شریک ہو۔ چڑے چڑیا روتے تھے۔ اور مس چڑیا قہقہہ لگاتی تھی۔ کہ نئے زمانہ کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے ؛

(حسن نظامی)

افسانہ

ضیاپاش

(از جناب صاحبزادہ محمد عمر صاحب رضا بی اے جموں)

بمبئی میں دکانوں کی اور دکانوں میں مال ومنال کی کثرت ایسی بات ہے کہ خواہ کتنی وضاحت سے کام لیں مگر یہ بیان واقف کاروں کی نگاہ میں مبالغہ کی حد تک نہیں پہنچتا۔ پھر بھی دولھا بھائی فرامجی جوہری کی دکان ایسے نوادرِ روزگار کا مجموعہ ہے کہ اُس کے ذکرِ خیر میں لاکھ سادگی اور دیانت برتیں کہنے والے یہی کہیں گے کہ تصنع ہے۔ تکلف ہے۔ شاعرانہ بلند پروازی ہے وغیرہ وغیرہ۔ آپ ہی بتائیے کہ جس دوکان کو طلوع سے غروب تک اور غروب سے طلوع تک نیلے پردے پڑے رہیں۔ جس دکان میں کوئی گاہک آتا جاتا نہ دکھائی دے۔ جو دکان اس علیہ دا تجارت سے محروم ہو۔ جسے عرفِ عام میں "بورڈ" کہتے ہیں۔ اس کے متعلق کون باور کرے گا کہ اگر یہ بمبئی کی سب سے بڑی دکان نہیں تو کم سے کم اس شہر کی ڈائرکٹری مکمل نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس پر اس دکان کا نام نہ چڑھے۔ کون باور کرے گا کہ اس کی ساکھ یورپ کی بڑی بڑی منڈیوں تک ہے۔ اور ممالکِ عالم کے دارالخلافوں میں اس کی ہنڈیاں بر مان ہوتی ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ بلاخوف حلف دروغی یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ جواہرات کا جو منتخب اور سیر حاصل ذخیرہ اس دوکان میں ہے اس کا جواب دنیا کی بہت کم دکانیں پیش کر سکتی ہیں جتنی یہ دکان بڑی ہے۔ اس کے حساب وکتاب کی کتابیں اتنی ہی مختصر ہیں۔ بس یہ سمجھ لیجئے آپ اس کی پچپن سالہ کارگذاری کی روئداد آرام سے اوپر کی جیب میں رکھ سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ سال دو سال میں ایک دو خریدار آنکلتے ہیں۔ اور اس سے انکم ٹیکس کے عملہ کا خرچ نکل جاتا ہے۔ اس کے عقب میں وہ کمرہ ہے جس میں غیر معمولی قیمت کا مال قفل در قفل رہتا ہے اور جو دکان کے الماس تراش جہانگیر کی کارگاہ ہے۔ اس کمرے کو خلوت کی وہ معراج حاصل ہے جو کنج لحد کو بھی نصیب نہیں۔ وہاں باہر فاتحہ خوانوں کی خلفشار اور اندر منکر نکیر کی چھیڑ چھاڑ لگی رہتی ہے۔ لیکن یہاں کبھی دوسابھائی آنکلے تو آنکلے ورنہ سوا ان کی بیٹی یاقوت کے کوئی سکندر نہ تھا۔ جو اس ظلمات میں جھانک بھی سکے یہ کمرہ جہانگیر کی دنیا تھا۔ جس سے وہ مارے باندھے نکلنے کا نام نہ لیتا تھا بس جواہرات سے کھیلنا اور انکی آب کو ایک سے ہزار کر دینا دوسابھائی اس کے حسنِ صفت کا معترف تھا۔ مگر دل میں! وہ ایسا سرمایہ دار نہ تھا جو مزدور کی محنت کی داد دے کر سوتی بھیڑ کو جگاتا۔ مگر جہانگیر تحسین و انعام سے بے نیاز تھا۔ کہ یہ محنت اس کی تفریح میں داخل ہو چکی تھی۔

(۲)

ایک دن دونوں دن مل رہے تھے۔ کہ دوسابھائی ہانپتا کانپتا جہانگیر کی "حراستِ خود اختیاری" میں آیا۔ پہلے ایک تبسم زیرِ لب نے اس کا استقبال کیا۔ لیکن اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر جہانگیر کی ٹھوڑی کالوسے اتر کر ٹائی کے سر ہو گئی۔ تھوڑی دیر ہوئی تھی۔ جب اس نے سنا تھا کہ یاقوت کی طبیعت کچھ بدمزہ سی ہے۔ آنِ واحد میں اس خیال نے دوسابھائی کی گھبراہٹ سے مل کر تیمارداری کے جملہ لوازم اسکی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیئے۔ اور شہر کے مشہور ڈاکٹروں کے مطب یاد آنے لگے۔ اوزار میز پر رکھ کر اور ٹوپی ہاتھ میں لے کر اس نے پوچھا۔ خیر تو ہے۔ دوسابھائی نے کہا۔ کچھ نہیں۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ کل جو ہیرا بیس ہزار میں گیا اس میں کچھ گھاٹے میں تو نہیں رہے چندے اور محنت ہوتی تو شاید کچھ اور مل جاتا۔"

جہانگیر۔ محنت کی تو گنجائش نہ تھی۔ ویسے کوئی عقل کا اندھا

مل جاتا تو اور بات ہے۔ سات سو کا مال بیس ہزار میں اُٹھ گیا تو کیا بُرا رہا؟

دوسابھائی۔ آخر ہنس دیئے۔ اچھا جو ہوا خوب ہوا۔ ہاں یہ کہنا بھول ہی گیا تھا کہ کل مہاراجہ نیپال کے وزیر ضیا پاش کی زیارت کو آرہے ہیں۔ کمبخت جیکسن ہمراہ ہوگا۔ اس کی جو آنکھ ہے تم جانتے ہو اس لئے وہ ایک انچ کی کسر بھی نکل جائے تو بہتر ہے۔

یہ کہکر دوسابھائی اٹھا اور ایک بھاری بھرکم سیف ایک آہنی صندوقچہ سے نکالا۔ اس میں سے ایک ڈبہ اور ڈبہ سے ایک ڈبیہ برآمد ہوئی۔ جس میں ضیا پاش پردے کی بوبو بنا بیٹھا تھا۔ دوسابھائی نے یہ ہیرا جہانگیر کو دیا۔ اس نے اس ہزاروں دفعہ دیکھی ہوئی چیز پر ایک بصیرانہ نگاہ ڈالی اور کہا۔ کوہ نور میں نے نہیں دیکھا ہوگا ویسا ہی ہوگا۔ جیسا کہتے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ اب اور کیا ہوگا بس یہ ایک چیز ہے۔ جس کی گراں سے گراں قیمت "ارزانی ہنوز" کہے گی۔

دوسابھائی چلا گیا اور جہانگیر ضیا پاش کی پوجا کرنے لگا۔ اس کی دلبستگی محنت کی کشاکش میں تبدیل ہوئی کہ یاقوت آگئی اور جہانگیر آب و رنگ کے اس تصادم کو دیکھ کر قوت تمیز سے محروم ہوگیا۔ یاقوت میز کے اس طرف جہانگیر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

یہ کہنا شاید افشائے راز کی حد تک نہیں پہنچتا۔ کہ جہانگیر جن جواہرات کی آڑ میں دنیا اور اس کی ہماہمیوں کو تیاگ رہا تھا۔ ان کی تہ میں یاقوت۔ کہربا اور مقناطیس کے فرائض بجا لاتی تھی۔ اس بے لوث اور بے لاگ محبت کا کوچہ چانہ ہوا تھا۔ یہانتک کہ خود جہانگیر اور یاقوت بھی نہ جانتے تھے۔ کہ ان کے جذبات انہیں کہاں لے جارہے ہیں۔ مگر دوسابھائی کا بڑھاپا ابھی شباب کی امنگوں کو فراموش نہ کرچکا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کیا ہو رہا ہے۔ مگر ظاہر یہ کرنا چاہتا تھا۔ کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ وہ ان کی محبت کو ماں کی آنکھ نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ اس کے نتائج وعواقب پر باپ کے دماغ سے غور کرتا تھا دولت کے بعد اگر کسی سے اُسے محبت تھی تو یہی اس کی اکلوتی بیٹی یاقوت تھی۔ جس کی مرحومہ ماں کا جہیز اس کی دکان کے راس المال کا کفیل تھا۔ دوسابھائی دنیا کی ہر بات کو دل کے ہر جذبے کو تجارت کے کانٹے میں تولتا تھا اور اس لئے یاقوت کی شادی کو بھی وہ "زر زرا میکشد" کے مترادف بنانا چاہتا تھا۔ جہانگیر تو خیر خارج از بحث تھا۔ مگر اُسے بمبئی بھر میں الماس کی ٹکر کا بر نظر نہ آتا تھا۔ پرانے قصہ کہانیوں میں آتا ہے۔ کہ ایک بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی سیمرغ کے انڈے یا ہما کے پر لانے سے وابستہ کی تھی۔ ایسی شرطیں محض نظر فریب انکار ہوا کرتی ہیں۔ مگر دوسابھائی کی یہ شرط کہ یاقوت کا دولہا ضیا پاش جیسا ہیرا پیش کرے۔ یا اسے خریدنے کی استطاعت رکھے۔ ایک سیدھے سبھاؤ کی شرط تھی۔ بہرکیف جہانگیر اور یاقوت کے کان دوسابھائی کی دور اندیشیوں سے نا آشنا تھے ان کی باتیں فکر وہ سے آزاد۔ دلآویزی کی شان لئے ہوئے تھیں۔ آج بھی وہ ایسی باتوں کے غرّے لے رہے ہیں جنہیں اگر نیرنگ کے صفحات پر لایا جائے تو بیرنگ نظر آئیں اور کوئی اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔ لیکن اپنے عندیہ میں وہ سرشار کی گل افشانی کو ماند کرتے تھے۔ جہانگیر نے الماری سے چائے کا سامان نکالا چائے تیار ہوئی۔ دونوں پینے لگے۔ اور دنیا مافیہا سے بے خبر ہو کر باتیں کرتے رہے۔ آخر یہ دور ختم ہوا۔ چائے کا سامان اٹھا کر الماری میں رکھا۔ کہ دوسابھائی جلدی جلدی ڈگ بھرتے داخل ہوئے اور یہ خبر لائے کہ وزیر صاحب کا فون آیا ہے کہ کل کی بجائے آج ہی ایک گھنٹہ تک آئیں گے۔ لاؤ ضیا پاش کو ذرا سلیقہ سے سنوار کر رکھیں۔

جہانگیر کو پہلی نگاہ میں میز پر ضیا پاش نظر نہ آیا۔ غور سے دیکھا۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ الماس نے دیکھا۔ دوسابھائی نے دیکھا۔ لیکن کسی کو دکھائی نہ دیا اب باقاعدہ تلاش شروع ہوئی۔ میز کی بساط ہی کیا۔ ان چھ آنکھوں نے کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن ضیا پاش کا کوئی نشان نہ ملا۔ دوسابھائی کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوگئی۔ جہانگیر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ یاقوت کی ہمدردی اس کشمکش میں اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ کہ اس کا میلان ان دونوں میں سے کس کی طرف زیادہ ہے۔ وزیر صاحب کو تو ٹال دیا۔ اور ہیرا سر گم گشتہ ہیرے کے لئے چکر کھانے لگے۔ آخر ... کے بعد وہ

اس نتیجہ پر پہنچے۔ کہ جہانگیر پیٹری کے ساتھ ہیرا نکل گیا ہے۔ وہم نے جہانگیر کے
پیٹ میں کچھ درد بھی پیدا کر دیا اور گلے میں خراش سی محسوس ہونے لگی۔
اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جہانگیر کے پیٹ سے ضیا پاش کس طرح نکالا جائے
اسی ادھیڑبن میں تڑکا ہوگیا۔ مگر کوئی بات نہ بنی۔ دوسا بھائی کو اس
بات میں بھی مضائقہ نہ تھا۔ کہ جہانگیر کو ہلاک کرکے ضیا پاش نکال لیا جائے
بہت سردردی کے بعد مشیر قانونی طلب ہوئے اور ان کی ہدایت کے
مطابق جہانگیر کے روبرو اس کے خلاف سرقہ کا مقدمہ قائم کرنے کی
ٹھیری۔ مستغیث۔ ملزم۔ گواہ اور وکیل ایک میز پر کھانا کھا کر اور
ایک موٹر میں بیٹھ کر عدالت کو چلے ؛

(۳)

اس قدر دلچسپ۔ اس قدر کٹھن۔ اتنا پیچیدہ اور ایسا سادہ
مقدمہ عدالت میں کبھی پیش نہ ہوا تھا۔ ملزم کو اقرار تھا۔ کہ اس نے
مال مسروقہ کی تعزیرات ہند کی ہدایات کے مطابق نقل مکان کی۔
مال مذکور اس کے پاس موجود ہے اس کی حوالگی میں عذر نہیں مگر یہ
اس کے بس سے باہر اور قدرت کے اختیار میں ہے مستغیث کا بیان
اس سے بھی عجیب تھا۔ اس کے عندیہ میں ملزم نے کسی قسم کی بدنیتی سے
کام نہیں لیا۔ مال مسروقہ اتفاقاً اس کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کا حوالہ
کرنا ملزم بطور خود نہیں کرسکتا۔ عدالت اپنے اختیارات تمیزی کو
عمل میں لاکر حکم دے کہ ملزم پر عمل جراحی کرکے اس کا مال دلایا جائے۔
یاقوت۔ استغاثہ اور صفائی کی طرف سے واحد گواہ تھی۔ اس نے
عجیب ترین بیان دیا کہ مال اس کے سامنے گم ہوا اور ظن غالب یہ ہے
کہ وہ ملزم کے قبضہ بلا اختیاری میں چلا گیا۔ اگر عمل جراحی کا حکم دینا لازم
آئے تو مستغیث اس کی قیمت گواہ کے حصہ دکان سے وضع کرے اور
عمل جراحی نہ کیا جائے۔ اس روئداد پر تجویز صادر کرنا عدالت کے لئے
مشکل تھا۔ مغربی طریق عدالت گستری مشرقی عدل و انصاف اور
ترحم سے مختلف ہے۔ تمام وکیل جمع ہوگئے۔ دیگر جج بھی آگئے اور
عدالت تجویز کنندہ کی بوکھلاہٹ کا تماشہ دیکھنے لگے۔ لیکن جج بھی
پُرانا گھاگ تھا اس نے سیکڑوں پیچیدہ مقدمات پیچیدہ فیصلوں میں
آڈر دئے تھے۔ اس نے فیصلہ بھی اسقدر دلچسپ سنایا جو اس عجیب
مقدمہ کے شایان شان تھا۔ الفاظ وہی تھے۔ حکم کی نوعیت وہی
تھی۔ جو سیکڑوں مرتبہ اس کی قلم سے نکل چکے تھے۔ لیکن حالات نے
انہیں بہت نمایاں کر دیا۔ فرماتے ہیں "روئداد مثل کی رو سے
مقدمہ قابل توجہ نہیں۔ ملزم کا فعل قانون کی کسی شق کے تحت قابل
گرفت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ مقدمہ دیوانی نوعیت کا ہے جس میں
عدالت فوجداری دخل نہیں دے سکتی۔ مستغیث کی یہ التجا قابل
پذیرائی نہیں کہ ملزم کا بروئے قانون عمل جراحی کیا جائے کہ قانون
اس کا روادار نہیں۔ نہ کسی عدالت عالیہ نے اس قسم کا حکم صادر
فرمایا ہے۔ البتہ اگر فریقین برضا و رغبت خود ایسا کر کرالیں۔ تو
عدالت کو اعتراض نہیں"۔ یہ فیصلہ سنکر فریقین کی گاڑی گھر کی طرف
پھری۔ لیکن ان کی آمد و رفت نے صورت حالات پر کوئی اثر نہ ڈالا
دوسا بھائی عمل جراحی پر مصر تھے۔ جہانگیر عمل جراحی کے لئے آمادہ
تھا۔ یاقوت۔ عمل جراحی کا نام نہ لینے دیتی تھی ؛

(۴)

نئی روشنی اور جدید تعلیم نے جہاں دماغوں کو منور کیا وہاں نئی
دنیا کو اُجاڑ دیا۔ جن اور پری کی روایات افسانہ بن گئی۔ اکسیر اور پارس
جو عرصہ حیات کے تھکے ماندوں کو "دنیا بامید قائم" کا سراب دکھاتے
تھے۔ ایک قصہ قرار دیئے گئے۔ سقنقور کی مسیحائی جو بڑھاپے میں شباب کا
امکان پیدا کرتی تھی۔ محض زیب داستان ہو کر رہ گئی۔ غرض ماضی کی
جملہ دلبستگیوں کے چراغ اس نئی روشنی کے سامنے گل ہوگئے۔ یہاں تک
کہ ہمزاد اور ان کی تسخیر کے عمل سے جو چار بھلے مانسوں کا چولیا روشن
ہوجاتا تھا۔ اس کی اتنی بھی حقیقت نہ رہی کہ ذرا دوں کے دل بہلاوے کے
طور پر اس کی تحقیق کے لئے چار بھلے مانسوں کا کوئی کمیشن ہی مقرر
کیا جاتا۔ مگر آفریں کیجئے دوسا بھائی کی وطن پرستی اور قدامت نوازی کو
کہ اس نے ہمزاد کی یاد کو تازہ کر دیا۔ جہانگیر صبح بستر سے اٹھا تو دوسا
بھائی پہلے سے موجود۔ غسل خانہ جاتا تو دوسا بھائی باہر چہل قدمی کرتے
کام کرتا تو دوسا بھائی سینہ پر اپنے بازوؤں کو ہم آغوش کرکے سامنے
ڈٹے رہتے۔ اگر کسی وقت جہانگیر باہر جاتا تو سیٹھ صاحب کی سواری
بھی ہمراہ نکلتی۔ غرض اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے دوسا بھائی کبھی جہانگیر کو

آنکھ سے اوجھل ہونے دیتا۔ دوسابھائی کی ان حرکات مذبوحی پر آپ قہقہہ لگائیں۔ مگر خدارا آپ ہی بتائیں کہ جب خود پولیس کے حکام خبر پر خبر دیں کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ کے ممتاز ترین چور اُچکے جہانگیر کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسے ہلاک کر کے اس کے شکم سے ضیا پاش کو نکال لیں۔ تو بتائیے کہ دوسابھائی یہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ جو شخص تھیٹر میں نہ جاتا ہو کہ وہاں پٹاخے کی آواز سُنکر اس کا دل جاتا ہے اس کے پستولوں کی جوڑی لگائے پھرنا کتنا بڑا ایثار ہے۔ جس شخص نے کبھی چاقو نہ رکھا ہو اس کی پتلون کی جیب میں پیش قبض کا آشیانہ بنانا کتنا بڑا کارنامہ ہے۔ جو شخص کبھی ایک پیسہ نہ خرچے جب تک اسے یہ امید نہ ہو کہ وہ ایک اور کو انگلی سے پکڑے رہے گا اُس کا پورے دو سو روپے ماہوار پر ایک سراغرساں کو لگا رکھنا کتنی عظیم الشان قربانی ہے۔ آپ درست فرماتے ہیں کہ یہ سامانِ مدافعت جہانگیر کی جان کے لئے نہ تھا بلکہ ضیاپاش کی خاطر تھا۔ چلو یونہی سہی۔ پھر دوسابھائی کی تدابیر حق بجانب ہیں۔ اور آپ اسپر ہنسنے کے مجاز نہیں۔ دوسابھائی لاکھ جاگنے کی کوشش کرے۔ مگر ساٹھ سال کی عادت دنوں میں نہیں جا سکتی۔ اس لئے دس بجنے کے بعد وہ آ ہی جاتی۔ جو سولی پر بھی نہیں رکتی۔ جہانگیر نے ڈر کا روگ پالا ہی نہ تھا اس لئے وہ اپنی نیند سوتا۔ اپنی نیند جاگتا۔ اس کے معمول میں کوئی فکر نہ آیا۔ رہے یہاں سراغرساں۔ وہ اپنی صحت کی قدر خوب جانتے تھے۔ ان کی نگاہ شب بیداری کی شدت الفنسٹن رسٹورنٹ میں ایک ادھا چڑھا کر پڑا رہنا صحت کا بہترین استعمال تھا۔ دس بجے شام سے لے کر صبح چھ بجے تک جہانگیر اور ضیاپاش نقب زنوں کے عالم پر رہتے تھے۔ "چپ" کے تالے اور دو انچ کی سلاخیں امن پسندوں کے ڈرانے کے لئے ہیں۔ چوروں اور نقب زنوں کے آگے یہ چیزیں دعوتی رقعوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ انہیں کھٹکے کا کھٹکا ہوتا ہے۔ وہ انسانی آنکھ کی دونالی سے سہم جاتے ہیں۔ روشنی ان کیلئے اندھیر ہے۔ وہ سکون چاہتے ہیں۔ اہلِ مکان کی خوابِ راحت کیلئے دست بدعا رہتے ہیں۔ کہ ان کے تیر اندھیرے ہی میں روشن ہوتے ہیں اس لئے جہاں تک دوسابھائی۔ جہانگیر اور سراغرساں کا تعلق تھا۔ اس وقت مطلع صاف ہوتا تھا۔ لیکن دوسابھائی کے مکان کی طرف جب ان بزرگوں کا پھیرا ہوا انہوں نے اندھیرے کو کافور پایا۔ اور پیانو کی مبہم صدا یا کسی کتاب کے بند زنانہ آواز سے پڑھنے نے پہرہ چوکی کا اعلان کیا کہ ان خواب اور گھنٹوں کو آنکھوں میں بسر کرنا یاقوت نے اپنا فرض بنالیا تھا۔ جوانی کے دنوں میں تنہا رات کو دن کر دینا کھیل نہیں لیکن جب دل کو لگی ہو تو نیند خواب ہو جاتی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس وقت جہانگیر کی جان داؤ پر ہے۔ اس کی آنکھیں اس وقت بند ہونے کا نام نہ لیتی تھیں جب اس مکان میں کوئی کوئی آنکھ کھلی نہ ہوتی تھی۔ اس بے جا بیداری نے اس کی آنکھوں کے بجی نے خشک کر دیئے اس کے پھول سے رخسار مرجھا گئے۔ غیروں نے اُسے بیمار سمجھا۔ دوسابھائی نے اسے ضیاپاش کے نقصان سے منسوب کیا اور جہانگیر نے جو خیال کیا اس نے اس درد میں ایک مزا پیدا کر دیا۔

(۵)

یہ عمل ایسا نہ تھا۔ جو دو ہفتوں کے بعد اجیرن نہ ہو جاتا۔ دوسابھائی اس چوکیداری سے اکتا گئے۔ جہانگیر اس چوبیں گھنٹے کی حراست اور نگرانی سے تنگ آ گیا۔ یاقوت کی صحت نے دونوں کو پریشان کر دیا۔ ایک رات جہانگیر یاقوت کی ناسازطبع پر غور کرتا ہوگیا۔ مگر خلاف معمول اسکی نیند اچاٹ ہوگئی۔ آنکھیں بند ہونے کے ماسوا وہ ہر پہلو سے جاگ رہا تھا۔ کہ اس نے کمرے میں روشنی کی ایک لمبی سی رو داخل ہوتی دیکھی جو رفتہ رفتہ تیز ہونے لگی۔ اور آخر ایک سیاہ پوش شخص داخل ہوا۔ برقی مشعل اسکے ہاتھ میں تھی اور اس کا چہرہ روشنی کے اثر سے محفوظ تھا۔ یہ شخص دبے پاؤں بڑھتا ہوا جہانگیر کے پلنگ کے پاس آ گیا۔ کمرے کی خاموشی میں اس وقت صرف دوسابھائی کے خراٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ جہانگیر سمجھ گیا کہ کوئی نقب زن ضیاپاش کی تلاش میں آیا ہے۔ اس نے ٹھان لی کہ دوسابھائی کی دلیری کا امتحان لئے بغیر وہ اس سے دو ہاتھ کرے گا۔ اس لئے وہ چپکا پڑا رہا۔ یہاں تک کہ سیاہ پوش اس کے اس قدر قریب آ گیا کہ اس کی آنکھیں برقی تاب روشنی کی تاب نہ لاسکیں۔ چندھیا گئیں۔ وہ اور آگے آیا تو جہانگیر نے اچک کر اس کی کلائی پکڑلی۔ مگر کلائی اسقدر نازک اور نسائیت کے سانچے میں ڈھلی تھی کہ ششدر گرفت ندامت کے ہاتھوں ڈھیلی پڑ گئی۔ ایک ننھا سا آ ...ٹوں میں خلل ڈالنے کی ناکام کوشش میں خود فنا ہو گیا ہیں +

"یاقوت تم اسوقت کہاں" "یاقوت نے ..."

لندن تب

ہوئی اپنی طرز کی

خصوصیات پر

ب ذب تو

(ادا)

تم اس وقت جاگ کس طرح رہے ہو" یہ مختصر جواب اتنے حالات بیان کرگیا کہ تفصیل کی ضرورت نہ رہی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ یاقوت کئی راتوں سے جاگ رہی ہے جس کے تاثرات اس کی صحت سے ظاہر ہو رہے تھے۔ غرض دونوں شب زندہ دار باتیں کرنے لگے۔ جن کے اختتام پر جہانگیر نے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ عملِ جراحی کراکے رہے گا۔ یاقوت نے اپنے حسن کے ساتھ لاکھ حملے کئے مگر جہانگیر کے ارادہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہ وہی قوت تھی جو یاقوت کے ایک اشارہ ابرو یا ناکھے کی داخد سلن کے سامنے ہتھیار ڈالدیتی تھی۔ لیکن یاقوت کی نزاکت صحت نے آج اسے سدِ سکندری بنا دیا۔ غالبًا یاقوت کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی کہی ٹل بھی سکتی ہے۔ کیوں نہیں۔ جہانگیر کو اس کی خاطر شکنی کا ضرور احساس تھا۔ لیکن اس مایوسی کو یاقوت نے جس بلندی پر پہنچا دیا وہاں جہانگیر کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس طوفان یاس میں یاقوت تنکے کا سہارا ڈھونڈھتی پھرتی تھی۔ کہ معاً اسے ایک خیال آیا اور اس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور اس نے ایک شکوہ آمیز انداز سے کہا:۔

نہیں مانتے تو خیر۔ میری وہ ہنسی جو کبھی حکم کی تاثیر رکھتی تھی آج بے اثر ثابت نہیں ہوگی۔ بلکہ میں حسرت و ارمان کی اس منزل پر پہنچ گئی ہوں۔ جس کا علاج بزدل حلقوں میں خودکشی بتلاتے ہیں۔ میرے لئے مشکل اور مصیبت کا اس سے زیادہ جانکشِ عالم اور کیا ہوگا۔ اس لئے اماں پیاری کی وصیت پر عمل کرنے کا وقت آگیا۔ انہوں نے مجھے ایک ڈبیہ دی تھی اور کہا تھا کہ جب سخت بھیڑ پڑے گی اس وقت اسے کھولنا۔ زیادہ میں پوچھنے نہ پائی تھی کہ روح پرواز کرگئی۔

یاقوت ڈبیہ لے آئی اور دونوں کارگاہ میں گئے لمپ روشن ہوا اور ڈبیہ کھولنے لگے۔ پاپمنٹ کے غلاف سے ایک ڈال سیپ کی ڈبیہ نکلی جو بذات خود ایک نایاب چیز تھی ایک ننھی سی چابی بطور وزن بیت اس کے ساتھ آویزاں تھی

عملِ جراحی

ڈھکنا اٹھایا تو خوشبو سے کمرا مہک اٹھا۔ مخمل کی تہ پر تہ چڑھی تھی انہیں ہٹایا۔ تو

مشکل تھا۔ معم

ہر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "ضیا پاش" یاقوت نے دیکھا سچ مچ ایک بے بہا

ترحم سے مختلف

ہا تھا۔ جہانگیر نے اسے نکال کر میز پر رکھا اور مبصرانہ امتحان کی تیاری کرنے لگا

عدالت تجویز کنندہ

کا جائزہ لینا شروع کیا تو اسمیں سے ایک کاغذ نکلا جس پر یہ عبارت درج تھی

پرانا گھاگ تھا اس نے فیصلہ ... آڈر دئے تھے۔

بیٹی! دنیا آنی جانی ہے جو یہاں آیا اسے جانا ضرور ہے۔ مجھے مرنے کا غم نہیں میں نے دنیا کی بہاریں دیکھیں اور جی بھر کر دیکھیں۔ سچ پوچھو تو اب طبیعت سیر ہوگئی میں جانتی ہوں کہ جو ڈاکٹر مجھ سے چھپاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے ابا کی مسکراہٹ کسقدر جبر و تصنع اور تکلف کی ترکیب سے رونما ہوتی ہے۔ جب وہ یہ جانتے ہیں کہ اس مصلحت آمیز فریب سے مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے تو میں اُسے کیوں زائل کروں۔ دنیا کو میں نے کیسا پایا۔ میرا فرض تھا کہ تمہیں بتا کر جاتی لیکن تمہارا سن اس امانت کو سنبھالنے کا نہیں۔ بس یہ جان لو دنیا پیسے کی ہے اور اس کے سامنے جھکتی ہے لیکن سچی خوشی بازار میں نہیں بکتی یہ دل سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی کاشت کھلا میدان چاہتی ہے۔ اس لئے جتنا دل کشادہ ہوگا اتنا ہی دامنِ مسرت دراز ہوگا چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظرانداز کرنا۔ خفیف خطاؤں سے چشم پوشی وسعتِ قلب کی آیات ہیں۔ دنیا کی دوڑ میں کامیاب رہنا ہے۔ تو کبھی نہ بھولنا کہ سہو و خطا انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس لئے تلافی کا موقع دینے سے کبھی گریز نہ کرنا۔ میری بچی خدا تمہیں پروان چڑھائے۔ تھک گئی ہوں۔ اگر زندہ رہی تو باقی کل ورنہ خدا حافظ۔ ۲۴ جنوری ۱۹۲۰ء

تمہارے مستقبل پر کل رات تمہارے ابا سے دیر تک گفتگو رہی وہ ہاں تو ہر بات پہ کرتے رہے مگر اوپری دل سے۔ اس لئے نہیں کہہ سکتی۔ میری باتیں ان کے معیار پر کسقدر غالب آئینگی۔ وہ دنیا کے ساتھ جذبات نورانی کو بھی سونے کے کانٹے میں تولتے ہیں میں عمر بھر انہیں قائل نہ کرسکی۔ کہ صرف روپیہ عورت کی مسرت کا ضامن نہیں۔ شباب کا کیا ذکر عالم شیب تک اس کا دل طفولیت کے گہوارے میں پڑا رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں پر لاکھ متانت اور ادراک کے جلوے نثار ہوں مگر اس کے کان وہ منطق وہ لہجہ اور زبان کا وہ لوچ چاہتے ہیں۔ جو بچوں کو مخاطب کرتے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ نہیں کہہ سکتی کہ کب قلم میرے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس لئے بہت باتیں دل میں رہی جاتی ہیں۔ خیر یہ ہیرا میں اس ڈبیہ میں بند کرتی ہوں۔ تمہاری عمر میں سب سے کٹھن وقت وہ ہوگا جب تمہارے ابا ضیا پاش کے ثانی پیش کرنے پر اصرار کریں گے۔ اسوقت تم اس ڈبیہ کو کھولو گی تو مشکل آسان ہو جائے گی۔

یہ تحریر یاقوت نے پھر جہانگیر نے پڑھی اور دونوں مسکرائے کہ یاقوت کی شادی کی کیسی پیش بندی کی تھی۔ لیکن یاقوت اس لئے خوش ہوگئی کہ اب ضیا پاش کے مل جانے کی عام ہو جائے گی۔ جہانگیر کی زندگی خطرے میں نہ رہے گی۔ مدت کے بعد چین نصیب ہوا۔ تو پرانی دلبستگیاں یاد آگئیں۔ اب پوچھنے میں کچھ ہی دیر تھی کہ جہانگیر نے بھولا بسرا ساسامان نکالا۔ چادانی میں کوئی چیز کھٹکتی تھی الٹایا تو "ضیا پاش"

ہمراد

(بقیہ صفحہ ۲۰)

بیلے محل۔ رادھا کرشن۔ سیوا جی اور اورنگ زیب۔ مرمریں محل۔ شہزادیاں گلاب کے باغات۔ بلبلیں۔ کوئی سمجھے انہوں نے انجن فیکٹریاں۔ مزدور کسان۔ جھونپڑیاں کبھی دیکھی ہی نہیں ـــــ گویا ہندوستان آج بھی وہی ہے جو سو دو سال پہلے تھا۔ ہماری مصوری زندگی سے ہم آہنگ نہیں۔ ہماری ضروریات سے ناواقف ہے۔ ہم سے دور ہے۔ مردہ ہے۔ مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں بنگال سکول ابھی تیس چالیس سال کی پیدائش ہے۔ اور اس تھوڑے سے عرصے میں اس کے اثرات تمام ہندوستان میں نظر آ رہے ہیں۔ بنگال سکول ہی کی بدولت پنجاب دہلی لکھنؤ۔ مدراس میں مصوری کا چرچا ہو رہا ہے۔ یہاں وہاں ایک دو کاریگر مصور بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ کسی کی توجہ پس و پیش کے حالات پر بھی ہو جائے کوئی ان خوابوں کی تمنا زاروں سے نکل کر حقیقت کی دشوار گزار راہوں میں بھی آ نکلے۔ ماضی کے کھنڈروں میں دب جانے کی بجائے پرانی بنیادوں پر حال و مستقبل کی عمارت استوار کرے۔ آثار نظر آ رہے ہیں۔ افق پر جھلکیاں سی دکھائی دے رہی ہیں۔ دیکھئے کب پو پھٹے! کب مصوری دوبارہ زندگی کے میدان میں اپنی صحیح جگہ پر کام کرتی نظر آئے! اور بدھ مت۔ برہمن مت، مغل، ہندو کی طرح اپنے ماحول کی ترجمانی کرے۔ نیک و بد میں تمیز کرے۔ حقیقت کی نقاب کشائی کرے۔

تاثیر

سالنامہ نیرنگ خیال کی تصاویر

نیرنگ خیال کی تصاویر کا انتخاب بفضل خدا ہمیشہ بہترین رہا ہے، جو لوگ آرٹ سے کسی قسم کی دلچسپی بھی رکھتے ہوں وہ مختلف فن کی تصاویر کو بار بار دیکھنے سے اس فن کی شد بد حاصل کر لیتے ہیں، رنگین تصاویر میں پرانی آرٹ کی تصویروں مغلیہ عہد اکبر سے لے کر عہدِ حاضرہ تک کے مشہور مصوّر فیضی رحمان تک کی تصویریں موجود ہیں، فیضی رحمان نے نئی دہلی کی عالیشان عمارتوں کی دیواروں پر جو تصاویر نقش کی ہیں، اُن کے چند فوٹو اس نمبر کی زینت ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے، کہ فیضی رحمان کا آرٹ کتنا بلند ہے، اُن کی تصویر ایک راجپوت سردار بے حد مؤثر اور جاذب نظر ہے، رنگوں اور خطوط، کا مجموعہ منتہائے کمال پر پہنچا ہوا ہے، مغربی فنِ مصوّری میں میڈم مونیر کی تصویر قابلِ توجہ ہے۔ ڈی انگرس نے اٹھارہ سال میں مکمل کیا تھا، امریکہ سے یہ تصویر انگلستان کی آرٹ گیلری کے لئے دو لاکھ روپے میں خریدی گئی تھی یہ تصویر رنگین ہے، اس کا معمولی عکس سمجھئے، یہ ۱۸۵۶ء کی تیار کردہ ہے، شاہجہان کی بیوی ممتاز محل کی وفات کا منظر سوبھا سنگھ نے جس خوبی سے دکھایا ہے، وہ اُنہی کا حصہ ہے، سردار سوبھا سنگھ پنجابی ہیں، اور بنگال میں کمالاتِ فن کی وجہ سے بہت ہر دلعزیز ہیں۔

قدیم صنعتی نمونوں میں سے تین تصویریں قابلِ توجہ ہیں، آبدان، پھول دان، اور لیمپ سب نادر نمونے ہیں، لندن میں نمائش کے سلسلہ میں، جہانگیر کی تصویر اور شاہنامہ کا ایک ورق تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، ایک سلہوٹی اپنی طرز کی انوکھی چیز ہے، ہندوستان کے سات مصوّروں کے ایک ایک نمونہ کو یکجا کر کے ہم نے ناظرین کو اُن کی خصوصیات پر غور کرنے کے قابل بنا دیا ہے،

اس حصہ میں پانچ رقاصہ اور رباعی سپاہی کی دو تصویریں جاذب توجہ ہیں اور بھی کئی تصویریں ہیں جو اپنی تشریح خود کر رہی ہیں +

(ادا)

بقیہ صفحہ (۲۳۷)

نہ پا سکا۔ میرے ایک دوست نے (جنہیں اس فن میں خاص درک ہے) البتہ مجھے چند باتیں بتائیں۔ ان کا خیال ہے کہ خود خط کوفی اہلیوں کی اختراع ہے۔ چند عربی تحریروں میں (جو بنی امیہ کے ابتدائی عہد کی بتائی جاتی ہیں) اور اس عہد کی آخری زمانہ کی کوفی تحریروں میں ایک امتیاز ضرور ہے یہ امتیاز حکومتِ عباسیہ میں نمایاں اور سہل النظر ہے۔ چونکہ دورِ عباسیہ میں ایرانی کلیتاً حاوی تھے۔ اس لئے ان کی مخترع اور قوم پرست طبائع تھی عربی خط میں وہ تصرف کیا جس سے اسے بغیر مسخ کئے ہوئے ایرانی بنا لیا۔ قادر باللہ کے عہد زمانہ کی ایک کتاب حال میں دستیاب ہوئی ہے۔ جو کلیتاً فارسی خط میں ہے۔

ایرانیوں نے خط کوفی کو اپنا بنانے کی ایک دوسری ترکیب یہ کی کہ اسے شکست خط میں لکھنا شروع کر دیا۔ یہ طرز تیرھویں صدی تک برابر جاری رہا۔ میں نے برٹش میوزیم میں چودھویں صدی کی لکھی ہوئی ایسی کتابیں بھی دیکھی ہیں۔ جنکی طرز کتابت کو "کوفی است" کہا جاتا ہے۔

تیمور (۱۴۰۲ - ۱۳۶۰) و شاہ عباس اعظم کے درمیان کے دو سو برس ایرانی کتابت کا بہترین زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ کتابت میں پختگی سیاہی میں چمک و پائداری۔ حروف کے تمامی اجزاء میں صفائی و وضاحت یہ سب باتیں اس دور کی خصوصیات کہی جا سکتی ہیں۔ شاہ طہماسپ کے عہد میں کتابت کو بے حد ترقی نصیب ہوئی اور اس عہد کی کتابیں فن خطاطی کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن جہانتک میں غور کر سکا ہوں ان میں ایک ایسا نقص ہے جو عہد الغ میں موجود نہیں۔ اور طہماسپ کی کتابت میں ایک مصنوعی اور غیر فطری رنگ ہے۔ جو آنکھوں کو تو ضرور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن طبیعت کو اس سے ایک کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔

قاچار یہ عہد میں نستعلیق سے زیادہ نسخ کی جانب توجہ کی گئی۔ آج ہندوستان میں کتابت گو کم مقبول ہے۔ لیکن زندہ ہے۔ لیکن ایران میں تقریباً ساری کتابیں لوہے کے ٹائپ میں طبع ہوتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو آخری پیرا صفحہ ۲۳۷)

عل
متکر
ترجم
عدالہ
پرانا گھاگ تھا اس
آڈر دئے تھے۔ اس نے